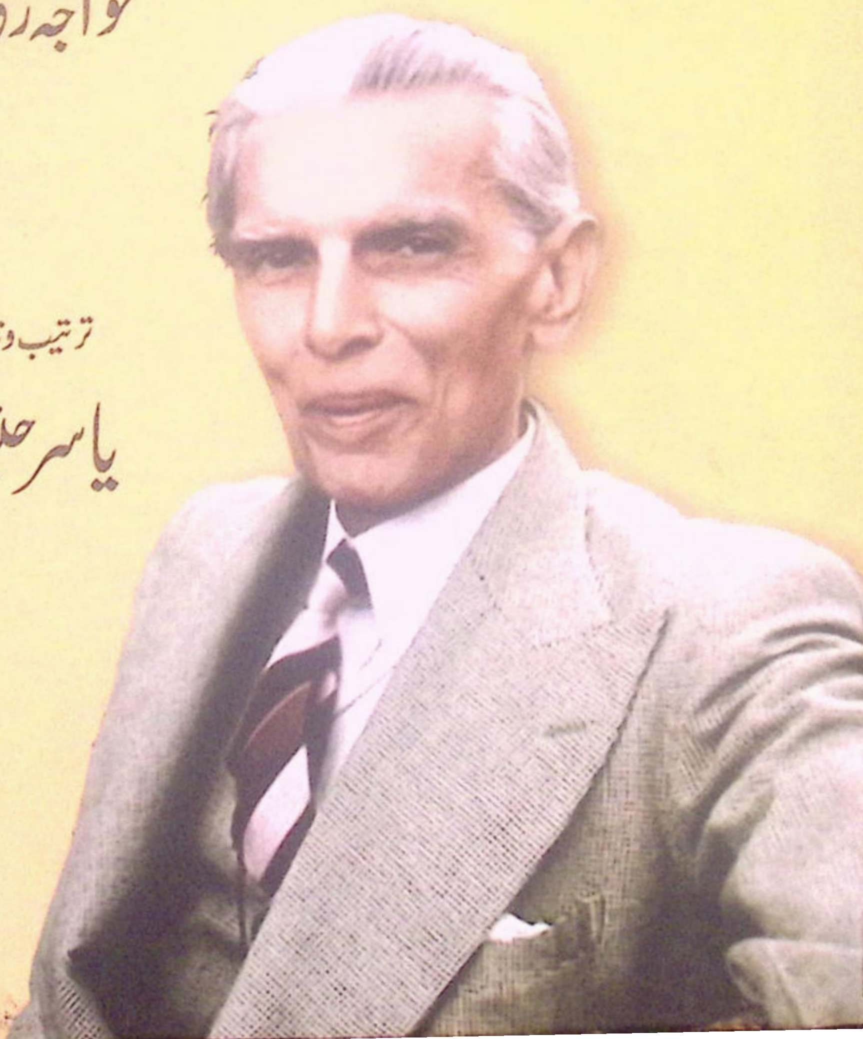
قائدِ اعظم شناسی

موضوعاتی مضامین کی روشنی میں

تحریر و تحقیق

خواجہ رضی حیدر



ترتیب و تدوین

یاسر حنیف

قائداعظم شناسی

موضوعاتی مضامین کی روشنی میں

تحریر و تحقیق

خواجہ رضی حیدر

ترتیب و تدوین

یاسر حنیف

پیس پبلی کیشنز

42- اُردو بازار، لاہور

2020ء

ذوالفقار حسین شاہ نے

پیس پبلی کیشنز لاہور سے شائع کی۔

نام کتاب : قائداعظم شناسی موضوعاتی مضامین کی روشنی میں

مصنف: خواجہ رضی حیدر

ترتیب و تدوین: یاسر حنیف

اشاعت: 2020ء

ناشر : پیس پبلی کیشنز

پرنٹرز : حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

بائنڈر : قیوم احمد

ISBN:969-728-015-5
ISBN:978-969-728-015-5

Peace Publications

42-Manzoor Manzal Urdu-Bazar Lahore
Cell: 0322-4298311 -- 0307-4505020
E-mail peace_publications@yahoo.come

فہرستِ مضامین

انتساب

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور تحریکِ پاکستان
کے حوالے سے نامور اہلِ قلم

مطلوب الحسن سید

پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

سید شریف الدین پیرزادہ

پروفیسر جمیل الدین احمد

پروفیسر شریف المجاہد

لطیف احمد شیروانی

ڈاکٹر وحید احمد

اور اپنے والد مرحوم مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی کے نام

عرضِ مصنف

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح پر میرا پہلا مضمون 'قائداعظم اور دفاعِ پاکستان' کے عنوان سے ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو روزنامہ 'حریت' کراچی میں شائع ہوا تھا جس میں بطور سب ایڈیٹر میں ملازم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) ابھی پاکستان کا حصہ تھا اور پوری قوم مشرقی پاکستان میں بھارت کی دراندازی اور مکتی باہنی کی شورش اور بغاوت کے خلاف سینہ سپر ہوگئی تھی۔ نتائج سے قطعِ نظر اسی زمانے میں جبکہ میری عمر پچیس سال رہی ہوگی میری توجہ اور دلچسپی کا موضوع تحریکِ پاکستان کی تاریخ اور قائداعظم محمد علی جناح کی حیات و خدمات قرار پائی۔ جہاں میں نے اس ضمن میں اپنے مطالعہ کو فروغ دیا وہاں قائداعظم کے رفقا اور تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں کی صحبت اختیار کی اور اُن کی معلومات سے استفادہ کیا۔ خاص طور پر اس سلسلے میں قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری اور سوانح نگار مطلوب الحسن سید، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر شریف المجاہد، مولانا حسن مثنیٰ ندوی، سید شمس الحسن، علامہ ابنِ حسن جارچوی، سید ہاشم رضا، چوہدری خلیق الزماں، سید حسین امام، حاتم علی علوی، مولانا ظفر احمد انصاری، نواب صدیق علی خان، یوسف ہارون، نور الصباح بیگم، مولانا حسن ریاض، حاجی عبدالستار اسحق سیٹھ اور بیگم شائستہ اکرام اللہ سے تواتر کے ساتھ ملاقاتیں کیں جس

کی بنا پر میرے اندر نہ صرف ان موضوعات کو فروغ حاصل ہوا بلکہ میرا ذہن مرتب ہوتا چلا گیا۔ میرے والد مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی چونکہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک تحریکِ پاکستان کے دوران یو پی کے ایک شہر پیلی بھیت کی سٹی مسلم لیگ کے صدر رہ چکے تھے لہٰذا میں نہ صرف اُن کی معلومات سے بلکہ اُن کی ڈائریوں سے بھی استفادہ کرتا رہا۔ اس دوران اخبارات و جرائد میں میرے مضامین شائع ہوتے رہے اور قائداعظم محمد علی جناح کے دسمبر ۱۹۷۶ء میں صد سالہ جشن کے موقع پر قائداعظم کی حیات و خدمات کے ضمن میں میری پہلی کتاب 'قائداعظم کے ۷۲ سال' شائع ہوگئی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں سے پروفیسر شریف المجاہد کی سرپرستی کا مجھے اعزاز حاصل ہوا اور میں نے تحریکِ پاکستان اور قائداعظم سے متعلق تاریخ کو اپنی تحقیق کا مستقل موضوع قرار دے دیا۔ ۱۹۸۱ء میں پروفیسر شریف المجاہد کے ایما پر اخبار کی ملازمت ترک کر کے قائداعظم اکادمی سے وابستگی اختیار کر لی اور شب و روز اِن موضوعات پر تحقیق و تحریر میں مصروف ہوگیا۔ اب یعنی ۲۰۱۹ء میں جب پلٹ کر دیکھا تو میرے کیسۂ تحقیق میں کتابوں اور مضامین کی قابلِ ذکر تعداد موجود تھی۔ ایک دن گفتگو میں پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی کے لیکچرار اور نوجوان محقق محترم یاسر حنیف سے ان مطبوعہ مضامین کا تذکرہ آیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ان مضامین میں سے منتخب مضامین پر مبنی ایک کتاب مرتب کی جانا چاہیے تاکہ قائداعظم کی حیات و خدمات کے حوالے سے ایک موضوعاتی مطالعہ سامنے آسکے۔ میں نے اُن کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جو مضامین میری دسترس میں تھے اُن کے حوالے کر دیے۔ یاسر حنیف صاحب نے جہاں یہ مضامین موضوعاتی اعتبار سے مرتب کیے وہاں مجھ کو بعض مضامین پر نظرِ ثانی کا ہی مشورہ نہیں دیا بلکہ چند موضوعات پر نئے مضامین بھی لکھوائے۔ اس پورے عمل میں تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ مجھے نہیں معلوم یہ کتاب وقیع ہے یا نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ قائداعظم کے بارے میں ایسا کوئی مطالعہ کتابی صورت میں میری نظر

سے نہیں گزرا۔ ان مضامین کی ترتیب وتدوین میں یاسر حنیف نے جس لگن کے ساتھ اپنی تدوینی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہی نہیں ہے بلکہ مجھ پر احسان ہے کہ انہوں نے ان منتشر مضامین کو نہایت حسن وخوبی سے کتابی صورت میں یکجا کرد ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی استعداد اور تحقیقی صلاحیتوں میں مزید اضافہ فرمائے۔ میں اس موقع پر اپنے شفیق ومہربان دوست اور قائداعظم کی حیات وخدمات پر سند کا درجہ رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر ریاض احمد، عزیزِ محترم یوسف تنویر، مکرمی انوار عزمی، برادرم نصیر احمد سلیمی، برادرم جلیس سلاسل، برادرم سرفراز احمد خان اور اپنے بیٹے خواجہ علی حیدر کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہمیشہ میرے حوصلوں کو مہمیز کیا اور میں اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھ سکا۔ اللہ تعالیٰ سب کو شاد وآباد رکھے۔ آمین

خواجہ رضی حیدر

عرضِ مرتب

ہمالیہ کی ترائی سے ڈیڑھ سو سال قبل اٹھنے والا علم وحکمت کا سورج حضرت محدث سورتی سے ہوتا ہوا آج خواجہ رضی حیدر کی صورت میں تحقیق کے موتی بکھیرتا نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب کی شخصیت قائداعظم محمد علی جناح اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے ایک مستند اسکالر کی ہے۔ اس وقت وہ قائداعظم اکادمی میں دائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ بنیادی طور پر خواجہ صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں جس کا اندازہ ان کے ساتھ کی جانے والی نشستوں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف جناح اور تحریک پاکستان پر اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز شاعر اور جدید ہندوستان کے علمائے کرام کی سوانحی وعلمی خدمات اور اسلامی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ مختلف تاریخی وادبی موضوعات پر لگ بھگ ۵۰ کے قریب کتابیں ان کے کریڈٹ پر ہیں جن میں تین شعری مجموعے بھی شامل ہیں۔

خواجہ رضی حیدر کا شمار ان لکھاریوں میں ہوتا ہے جو جناح اور تحریک پاکستان اور اُس سے جڑے واقعات اور شخصیات پر گزشتہ ۴۵ سال سے مسلسل محققانہ مضامین لکھ رہے ہیں۔ ابتداً روزنامہ 'حریت' سے وابستگی کی وجہ سے ان میں صحافیانہ عادات آج بھی موجود ہیں لہٰذا جس ذوق وشوق سے وہ مضامین لکھتے ہیں اسی طرح سے انہیں سنبھال نہیں پاتے چنانچہ کئی دہائیوں پر مبنی عرصے میں لکھے جانے والے مضامین کہاں کہاں

چھپے، اس حوالے سے وہ لاعلم رہتے ہیں۔

خواجہ رضی حیدر سے میرا تعارف خاصا پرانا لیکن طویل عرصے تک غائبانہ رہا۔ ۲۰۰۵ء میں ہمارے ادارے کے ایک ریسرچ پروجیکٹ کے سلسلے میں میرا پہلی بار قائداعظم اکادمی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ میرا اس ادارے بالخصوص اس کی لائبریری سے پہلا تعارف تھا۔ تقریباً ایک سال تک اکادمی کی لائبریری میں جانا رہا، خواجہ صاحب اکادمی میں موجود تھے لیکن شناسائی کے باوجود ان سے ملاقات کا اتفاق نہ ہو سکا لہٰذا تعلق لائبریری تک ہی محدود رہا۔ ۲۰۱۴ء میں مجھے خواجہ صاحب کی کتاب 'قائداعظم خطوط کے آئینے میں' پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا تو پہلی بار ان کی تحریر کو قریب سے جانچنے کا موقع ملا پر ملاقات پھر بھی نہ ہو سکی۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۸ء کو ہمارے ادارے میں جشنِ جناح کے حوالے سے ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں ڈاکٹر محمد رضا کاظمی بطور اسپیکر اور خواجہ صاحب بطور صدرِ نشین کے مدعو تھے۔ تقریب کے اختتام پر خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی، اس نشست میں پچھلے تمام تعلق یاد کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے اکادمی آنے کی دعوت دی۔ اکادمی میں ملاقات کے دوران تحریکِ پاکستان بالخصوص جناح کے حوالے سے ان کے مضامین کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا موضوع زیر گفتگو آنے پر انہوں نے کہا کہ مضامین کی تعداد کا کچھ اندازہ نہیں اور نہ ہی تمام تحریریں محفوظ ہیں۔ اس تمام گفتگو میں یہ طے پایا کہ خواجہ صاحب اپنے جو بھی مضامین میسر ہیں وہ نکال کر میرے سپرد کریں گے۔ کچھ ہی روز میں جب ان سے رابطہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ مضامین نکالے جا چکے ہیں لہٰذا میں اکادمی گیا اور ان مضامین میں سے ۱۹ مضامین منتخب کر کے علیٰحدہ کر دیئے۔

ان تمام بکھرے ہوئے مضامین کو اکٹھا کرنا اور پھر اُن میں سے باعتبارِ موضوع مضامین کا انتخاب کرنا از خود ایک مشکل اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا جو خواجہ صاحب کی رہنمائی کی بدولت مکمل ہو سکا۔ یہ تمام مضامین میں نے پڑھے اور اس دوران کچھ مزید

موضوعات ذہن میں آئے جن کے بغیر کتاب کچھ تشنہ سی محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ اگلی ملاقات میں خواجہ صاحب کو اِن موضوعات پر مضامین لکھنے پر راضی کیا۔ یوں کتاب ۲۴ مضامین پر مشتمل ہوگئی۔

یہ تمام مضامین جناح، ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اوران سے جڑے رشتوں کے بارے میں تحقیق پر مبنی ہیں۔ ان مضامین میں سے بڑی تعداد ان مضامین کی ہے جو مختلف اوقات میں اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ تمام مضامین کا احاطہ اس مضمون میں کرنا مقصود نہیں۔ یہ عمل قاری کے لیے چھوڑا گیا ہے کہ وہ تمام مضامین پڑھے اوراُسے کی بنیاد پر اپنی رائے ترتیب دے۔

زیر نظر کتاب برصغیر پاک وہند کے عظیم قائد کی مسلمانوں کے لیے خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ ایسے قائد کے لیے جو اپنی دانشمندی، جرأت، ایمانداری اور راست گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

یہ تمام مضامین جن کی تعداد ۲۴ ہے ان میں سے ۲۱ مضامین جناح کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، دیگر ۳ مضامین میں فاطمہ جناح، رتی جناح اور دینا وارڈیا کا جناح کے حوالے سے سوانحی احوال بیان کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جناح اور تحریکِ پاکستان پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگی۔

قائداعظم شناسی، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں موجود تمام مضامین بنیادی طور پر ایک ہی شخصیت کی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں لہٰذا ایسا ممکن تھا کہ بعض واقعات مختلف مضامین میں دہرائے جاتے نظر آئیں گے۔ اس کی وجہ مضمون کا تسلسل برقرار رکھنا ہے۔ ساتھ ہی بعض مضامین میں موجود نقطۂ نظر خالصتاً مصنف کا ذاتی ہے، اس سے متفق ہونا یا نہ ہونا یہ قاری کی اپنی صوابدید پر ہے۔ بحیثیت مرتب میں خود چند معاملات پر مصنف سے نظریاتی اختلاف رکھتا ہوں لیکن مصنف کی جانب سے لکھے گئے

مضامین کو من وعن پیش کر دینا اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دینا زیادہ بہتر دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا تمام قارئین جو جناح سے واقف ہیں، نہیں ہیں یا کسی حد تک ہیں، ان سب کے لیے کتاب میں کئی سوالات ہیں جن کے جواب انہوں نے خود تلاش کرنے ہیں۔

آخر میں، میں شکر گزار ہوں خواجہ صاحب کا کہ انہوں نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے ان مضامین کو مرتب کرنے کا مجھے اعزاز بخشا۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب کے حوالے سے پیش آنے والی ہر مشکل کو حل کرنے میں ہر ممکن مدد بھی فراہم کی۔ کتاب کو مرتب کرنا میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا جو میری علمی استعداد میں اضافے کا براہِ راست وسیلہ بنا۔ ان تمام مضامین کو کمپوزنگ کے فرائض سید غضنفر احمد نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مختلف مقامات پر ان کی جانب سے دیے جانے والے تکنیکی مشورے بھی شاملِ کتاب رہے ہیں۔ اس حوالے سے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

کسی بھی کتاب میں خامیوں اور اصلاح کی گنجائش بہر حال موجود رہتی ہے لہٰذا اس حوالے سے استدعا ہے کہ جو بھی خامی یا غلطی دکھائی دے اسے سامنے لا کر شکریہ کا موقع دیں۔

یاسر حنیف
پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

حیاتِ قائداعظم پر طائرانہ نظر

ولادت اور تعلیم

تاریخ گواہ ہے کہ ہر قوم میں ایسے افراد ضرور پیدا ہوتے ہیں جو اس قوم کو درپیش انتشار، بدنظمی اور عدم مقصدیت کا ازالہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس قوم کو نہ صرف متحد کرتے ہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کے طابع کر کے اسے حوصلہ اور عزمِ صمیم عطا کرتے ہیں تاکہ وہ قوم عظیم مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کی اس راہ کو اپنا سکے جو کامیابی اور عزت نفس کے تحفظ کی راہ ہوتی ہے۔ آزادی کی راہ، اپنے قومی تشخص کی بحالی کی راہ اور مستقبل میں اپنا جائز اور مثبت کردار ادا کرنے کی راہ۔ اسی لیے یہ افراد تاریخ میں مدبر اور قائد کے طور پر زندہ رہتے ہیں۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی کے علاقہ کھارادر میں پیدا ہونے والا ایک بچہ محمد علی جناح انہی تاریخ ساز افراد میں سے ایک تھا جو اپنی قومی خدمات کے حوالے سے قائد ہی نہیں قائداعظم کے منصب پر فائز ہوا اور رہتی دنیا تک اسی منصب پر فائز رہے گا۔

قائداعظم محمد علی جناح کے والد جناح پونجا کاٹھیاواڑ سے نقل مکانی کر کے کراچی آئے تھے تاکہ یہاں وہ اپنے کاروبار کو وسعت دے سکیں۔ بحوالہ تاریخ کراچی میں انہوں نے کھارادر کے علاقہ میں واقع نیونہم روڈ پر ایک مکان میں رہائش اختیار کی۔ اسی مکان میں قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔ اس مکان کی جگہ اب جو عمارت موجود ہے وہ 'وزیر مینشن' کے نام سے معروف ہے اور قائداعظم محمد علی جناح

کی 'ولادت گاہ' کہلاتی ہے۔قائداعظم کی سب سے چھوٹی بہن محترمہ فاطمہ جناح نے لکھاہے کہ ان کے والد جناح پونجا نے کراچی میں مختلف کاروبار کیے اور رفتہ رفتہ اپنے کاروبار اور سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے۔اس وقت کراچی تجارتی مرکز تھا اور یہاں چند برطانوی کمپنیاں بھی کاروبار میں مصروف تھیں جو کراچی اور اندرونِ ملک کی اشیاء یورپ اور مشرق بعید کے ممالک کو برآمد کرتی تھیں۔ جناح پونجا نے اگرچہ کسی اسکول میں باقاعدہ انگریزی زبان کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیت کی بنا پر انہوں نے انگریزی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کرلی تھی۔ انگریزی بولنے کی استعداد اس دور میں کامیابی کی ضمانت تصور کی جاتی تھی لہٰذا جناح پونجا کے کاروبار کو خوب ترقی حاصل ہوئی۔جناح پونجا اپنے بیٹے محمد علی جناح کو بھی ایک کامیاب تاجر بنانا چاہتے تھے اس لیے ان کو اپنے بیٹے کی تعلیم کی سب سے زیادہ فکر تھی۔محمد علی جناح کو بھی بچپن سے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لہٰذا انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۸۸۷ء میں محمد علی جناح کی عمر دس سال ہوچکی تھی چنانچہ ان کو سندھ مدرستہ الاسلام، کراچی میں داخل کروادیا گیا۔اسکول کے رجسٹر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت محمد علی جناح نے گجراتی کی چار جماعتیں پاس کی تھیں اور ان کو فرسٹ اسٹینڈرڈ یعنی پانچویں جماعت میں داخلہ دیا گیا تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی والدہ کا نام مٹھی بائی تھا قائداعظم کے والد کثیر العیال شخص تھے ان کے دولڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔محمد علی جناح بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے لہٰذا والدین کی آنکھ کا تارا تھے۔ ۱۸۹۲ء میں جناح نے سندھ مدرستہ لاسلام چھوڑ دیا۔ مدرسہ کے رجسٹر میں اسکول چھوڑنے کا سبب شادی کے لیے کچھ روانگی درج کیا گیا۔محترمہ فاطمہ جناح کے بیان کے مطابق محمد علی جناح اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ کاٹھیاواڑ کے ایک علاقہ پینلی گئے اور وہاں ان کی شادی ایک معروف تاجر گوکل لیرا کھیم جی کی بیٹی 'ایمی بائی' سے نہایت دھوم دھام اور شان وشوکت کے

ساتھ ہوئی۔ تقریباً تین ماہ شادی کے ہنگاموں میں مصروف رہنے کے بعد محمد علی جناح جب کراچی واپس آئے تو انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کراچی ہی کے ایک اسکول چرچ مشن سوسائٹی ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا اس اسکول میں تقریباً آٹھ مہینے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اکتوبر ۱۸۹۲ء میں ایک مرتبہ پھر اسکول چھوڑ دیا۔ اس مرتبہ اسکول چھوڑنے کا سبب بیرون ملک روانگی تھا۔ شادی کے بعد سے محمد علی جناح نے جنوری ۱۸۹۳ء یعنی لندن روانگی تک نہ صرف اپنی تعلیم جاری رکھی بلکہ اپنے والد کے کاروبار میں بھی ہاتھ بٹاتے رہے۔

لندن روانگی کا مقصد ابتدائی طور پر تجارت کی تعلیم حاصل کرنا تھا لیکن بعد میں انہوں نے قانون کی معروف درس گاہ لنکنز ان میں داخلہ لے لیا۔ لندن میں محمد علی جناح کے قیام اور مصروفیات کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں مگر یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ نہایت جان فشانی سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے کوشاں تھے۔ دورانِ تعلیم انہوں نے ابتداً ہوٹل میں قیام کیا اور بعد میں مسز ایف ای پیج ڈریک نامی ایک خاتون کے گھر ۳۵ رسل روڈ کنگسٹن میں بطور پے انگ گیسٹ رہائش اختیار کرلی۔ لندن میں قیام کے دوران ہی محمد علی جناح کو دو شدید صدمات سے دوچار ہونا پڑا، پہلے ان کی نوجوان اہلیہ ایمی بائی کا انتقال ہوا اور بعد میں ان کی والدہ مٹھی بائی ایک بچہ کی زچگی میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کا بیان ہے کہ والدہ اور اہلیہ کے انتقال نے محمد علی جناح کو نہ صرف شدید ملول کیا بلکہ ان کے اندر استقامت اور تکالیف کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کیا۔ لنکنز ان میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران محمد علی جناح کی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ انہوں نے برٹش میوزیم لائبریری میں مطالعہ شروع کردیا۔ اتوار کے دن وہ لندن کے ہائیڈ پارک چلے جاتے اور وہاں برطانوی دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں کی تقاریر سنا کرتے۔ یہی وہ دور ہے جب محمد علی جناح کو یہ احساس ہوا کہ ایک قوم کی آزادی کے لیے تقریر کیا اہمیت رکھتی ہے۔

چنانچہ اسی دور میں وہ نہ صرف پارلیمانی طرزِ خطابت میں مہارت حاصل کر گئے بلکہ ان کے اندر سیاسی بصیرت اور فیصلہ کرنے کی وہ صلاحیت پیدا ہوئی جو آنے والے دنوں میں قوم وملک کے لیے کام آئی۔

آغازِ وکالت

محمد علی جناح نے سخت محنت کے نتیجہ میں دو سال کے اندر 'بارایٹ لاء' کا امتحان پاس کر لیا وہ ۱۹ر برس کی عمر میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے والے سب سے کم عمر ہندوستانی طالب علم تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ محمد علی جناح نے مشہور انگریزی شاعر ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے بھی دیکھے۔ وہ کبھی کبھی شیکسپیئر کے ڈراموں کے اقتباسات پڑھتے تو ان کا لہجہ نہایت درست ہوتا، الفاظ کو وہ اس طرح ادا کرتے جیسے اسٹیج ایکٹنگ کے فن میں تربیت یافتہ کوئی ماہر فنکار مکالمے ادا کر رہا ہو۔ ایک مرتبہ خود محمد علی جناح نے یہ اعتراف کیا کہ لندن میں آخری دو سال کے دوران ان کا زیادہ تر وقت اپنے سیاسی مستقبل کے لیے، جو ان کے ذہن میں تھا آزادانہ مطالعہ میں صرف ہوا۔ محمد علی جناح بچپن سے ہی اپنی نفاست پسندی، جرأت اور بے باکی، صاف گوئی، عزم و ہمت اور قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر ممتاز نظر آتے تھے۔ انہوں نے مارچ ۱۸۹۶ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ لنکنز ان میں ان کے ایک استاد سر ہاورڈ الفنسٹن نے اپنے توثیقی سرٹیفکیٹ میں کہا "میں نے محمد علی جناح کے نتائج کی بنیاد پر ان کو ایک قابل شخصیت کا مالک پایا۔ وہ جس کام کی جانب اپنی توجہ مبذول کریں گے اسے بہتر طور پر انجام دیں گے۔" ایک اور استاد سر ڈبلیو ڈگلس ایڈورڈز نے اپنے سرٹیفکیٹ میں کہا "محمد علی جناح نے امتحانات میں نہایت جانفشانی، زود فہمی اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جس شعبہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے اُن کو ممکنہ کامیابی ہوگی۔"

۱۸۹۶ء کے وسط میں محمد علی جناح تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوکر جب کراچی پہنچے تو ان کے والد کا کاروبار ختم ہو چکا تھا اور مختلف کاروباری اداروں کی خاصی بڑی رقوم ان کے ذمہ واجب الادا تھیں۔ محمد علی جناح نے ان مایوس کن حالات میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور بہت جلد نہ صرف حالات پر قابو پالیا بلکہ کراچی سے بمبئی منتقل ہو گئے۔ اگست ۱۸۹۲ء میں محمد علی جناح نے بمبئی کے ہائی کورٹ میں بحیثیت وکیل رجسٹریشن کے لیے درخواست دی۔ اس طرح وہ بین الاقوامی نوعیت کے اس بڑے شہر میں ابتدائی تین سال سخت محنت کرنے اور مشکلات سے نبرد آزما رہنے کے بعد ایک اہم مسلمان وکیل کے طور پر متعارف ہو گئے۔ ۱۹۰۰ء میں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی ایک عارضی اسامی پر ان کا تقرر ہوا۔ اس عارضی عہدہ پر انہوں نے جس مثالی انداز میں کام کیا اس کی بنا پر عدالتی حکام ان کے مداحوں میں شامل ہو گئے لیکن عارضی عہدہ کی مدت ختم ہونے کے بعد جب جوڈیشل ڈپارٹمنٹ کے ممبر انچارج سر چارلس اولیونٹ نے ان کو پندرہ سو روپے کی ایک بہتر ملازمت کی پیشکش کی تو محمد علی جناح نے شکریہ کے ساتھ پیشکش کو قبول کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ میں بہت جلد ایک دن میں پندرہ سو روپے کمانے لگوں گا۔

آزادانہ وکالت کے ازسرِ نو آغاز پر ہی یعنی اپریل ۱۹۰۲ء میں محمد علی جناح کے والد انتقال کر گئے۔ والد کا انتقال ان کے لیے سانحہ تھا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی پیشہ ورانہ جدوجہد جاری رکھی۔ ۱۹۰۳ء تک محمد علی جناح کی آمدنی دو ہزار روپے ماہانہ ہو چکی تھی۔ اس دوران انہوں نے اپنے خاندان کی نہ صرف بہتر انداز میں کفالت کی بلکہ مختصر سی مدت میں ان کا شمار ہندوستان کے صفِ اوّل کے وکلا میں ہونے لگا۔ انہوں نے ہمیشہ پیشہ ورانہ وقار کو ملحوظ رکھا۔ وہ ایک وکیل کی حیثیت سے عدالت کو مسحور اور مسخر کر دینے والی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ اپنے موقف کے حق میں موثر دلائل ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھے شاید اسی لیے ان کو ہندوستانی عدالتوں کا

'لارڈ سائمن' کہا جانے لگا تھا۔

بمبئی ہائی کورٹ میں پریکٹس کے دوران محمد علی جناح نے جہاں بمبئی کے معروف افراد سے اپنے مراسم کو فروغ دیا وہاں سماجی سرگرمیوں میں پابندی سے حصہ لینے لگے۔ بمبئی کی ایک مقتدر شخصیت سر فیروز شاہ مہتہ نے ان کو بمبئی پریذیڈنسی ایسوسی ایشن کی رکنیت دی۔ ابتدائی ایام میں محمد علی جناح کی اگست ۱۸۹۷ء میں ایک جلسہ عید میلاد النبی ﷺ میں شرکت ثابت ہے جس کی صدارت مشہور قومی رہنما نواب محسن الملک کر رہے تھے اسی دور میں محمد علی جناح بمبئی کے مسلمانوں کی مشہور تنظیم 'انجمن اسلام' کی تقریبات میں بھی شریک ہوتے رہے جس کی بنا پر ان کو معروف مسلمان قانون دان جسٹس بدرالدین طیب جی سے قربت حاصل ہوئی جو اس انجمن کے سرپرست تھے۔ محمد علی جناح کو اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جس کو انگریزوں نے غلام بنا رکھا ہے۔ لندن میں حصولِ تعلیم کے دوران اُن کو آزادی کی قدر و قیمت اور ایک آزاد ملک کا باشندہ ہونے کی اہمیت کا بہتر طور پر اندازہ ہو چکا تھا لیکن ابتداً وہ اپنی اقتصادی ضرورتوں کی بنا پر کسی سیاسی سرگرمی کو اختیار نہیں کر سکتے تھے بس حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ اس وقت تک انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آ چکا تھا اور سرسید احمد خان کے رفقاء مسلمانوں کے حقوق کی بحالی اور کسی سیاسی جماعت کے قیام کے لیے کوشاں تھے لیکن ان کو کوئی واضح کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی جبکہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد ہندوؤں کی سیاسی قوت میں نہ صرف اضافہ ہوا تھا بلکہ حکمران طبقہ بھی ان کی قوت کو محسوس کرنے لگا تھا۔ مسلمانوں کے حوالے سے کانگریس کا رویہ معاندانہ تھا جس کی بنا پر پہلے مرحلہ پر مسلمانوں نے کانگریس سے لاتعلقی اختیار کی، دوسرے مرحلے پر انہوں نے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں وائسرائے سے ملاقات کے لیے سربرآوردہ مسلمانوں کا ایک وفد تشکیل دیا تا کہ وہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات

اور کونسل میں علیحدہ نشستیں مخصوص کرنے کا مطالبہ کرے اور کونسلوں میں مسلمانوں کے حقیقی اور صحیح نمائندے منتخب کیے جاسکیں۔ مزید برآں حکومت کی جانب سے نافذ کی جانے والی اصلاحات میں مسلمانوں کو ان کا جائز حق مل سکے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے مسلمانوں کی ایک نمائندہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ دسمبر ۱۹۰۶ء میں قائم کی گئی۔

عملی سیاست کا آغاز

اس مرحلہ پر مسلم سیاست کے دھارے میں جو واحد مسلمان رہنما نہایت نمایاں اور منفرد انداز میں اُبھر کر سامنے آئے وہ محمد علی جناح تھے اگرچہ محمد علی جناح نے ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست میں قدم رکھا تھا لیکن مسلم مفادات ہمیشہ ان کو عزیز رہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے کانگریس کے ۱۹۰۶ء کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں خان بہادر مولوی محمد یوسف کی مسلم وقف علی الاولاد کے بارے میں پیش کردہ قرارداد پر تقریر کی۔ اسی اجلاس میں حکومت خوداختیاری کے حوالے سے بھی ایک قرارداد پر محمد علی جناح نے تقریر کی۔ یہ تقریر ان کی زندگی کی پہلی سیاسی تقریر تھی آنے والے برسوں میں وہ انڈین مسلم ایسوسی ایشن اور انجمن ضیاء الاسلام، بمبئی سے بھی گہری وابستگی اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگست ۱۹۰۹ء میں انہوں نے انجمن ضیاء الاسلام کے ایک جلسہ عام میں وہ اہم قرارداد پیش کی جس میں حکام سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر کونسل کے آئندہ انتخابات کے لیے مسلم رہنماؤں سے حکومت صلاح ومشورہ کرے۔

محمد علی جناح کی ان تمام مسلم دوست سرگرمیوں کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ جنوری ۱۹۱۰ء میں ان کو انڈین لجسلیٹو کونسل میں بمبئی کے مسلمانوں کے لیے مخصوص نشست پر غیر سرکاری ارکان کی جانب سے رکن منتخب کیا گیا۔ اس دور میں آزادی فکر، دیانت

داری، قوت استدلال، مسحور کن انداز خطابت اور بے پناہ حاضر جوابی محمد علی جناح کے ایسے اوصاف تھے جن کی بنا پر وہ ایک بہترین پارلیمنٹرین کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ پارلیمنٹرین کی حیثیت سے محمد علی جناح کی اولین کامیابیوں میں سے ایک کامیابی وقف علی الاولاد بل کی منظوری تھی۔ یہ بل انہوں نے خود انڈین لجسلیٹو کونسل میں پیش کیا تھا۔ یہ مسلمانوں کا ایک قدیم مطالبہ تھا جس کو انہوں نے نہایت مہارت اور ذہانت سے کونسل میں پیش کیا اور اس متنازعہ بل کو کونسل سے منظور کروالیا۔ اس بل کی منظوری نہ صرف اس بات کی دلیل تھی کہ جناح مسلم قوانین سے گہری واقفیت رکھتے تھے بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وہ اپنے آئینی اندازِ فکر کی بدولت ہندوستان کے عوام کے لیے ایک موثر رہنما بھی ہیں۔

جناح کی شخصیت اور ان کے سیاسی کردار کو اگر ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۶ء تک ہندوستان میں ہونے والی آئینی اور سیاسی پیش رفت کے تناظر میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں وہ واحد رہنما تھے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کی نگاہ میں قابلِ احترام اور یکساں طور پر مقبول تھے۔ کانگریس سے ان کی سیاسی وابستگی ہونے کے باوجود مسلسل ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک ان کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں شرکت اور خطاب کی دعوت دی جاتی رہی۔ انہوں نے مسلم لیگ کو گہرے طور پر متاثر کیا تھا خصوصاً مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کے دستور اساسی پر نظر ثانی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کے حوالے سے جو فیصلے کیے گئے وہ محمد علی جناح کے ہی سیاسی تدبر کا نتیجہ تھے۔ انہی فیصلوں کی روشنی میں مسلم لیگ نے مارچ ۱۹۱۳ء میں ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت خود اختیاری کے حصول کو اپنا مطمع نظر بنایا اور یہ وہ مطمع نظر تھا جو محمد علی جناح کو بے حد عزیز تھا۔ جنوری ۱۹۱۳ء میں محمد علی جناح کی انڈین لجسلیٹو کونسل کی رکنیت کی مدت پوری ہوگئی۔ جناح نے اس رکنیت کے لیے دوبارہ انتخاب میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا لیکن مسلمانوں کی درخواست پر وائسرائے

نے ان کو لجسلیٹو کونسل کا اضافی رکن نامزد کر دیا تا کہ وہ مسلم وقف علی الاولاد بل کی کونسل سے با قاعدہ منظوری لے سکیں۔ کانگریسی رہنما سروجنی نائیڈو کے بقول اس بل کی کونسل میں منظوری کے نتیجہ میں ہندوستان بھر میں محمد علی جناح کو مسلمانوں کے درمیان پہلی مرتبہ عوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی اور اس بل کی منظوری کو جناح کا ایک اہم کارنامہ تصور کیا گیا۔ جناح ہندوستان میں آباد مختلف فرقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے بھی آرزومند تھے اور یہ بات اس وقت مسلم لیگ کے موقف سے بہت قریب تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے جب وہ لندن میں تھے مولانا محمد علی جوہر اور مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری سر وزیر حسن کے اصرار وایما پر ۱۰/ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔

دسمبر ۱۹۱۳ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمقام آگرہ میں لیگ کے ایک باضابطہ رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال مسلم لیگ کے صدر سر سلطان محمد آغا خان نے لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور مہاراجہ محمود آباد محمد علی محمد خان کو لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کا سفیر

۱۹۱۴ء تک محمد علی جناح نے جہاں انڈین نیشنل کانگریس میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا وہاں وہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کا بھی اعتماد حاصل کر چکے تھے۔ اس طرح وہ کانگریس اور لیگ کے درمیان رابطہ کا کردار ادا کر کے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کی پوزیشن میں آگئے تھے انہوں نے مسلم لیگ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنا آئندہ سالانہ اجلاس اسی مقام اور اسی وقت پر منعقد کرے جہاں کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہو۔ ان کی اسی جدوجہد اور مساعی کے نتیجہ میں کانگریس اور لیگ کے ۱۹۱۵ء میں سالانہ اجلاس بمبئی کے مقام پر منعقد ہوئے انہی اجلاسوں میں کانگریس اور لیگ کی

آئینی اصلاحات کے حوالے سے ایک متفقہ اسکیم تیار کرنے کی جناح نے تجویز پیش کی۔اسی تجویز اور جناح کی مسلسل جدوجہد کی بنا پر لکھنؤ کے مقام پر ۱۹۱۶ء میں دونوں جماعتوں کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کو تاریخ میں 'میثاقِ لکھنؤ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

'میثاق لکھنؤ' جس کے بلاشبہ محمد علی جناح معمار تھے آئینی سطح پر ہندوستان کے جسد سیاست میں جداگانہ مسلم تشخص کو تسلیم کرنے کا براہ راست سبب بنا۔ دوہرے ووٹ کی شق جو میثاقِ لکھنؤ میں شامل تھی دراصل اس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کے اس دعوے کو تسلیم کرلیا گیا کہ وہ ایک کثیر القومی ملک میں ایک جداگانہ قومی گروہ ہیں۔ مزید برآں اس معاہدے سے یہ بات بھی طے پا گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت ہے۔اس معاہدہ کو تکمیل تک پہنچانے کے حوالے سے جناح کی کوششوں کے پیش نظر ہی ان کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا گیا۔

۱۹۱۷ء تک ہندو اور مسلمان دونوں جناح کو ہندوستان کے انتہائی ممتاز اور نمایاں سیاستدان کی حیثیت سے تسلیم کر چکے تھے۔محمد علی جناح کو صرف کانگریس اور امپیریل کونسل میں ہی ایک ممتاز حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ وہ مسلم لیگ میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے اور ہوم رول لیگ کی بمبئی شاخ کے صدر بھی تھے۔آنے والے برسوں میں جب ہندوستان کی سیاست میں تشدد کا عنصر داخل ہوا تو محمد علی جناح کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ وہ نظم وضبط کے ساتھ پیش قدمی، میانہ روی، بتدریج مقاصد کے حصول اور آئینی رکھ رکھاؤ کے داعی تھے اور ان کا ایمان تھا کہ سیاسی دہشت پسندی قومی آزادی کی شاہراہ کبھی نہیں بن سکتی۔اس کے باوجود انہوں نے مارچ ۱۹۱۹ء میں جب حکومت نے عوامی حقوق کا گلا گھوٹنے کے لیے اسمبلی میں 'رولٹ بل' منظور کیا تو انہوں نے اس بل کی منظوری پر شدید احتجاج کرتے ہوئے اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ جناح کا یہ ایک ایسا جرأت مندانہ اقدام تھا جس کو پورے ہندوستان میں

قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ محمد علی جناح کا یہی وہ اندازِ فکر تھا جس کی بنا پر ان جیسے اُصول پرست اور آئینی جدوجہد پر یقین رکھنے والے رہنما کے لیے موہن داس کرم چند گاندھی کے اس پروگرام کو پسند کرنا یا اس کی تائید کرنا ممکن نہ تھا جو ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کے علاوہ سرکاری امداد سے چلنے والے اسکولوں اور کالجوں، عدالتوں، کونسلوں اور برطانوی ٹیکسٹائل کے سہ طرفہ بائیکاٹ پر مشتمل تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی نے ہوم رول لیگ کا صدر منتخب ہو کر اس کا دستور اور نام تبدیل کرنا چاہا تو جناح یہ کہہ کر ہوم رول لیگ سے مستعفی ہو گئے کہ ''انتہا پسندانہ پروگرام نے وقتی طور پر زیادہ تر ناتجربہ کار نوجوانوں، جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کو اپنے زیرِ اثر لیا ہے۔ اس صورتِ حال کا حاصل صرف بدنظمی اور انتشار ہوگا۔''

محمد علی جناح منزل کو جس قدر اہمیت دیتے تھے اسی قدر اہمیت وہ منزل تک پہنچنے کے ذرائع کو دیتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے متشددانہ اور غیر آئینی پالیسیوں کی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ کانگریس نے اپریل ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان پہنچنے والے ہندو رہنما موہن داس کرم چند گاندھی کی سحر طراز شخصیت کے زیرِ اثر عوامی سیاست کی راہ اختیار کر لی تھی جو یقینی طور پر جناح کی سیاسی افتادِ طبع کے منافی تھی۔ جناح نے گاندھی کے پروگرام کے خلاف حتمی مزاحمت ناگپور میں کانگریس کے اجلاس دسمبر ۱۹۲۰ء کے موقع پر کی لیکن مندوبین نے شور و غوغا مچا کر جناح کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ اس صورتِ حال پر ایک ہندو مورخ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ اجلاس گاندھی کے لیے ایک ذاتی فتح ثابت ہوا لیکن میانہ رو سیاستدان جن میں جناح بھی شامل تھے شدید بددل ہو گئے۔'' ناگپور کا اجلاس جناح کی سیاسی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ ہندو مسلم اتحاد اور آزادی کے لیے آئینی پیش رفت کے حوالے سے ان کی کوششیں تعطل کا شکار ہو گئیں اور بالآخر محمد علی جناح نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

....

شادی اور سیاسی اختلافات

۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کا عرصہ جناح کی سیاسی زندگی میں خلفشار کا عرصہ ضرور تھا لیکن ان کی ذاتی زندگی میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی۔ انہوں نے اپریل ۱۹۱۸ء میں ایک پارسی نژاد خاتون رتی پٹیٹ کو مسلمان کر کے اپنے عقد میں لے لیا۔ رتی پٹیٹ جو بعد میں رتی جناح کے نام سے معروف ہوئیں نہایت ذہین اور حسین خاتون تھیں۔ ان کو ہندوستان کی سیاست سے بھی دلچسپی تھی اور وہ جناح سے سیاسی صورتِ حال کے بارے میں تبادلہ خیال بھی کرتی تھیں۔ ۱۴/اگست ۱۹۱۹ء کو لندن میں ان خاتون کے بطن سے محمد علی جناح کی واحد بیٹی 'دینا جناح' پیدا ہوئیں۔ کانگریس سے علیحدگی کے بعد جناح کا زیادہ تر وقت رتی جناح اور اپنے ہم خیال احباب کے ساتھ گزرتا تھا۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک کا عرصہ جناح کے لیے بڑی حد تک گوشہ نشینی کا زمانہ تھا۔ اس عرصہ میں وہ اگرچہ عملی سیاست سے الگ رہے لیکن ہندوستان کے حالات کا نہ صرف جائزہ لیتے رہے بلکہ ان کا تجزیہ بھی کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۳ء میں عام انتخابات کا مرحلہ آیا تو جناح نے ازسرِ نو اپنی پارلیمانی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ ان انتخابات میں ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے خاتمہ کی بنا پر کانگریس اور خلافت کے رہنما پس منظر میں چلے گئے تھے۔ مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے مختلف طبقہ ہائے فکر کو پھر سے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور ان کے لیے ایک مربوط پالیسی وضع کی جائے۔ یہی وہ تمام تقاضے تھے جنہوں نے محمد علی جناح کو مسلم لیگ کو ازسرِ نو زندہ اور فعال کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اجلاس طلب کیا۔

لاہور کا لیگ اجلاس محمد علی جناح نے پنجاب کے رہنماؤں بالخصوص میاں فضل حسین جیسے انتہائی بارسوخ اور بااثر رہنما کی مدد سے طلب کیا اور بڑی حد تک کامیاب رہا کیونکہ اس اجلاس میں نہایت موثر انداز میں آل انڈیا مسلم لیگ کو دوبارہ قومی سیاست میں فعال کرنے کے لیے اس کے اغراض و مقاصد از سرِ نو مرتب کیے گئے اور جناح کو آئندہ تین سال کے لیے لیگ کا مستقل صدر منتخب کرلیا گیا۔ اسی عرصہ میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے جسے وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ضروری تصور کرتے تھے، جدو جہد کرتے رہے۔ انہوں نے اس ضمن میں ہندو لیڈروں کو دسمبر ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اگر چہ محمد علی جناح ہندوؤں کی جانب سے آئینی نظام کے بارے میں کوئی مناسب اور تسلی بخش جواب حاصل کرنے میں ناکام رہے اس کے باوجود آئندہ دو سال تک وہ ہندو رہنماؤں سے اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ اس طرح ایک طرف انہوں نے کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں کو یہ دعوت دی کہ وہ آگے بڑھ کر مسلمانوں کا دستِ تعاون پکڑیں اور فرقہ وارانہ کشیدگی کا کوئی مناسب حل تلاش کریں وہاں مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کوئی لچک دار رویہ اختیار کریں تا کہ اتحاد کی راہ ہموار ہو سکے۔

۱۹۲۴ء سے جناح کی کوشش یہی رہی کہ ایک طرف مسلمان اپنے مطالبات کو اتفاق رائے سے حتمی شکل دیں اور دوسری طرف ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان مصالحت کی تازہ فضا قائم ہو جائے۔ جناح اس حوالے سے ایک مصالحتی فارمولا تلاش کرنے کی بھی جدو جہد میں مصروف تھے بالآخر انہوں نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے نمائندہ مسلمان رہنماؤں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس میں تمام مسائل پر غور و فکر ہوا اور ہندو مسلم اتحا کے لیے نئی تجاویز مرتب کی گئیں۔ یہ تجاویز جو تاریخ میں 'دہلی مسلم تجاویز' کے نام سے معروف ہیں جہاں ایک طرف تمام مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کا مظہر تھیں وہاں اس

کو 'میثاقِ لکھنو' کا متبادل بھی تصور کیا گیا۔

ان تجاویز میں جہاں مرکز میں مسلمانوں کے لیے ایک تہائی نمائندگی، بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی، بلوچستان اور سرحد میں اصلاحات کے نفاذ، پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا وہاں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ان مطالبات کو تسلیم کر لیا تو مسلمان جداگانہ انتخاب کے حق سے دستبردار ہو جائیں گے۔ ان تجاویز سے ظاہر تھا کہ جداگانہ انتخابات کو محمد علی جناح مقصد حاصل کرنے کا ایک وسیلہ تصور کرتے تھے یعنی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک ذریعہ۔ دوسری طرف ہندوؤں کا رویہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کے حق سے محروم تو کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے عوض مسلمانوں کا کوئی بھی مطالبہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ محمد علی جناح نے اگرچہ مسلمانوں کی ان تجاویز پر ہندوؤں کے مخاصمانہ رویے کو بھانپ لیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ پورے خلوص سے چاہتے تھے کہ ہندو مسلم سمجھوتے کی کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے لہٰذا ۱۹۲۸ء کے اوائل میں انہوں نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ اگر مسلمانوں کے صرف تین بنیادی مطالبات جو مرکز، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی سے متعلق ہیں، منظور کر لیے جائیں تو سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے ان کم سے کم مطالبات کو تسلیم کرنے پر رضامند کرنے کے لیے انہوں نے کلکتہ میں دسمبر ۱۹۲۸ء میں منعقدہ نیشنل کنونشن میں بھرپور کوشش کی۔ یہ کنونشن کانگریس کی آئینی تجاویز یعنی 'نہرو رپورٹ' پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ کنونشن میں اگرچہ محمد علی جناح کے دلائل قابلِ تردید تھے لیکن ہندو لیڈروں نے انہیں درخورِ اعتنا تصور نہ کرتے ہوئے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے محمد علی جناح نے ہندو ہنماؤں سے کہا ''ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب تک ہمارا مقصد (ہندوستان کی

آزادی) حاصل نہ ہوجائے ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ آگے بڑھیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندو نہ صرف مسلم لیگ بلکہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلیں۔''

لیکن جناح کی اس دردمندانہ اپیل کے باوجود ہندو اکثریت مصالحت پر تیار نہیں تھی۔ کلکتہ کنونشن میں جناح کے مطالبات کو یکسر نظرانداز کر دیا جانا ایک نہایت ہی افسوسناک امر تھا۔ ایک ہندو مورّخ گوپال نے اس کنونشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اگر کانگریس کے رہنما اتنے ہی حقیقت پسند ہوتے جس قدر جناح تھے تو آج ہندوستان کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔'' اس کنونشن میں مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات کو جس ہٹ دھری کے ساتھ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا وہ محمد علی جناح کی زندگی بھر کی کوششوں پر ایک تباہ کن اور کاری ضرب تھی اس لیے جناح نے اس کنونشن کو 'راستے جدا ہونے' کا مرحلہ قرار دیا۔

۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۸ء تک جناح کی سیاسی جدوجہد سے اگرچہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ ایک قوم پرست سیاست پر یقین رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے مفادات بھی ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی مرحلہ پر یہ تسلیم نہیں کیا کہ قوم پرستانہ مقاصد اور مسلم مقاصد میں کوئی تصادم یا تفاوت موجود ہے۔ اگرچہ ہندو رہنما لالہ لاجپت رائے، مدن موہن مالویہ اور جیکار کا سیاسی رویہ قوم پرستانہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کی جانب سے متعصّبانہ تھا۔ ان کے برخلاف محمد علی جناح دو مختلف مقاصد یعنی ہندو فرقہ وارانہ مقاصد اور مسلم مقاصد کو خلط ملط کرنے پر تیار نہیں تھے۔

اندازِ فکر کی تبدیلی

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے کل جماعتی کنونشن کے نتائج سے جناح شدید دلبرداشتہ تھے۔ ہندوستان کی سیاسی فضا شدید مکدر تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ انتشار و افتراق کا

شکار ہو چکی تھی اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اتحاد موجود نہیں تھا۔ جناح کو بھی اس عرصہ میں ایک شدید صدمہ سے دوچار ہونا پڑا یعنی ان کی اہلیہ رتی جناح کا ۲۰ فروری ۱۹۲۹ء کو انتقال ہو گیا۔ رتی جناح کی تدفین کے بعد محمد علی جناح بمبئی سے واپس دہلی آگئے کیونکہ رتی جناح کے انتقال کے بعد بمبئی ان کے لیے بے معنی ہو گیا تھا۔ دہلی میں انہوں نے از سرِ نو سیاسی سرگرمیوں میں شرکت شروع کر دی۔ ۳ مارچ ۱۹۲۹ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں مولانا محمد علی جوہر نے تجویز پیش کی کہ اس وقت 'نہرو رپورٹ' واحد سیاسی مطالبات نامہ تصور کیا جا رہا ہے اس لیے ایک اور تحریر کی بھی ضرورت ہے جسے مسلمانوں کا سیاسی مطالبات نامہ کہا جا سکے۔ محمد علی جناح اس تجویز سے پوری طرح متفق تھے چنانچہ انہوں نے اس حوالے سے لیگ کے مختلف الخیال رہنماؤں سے تبادلہ خیال شروع کر دیا۔

۱۲ مارچ ۱۹۲۹ء کو جب اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو پنڈت موتی لال نہرو نے ایک قرارداد پیش کی جس میں انہوں نے کہا کہ نہرو رپورٹ ہندوستان کے آئین کے بنیادی اصولوں کا درجہ رکھتی ہے اور اس پر پورا ملک متفق ہے۔ محمد علی جناح نے قرارداد پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ 'نہرو رپورٹ' کی اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں کہ یہ ۱۹۲۷ء کی دہلی مسلم تجاویز کے جواب میں مرتب کی گئی ہے اور اس میں درج شدہ تجاویز مسلمانوں کو قطعی قبول نہیں ہیں۔

۳۰ اور ۳۱ مارچ ۱۹۲۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ملتوی شدہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ اس اجلاس میں محمد علی جناح نے وہ قرارداد مرتب کی جس میں ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں مسلمانوں کی سفارشات درج کی گئی تھیں۔ یہی سفارشات بعد میں محمد علی جناح کے 'چودہ نکات' کے نام سے معروف ہوئیں۔ ہندوستان میں اس دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک طبقہ کی کارگزاریوں کے پس منظر میں دیکھا جائے تو چودہ نکات پیش کر کے جناح نے

مسلمانوں کی صفوں میں موجود اختلافات ختم کرنے کے لیے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا تھا۔ یہ نکات جہاں مسلمانوں کے مختلف طبقہ ہائے فکر میں ارتباط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے تھے وہیں نہرو رپورٹ کے بارے میں جناح کے اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بھی پیش کرتے تھے۔ یہ نکات خالصتاً مسلم نقطۂ نظر کے غماز تھے اس لیے یہ نکات گول میز کانفرنس (۱۹۳۰ء۔۱۹۳۲ء) میں مسلمانوں کے مطالبات کی بنیاد بن گئے۔ برطانوی اقتدار نے گول میز کانفرنس لندن میں بلائی تھی اور اس کا مقصد ہندوستان کے لیے مستقل آئین پر تبادلۂ خیال اور اس کی تیاری تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جناح کے ان چودہ نکات میں سے بعض نکات کو کیمونل ایوارڈ (۱۹۳۲ء) میں شامل کرلیا گیا تھا۔ اسی طرح بعض نکات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بھی شامل کیے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اگلے گیارہ سال کے دوران قراردادِ پاکستان کی منظوری تک یہ نکات اسلامیانِ ہند کا دستور العمل بنے رہے۔

اس مرحلہ پر دیگر مسلمان رہنماؤں کی طرح جناح بھی اس بات کے قائل ہوگئے تھے کہ انڈین نیشنل کانگریس صرف نام کی حد تک قومی جماعت ہے۔ اس کا نیشنلزم سے کوئی تعلق نہیں۔ مزید یہ کہ کانگریس درحقیقت ہندوؤں کی بالادستی قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے اور یہ بالادستی وہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کو قربان کرکے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کانگریس کے اس رویہ کی تصدیق اس وقت زیادہ واضح طور پر ہوگئی جب اس نے گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کے موقع پر یہ دعویٰ کرنا شروع کردیا کہ وہی ہندوستانیوں کی امنگوں اور خواہشات اور تمام اقلیتوں کی واحد ترجمان ہے۔ محمد علی جناح اس تمام صورت حال کو پورے طور پر سمجھ رہے تھے اور کانگریس سے کسی قسم کے تعاون کی امید ان کے دل سے محو ہوتی جارہی تھی حتیٰ کہ انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس کے بعد ہی لندن میں مستقل قیام کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے قبل ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی جوہر جو گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی

نمائندگی کررہے تھے، انتقال کر گئے۔ محمد علی جناح اور محمد علی جوہر کے مابین گزشتہ برسوں میں جو ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی اس کی بنا پر محمد علی جوہر کا انتقال عالم اسلام کے ساتھ ہی ساتھ محمد علی جناح کا ذاتی نقصان تھا۔ گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شرکت کے لیے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ستمبر ۱۹۳۱ء میں لندن پہنچ چکے تھے لیکن وہ بھی گول میز کانفرنس کی کارروائی سے دلبرداشتہ تھے۔ لندن میں محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے درمیان ملاقاتیں ہوئیں اور یہ دونوں رہنما اس بات پر بڑی حد تک متفق ہوچکے تھے کہ گول میز کانفرنس سے مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ علامہ اقبال کانفرنس کے اختتام پر وطن واپس آگئے اور محمد علی جناح لندن میں ہی مقیم ہوگئے۔ محمد علی جناح نے دوسری گول میز کانفرنس میں کوئی حصہ نہیں لیا کیونکہ کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسائل پر گفتگو شروع ہوگئی۔ محمد علی جناح ہمیشہ سے اتحاد و یکجہتی کے علمبردار تھے لہٰذا وہ اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ گول میز کانفرنس کے اختتام کے بعد وزیراعظم برطانیہ کو کمیونل ایوارڈ کا اعلان کرنا تھا۔ جناح لندن میں سیاسی صورت حال کا نہ صرف جائزہ لے رہے تھے بلکہ انہوں نے اس دوران کئی ایک اجلاسوں سے خطاب کرکے اپنے سیاسی موقف کی وضاحت بھی کی۔ ۱۶/اپریل ۱۹۳۲ء کو وزیراعظم برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کردیا جو صرف صوبائی قانون ساز مجلس کی حد تک تھا۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب قائم رہا۔ محمد علی جناح کا خیال تھا کہ مسلمان صرف تحفظات کے ذریعہ زندہ نہیں رہ سکتے ان کو اپنی صلاحیتوں اور جدوجہد کے سہارے زندہ رہنا ہوگا۔ مسلمانوں کے لیے صرف ایک راستہ رہ گیا ہے کہ وہ متحد ہوکر 'چودہ نکات' کی تائید وحمایت کریں اور کسی کے آلہ کار نہ بنیں۔ ذمہ دار مرکزی حکومت اس صورت میں منظور کی جائے گی جب ہمارے تحفظات دستور میں موجود ہوں گے۔

مسلم لیگ کی تنظیمِ نو

اس عرصہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان قیادت کا شدید فقدان پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، سر محمد شفیع، مہاراجہ محمد علی محمد خان جو مرکزی قیادت میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے، انتقال کر گئے تھے۔ پنجاب میں علامہ اقبال اور متحدہ صوبہ جات میں مولانا شوکت علی اور حسرت موہانی ایسے رہنما تھے جو سرگرمِ عمل تھے۔ ایسی صورت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے محمد علی جناح سے ایک ٹیلی گرام میں درخواست کی گئی کہ وہ ہندوستان واپس آ کر مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔ محمد علی جناح نے اس صورتِ حال پر ہمدردانہ غور کرتے ہوئے بنگال کے رہنما چوہدری عبدالمتین کو لکھا کہ میں لیگ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن دسمبر سے قبل ہندوستان واپس نہیں آ سکتا۔ اس دوران بشمول علامہ اقبال ہندوستان کے کئی دیگر رہنماؤں نے بھی محمد علی جناح سے ہندوستان واپس آنے اور مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی درخواست کی۔

محمد علی جناح جنوری ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس آئے اور یکم اپریل ۱۹۳۴ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شرکت کی۔ لیگ کونسل اس سے قبل مارچ ۱۹۳۴ء میں انہیں مسلم لیگ کا صدر منتخب کر چکی تھی۔ محمد علی جناح نے لیگ کونسل کے اجلاس سے بحیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے جاری کردہ قرطاس ابیض کی مذمت کی اور کہا کہ قرطاس ابیض میں جس آئینی اسکیم کی سفارش کی گئی ہے اس سے صرف ہندو مسلم اتحاد کی صورت میں ہی بچا جا سکتا ہے۔

۲۳/ اپریل ۱۹۳۴ء کو محمد علی جناح کو لندن واپس جانا تھا تا کہ وہ پریوی کونسل میں موجود مقدمات کی پیروی کر سکیں لیکن اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ لندن نہیں جا سکے۔ ۲۴ مئی ۱۹۳۴ء کو وہ بحری جہاز سے یورپ روانہ ہوئے اور دسمبر ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس آ گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں اس وقت

جبکہ جناح ابھی لندن میں ہی تھے بمبئی کے مسلمانوں نے ان کو مرکزی اسمبلی کے لیے بلا مقابلہ منتخب کرلیا تھا۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں جب مرکزی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو جناح کو اسمبلی میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قائد منتخب کرلیا گیا۔ اس پارٹی میں زیادہ تر مسلمان شامل تھے اور یہ پارٹی کانگریس کے بعد مرکزی اسمبلی میں تعداد کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر تھی۔

اس دور میں اسلامیانِ ہند نے جناح پر جس اعتماد کا اظہار کیا تھا اور جو توقعات ان سے وابستہ کی تھیں وہ ان پر کماحقہ پورے اترے۔ فروری ۱۹۳۵ء میں محمد علی جناح نے قانونی اور پارلیمانی امور میں اپنی بے مثل صلاحیتوں سے کام لے کر نہ صرف ایک سرکاری تحریک کو ناکام بنا دیا بلکہ جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ میں کانگریس کی تجویز کردہ ترامیم سے متعلق ایک تحریک کو بھی ناکام بنایا۔ مرکزی اسمبلی میں ترامیم کی منظوری کے بعد جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ انہوں نے کانگریسی رہنما راجندر پرشاد کو مذاکرات کی دعوت دی اور یہ مذاکرات کئی ہفتہ تک جاری رہے۔ ۱۸؍ فروری ۱۹۳۵ء کو دہلی کالج کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے محمد علی جناح نے کہا کہ ''اگر میں ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یقین کیجیے کہ یہ اس ملک میں آزادی کے لیے لڑی جانے والی جنگ کو نصف جیت لینے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ ہندوستان کی فلاح اس میں مضمر ہے۔'' اسی دوران راجندر پرشاد سے جناح کے مذاکرات مایوس کن حالات میں ختم ہو گئے۔

محمد علی جناح ایک مرتبہ پھر ۲۳؍ اپریل ۱۹۳۵ء کو بحری جہاز سے انگلستان روانہ ہو گئے جہاں ان کو پریوی کونسل میں ایک مقدمہ کی پیروی کرنا تھی۔ محمد علی جناح ابھی انگلستان میں ہی تھے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کے لیے نئے آئین یعنی 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ' کی منظوری دے دی۔ ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو جناح انگلستان سے بمبئی واپس آئے اور ایک بیان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر رائے

دیتے ہوئے کہا کہ'' یہ ایکٹ ہندوستان پر مسلط کیا گیا ہے لہٰذا رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ باہم مشورہ سے دستور کے سلسلہ میں واضح اور مشترک پالیسی وضع کریں۔ دوسری جانب انگریز تھے جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو اپنا بہت بڑا کارنامہ تسلیم کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی سنجیدگی سے ان پر عملدرآمد شروع کردیں چنانچہ جہاں کانگریس کا رویہ ان کے نزدیک مایوس کن تھا وہاں جناح کی طرف سے ایکٹ کے مندرجات پر نکتہ چینی بھی ان کے لیے حوصلہ شکن تھی۔

محمد علی جناح ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں اس قدر مصروف تھے کہ ان کا تمام وقت مختلف رہنماؤں سے مذاکرات میں گزر رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مسلمان رہنما جو انگریزوں کے حامی تھے جناح سے تعاون پر آمادہ نہیں تھے۔ اس انتہائی حوصلہ شکن صورتِ حال میں جناح کے لیے واحد حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس مرحلہ پر شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ان کا نہایت عزم اور استقامت سے ساتھ دے رہے تھے علامہ اقبال نے پس منظر میں رہتے ہوئے ہندوستانی سیاست کی راہ متعین کرنے میں جناح کی مدد کی۔ علامہ اقبال کے مشورہ پر محمد علی جناح نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ اس دورہ میں انہوں نے صوبائی رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ اپنے اختلافات ختم کر کے مسلم کاز کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلیں۔ جناح نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ متحد و منظم ہو کر مسلم لیگ کے لیے کام کریں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے حوالے سے جناح نے کہا کہ وفاقی سطح پر اسکیم میں جو اعلان کیا گیا ہے اسے قلم زد کر دیا جائے کیونکہ یہ اعلان مکمل اور ذمہ دار حکومت کے قیام سے متعلق ہندوستان کے عوام کی خواہشات کے قطعی منافی ہے البتہ انہوں نے صوبائی اسکیم کو بروئے کار لانے پر زور دیا کہ اس اسکیم میں پہلی مرتبہ صوبائی خودمختاری کو تسلیم کیا گیا تھا۔ جناح نے ۱۹۳۷ء میں ہونے والے انتخابات کے لیے مسلم لیگ کا ایک منشور بھی ترتیب دیا۔ دراصل اس عرصہ میں جناح کی کوشش یہ تھی کہ مسلم لیگ کو ایک ایسی قوت

اور طاقت بنا دیا جائے جس کو تمام مخالفین تسلیم کر لیں۔

محمد علی جناح کی ان تمام کوششوں کے باوجود ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں لیگ کو مختلف النوع اور بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاں ایک طرف مسلمانوں کی صفوں میں انتشار، افتراق موجود تھا وہاں لیگ میں نہ صرف تنظیمی سطح پر کمزوریاں تھیں بلکہ اسے عام انتخابات کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ مالی وسائل بھی بہت محدود اور کم تھے۔ اپنا کوئی اخبار نہیں تھا جو لیگ کے مقاصد کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود لیگ نے کل ۴۹۲ مسلم نشستوں میں سے ۱۰۸ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ یہ کامیابی اگرچہ مایوس کن تھی لیکن اس محدود کامیابی نے کانگریس کے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیا کہ کانگریس اسلامیانِ ہند کی بھی ترجمان ہے کیونکہ کانگریس کو مسلم نشستوں پر سوائے صوبہ سرحد کے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

جناح انتخابی نتائج سے قطعی مایوس نہیں تھے ان کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ مسلمانوں نے کانگریس اور اس کی قیادت کو اپنا ترجمان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ بات طے پا گئی تھی کہ مسلم لیگ کے علاوہ ہندوستان میں کوئی اور سیاسی جماعت اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اسے اسلامیانِ ہند کی حمایت حاصل ہے۔ محمد علی جناح ایک زیرک اور نہایت ہوشیار سیاست دان تھے۔ وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ کب اور کہاں انہیں اقدام کرنا ہے اور کب خاموشی اختیار کرنی ہے۔ انہی مصلحتوں اور سیاسی تقاضوں کے پیشِ نظر جناح نے انتخابات کے موقع پر یا اس کے بعد ان مسلم سیاسی پارٹیوں اور رہنماؤں کے خلاف کوئی منظم یا تند و تیز مہم شروع نہیں کی جنہوں نے مختلف صوبوں میں لیگ کے امیدواروں سے مقابلہ کیا تھا اور جو لیگ کے ایک کل ہند بنیاد پر کام کرنے کی راہ میں مانع تھیں جناح نے ایسے مسلم لیگی ارکان کو بھی پارٹی سے برطرف نہیں کیا جنہوں نے لیگ کے بجائے کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا تھا۔

محمد علی جناح نے انتخابات کے بعد ان تمام پارٹیوں اور افراد کو لیگ کی طرف رجوع کرنے کے لیے جدوجہد شروع کی اور ان کو باور کرایا کہ مسلم لیگ جیسی کل ہند مسلم جماعت کو ہی کانگریس اور انگریزوں سے مساوی حیثیت میں مذاکرات کرنے کا حق حاصل ہوسکتا ہے۔ جناح نے ان گروپوں اور رہنماؤں کو یہ تلقین بھی کی کہ اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام گروہی، قبائلی، مقامی اور صوبائی مفادات کو مسلمانوں کے کل ہند مفادات کا تابع کر دیں۔ جناح اور اسلامیانِ ہند کی یہ خوش فہمی تھی کیونکہ اسی دور میں کانگریس نے کھل کر ہندو مسلم اکثریتی صوبوں میں غیر کانگریس گروپوں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنانے اور انہیں اپنے حلقہ اثر میں شامل کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ کانگریس کی اس پالیسی کا ہدف مسلمان تھے۔ محمد علی جناح کانگریس کے ان عزائم سے مسلمانوں کو قبل از وقت ہی آگاہ کر چکے تھے لہٰذا مسلمان رہنماؤں کے کان کھڑے ہوئے اور ان کو اتحاد کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ خصوصاً ۱۹؍ مارچ ۱۹۳۷ء کو کل ہند قومی کنونشن دہلی میں جشنِ فتح سے خطاب کرتے ہوئے جب جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کانگریس میں دلچسپی لیں اور اس میں شامل ہوں تو نہ صرف جناح بلکہ علامہ اقبال بھی فکرمند ہوگئے۔ علامہ اقبال نے محمد علی جناح کو اس موقع پر ایک خط میں لکھا کہ جواہر لال نہرو کے اس اقدام کا جواب دیا جانا چاہیے اور اس حقیقت کو واشگاف کرنا چاہیے کہ مسلمان ایک جداگانہ سیاسی حیثیت کے مالک ہیں اور اس حیثیت سے ان کا اپنا ایک علیحدہ سیاسی مطمع نظر ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں یہ ایک ایسا مرحلہ تھا جہاں کانگریس کے تقریباً تمام رہنما شدید منافقت کا شکار تھے۔ ہر شخص بظاہر اتحاد کا دعویدار تھا لیکن عملی طور پر اس کا مظاہرہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کانگریس انتخابات میں اپنی فتح کے بعد یہ تصور کرنے لگی تھی کہ اب صرف اسی کو ہندوستان کی تقدیر کو بدلنے کا اختیار حاصل ہوگیا ہے اس لیے

اس نے نہ صرف مسلمانوں سے عوامی رابطہ مہم کا آغاز کیا بلکہ اکثریتی راج کے اصول پر عمل پیرا ہو کر مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر خالص کانگریسی وزارتیں مسلط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کانگریس کی منافقت اور دو عملی اس حقیقت سے بھی عیاں تھی کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بنگال جیسے صوبے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہ مخلوط حکومتیں قائم کرنا چاہتی تھی لیکن ہندو اکثریتی صوبوں میں وہ صرف کانگریس کی حکومت قائم کرنے پر مصر تھی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوچنا پڑا کہ کانگریس کی اس روش اور ذہنیت کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ مسلمانوں کے لیے کانگریس کا یہ رویہ خطرے کی گھنٹی تھا چنانچہ مسلمان فطری طور پر اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ وہ سیاسی محاذ پر اپنی قوت کو مجتمع کر کے یہ ثابت کر دیں کہ ہندوستان میں ان کی حیثیت ہندوؤں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اندازِ فکر میں اس تبدیلی اور دوسری طرف محمد علی جناح کی جانب سے اسلامیانِ ہند کے اتحاد کی ترغیب و اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی صوبوں کے ایسے مسلم رہنما جو ایک برس قبل تک اپنی پارٹیوں کو لیگ میں ضم کرنے پر آمادہ نہ تھے لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان رہنماؤں میں انتہائی نمایاں سر سکندر حیات خان، فضل الحق، سر محمد سعد اللہ تھے جو علی الترتیب پنجاب، بنگال اور آسام کے وزرائے اعلیٰ تھے۔ ان تمام صوبائی سربراہوں نے اپنے پیروکاروں کے ساتھ مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ میں اپنی شمولیت کا اعلان کیا۔

سیاسی استحکام کا حصول

مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس کو اسی بنا پر نہ صرف جدید مسلم ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ قرار دیا جاتا ہے بلکہ یہ محمد علی جناح کی طویل سیاسی زندگی کا ایک اہم ترین سنگ میل بھی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے جناح اور مسلم لیگ، دونوں نے

عوامی سیاست میں بیک وقت داخل ہونے کا اعلان کیا۔ ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں اس مرحلے پر وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ تھا کہ عوام کو جمہوری عمل میں براہِ راست شریک کیا جائے۔ مستقبل کے پروگرام اور مقاصد پر مسلمانوں میں اتحاد اور اتفاقِ رائے پیدا کیا جائے اور مسلمان قوم کو اس جدوجہد کے لیے تیار کیا جائے جو مستقبل میں اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ وقت کے انہی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے لیگ کو ایک حقیقی جمہوری تنظیم بنا دیا گیا۔ لیگ کی رکنیت سازی کا فیصلہ کیا گیا۔ رکنیت فیس دو آنہ (موجودہ بارہ پیسے) مقرر کی گئی۔ ہر سطح پر لیگ کی تنظیم کے لیے ایک پروگرام بنایا گیا۔ علاوہ ازیں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کی گئی۔ مسلم لیگ نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ دو ظاہری علامتیں بھی اپنا لیں جو کسی سیاسی جماعت کے وجود کا اظہار ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر عوام کے ذہنوں میں اس جماعت کے اثرات گہرے طور پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص اور افتخار کے اظہار کے لیے مسلم لیگ سیشن کے پنڈال پر لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرایا گیا۔ رضا کاروں کی ایک نیم فوجی تنظیم قائم کی گئی جس کے ذمہ سیشن کے انتظامات تھے۔ اس موقع کے لیے لیگ کا ایک نغمہ بھی بطور خاص تیار کرایا گیا تھا۔ یہ نغمہ کیا تھا ایک رجز تھا اور اس کا موضوع 'مسلمانوں کے لیے جناح کا پیغام' تھا۔ جس میں مسلمانوں کو لیگ کے پرچم تلے جمع اور متحد ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد اور مجتمع کرنے کے لیے جناح نے طویل انتھک اور تاریخی جدوجہد کی تھی۔

۱۹۳۷ء کے وسط سے جو عوامل جناح کی مساعی میں کارفرما تھے ان میں مسلمانوں کو اقتدار میں شریک کرنا سب سے اہم تھا مسلمانانِ ہند کی حالیہ دوصد سالہ تاریخ کو بہ نظر غائر دیکھا جائے اور اس دوران اس دور کی مختلف تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو ان سب میں ایک قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے مسلمانوں میں اقتدار سے محرومی کا احساس، جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ حقیقتاً ان

سب تحریکوں کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا اقتدار واپس دلایا جائے۔ مسلمانوں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ جناح کی شخصیت میں انہیں اپنا صحیح ترجمان مل گیا ہے۔ ایسا ترجمان جو ان کو اپنی تاریخ کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچانے میں رہبرِ کامل ثابت ہوگا۔ مسلمانوں کے اس ایقان ہی کا نتیجہ تھا کہ روز بروز جناح کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ ۱۹۳۸ء کے اوائل سے وہ اسلامیانِ ہند کے قائداعظم کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض میں مقبول ہوتے چلے گئے۔ اس تمام عرصہ میں جناح کو علامہ اقبال کی طرف سے فکری اور عملی تعاون حاصل رہا۔ علامہ اقبال نے جناح سے مسلسل خط و کتابت کی اور ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے مستقبل کو ہندوستان میں محفوظ کرنے کے لیے کوئی پائیدار حل تلاش کریں اور یہ علامہ اقبال کی ہی کوششیں تھیں جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے درمیان ہندوستان کے اندر ایک علیحدہ مسلم وطن کے قیام کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔

جب کانگریس ایک مرتبہ اکثریتی صوبوں میں اقتدار میں آ گئی تو اس نے متعدد ایسے اقدامات کیے جو لامحالہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے۔ ان اقدامات میں اسمبلی کی کارروائی شروع ہونے سے قبل 'بندے ماترم' نامی ترانہ پڑھنا جو نہ صرف بت پرستانہ بلکہ مسلم کش تھا، تمام سرکاری اور عوامی عمارتوں پر کانگریس کے پرچم کو لہرانا اور یوپی کے اسکولوں میں اردو کی جگہ ہندی نافذ کرنا شامل تھے۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مرتبہ پھر فرقہ وارانہ فسادات میں شدت پیدا ہوگئی۔ ایک اور نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مسلم رہنماؤں نے یہ محسوس کرلیا کہ جب تک وہ متحد نہیں ہوں گے ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ ۱۹۳۸ء میں ہی جناح کی تجویز پر خواتین کی ایک سب کمیٹی جس میں نہایت اہم خواتین جیسے محترمہ فاطمہ جناح، لیڈی عبداللہ ہارون، بیگم اصفہانی، بیگم نواب اسماعیل خان اور بیگم شاہنواز شامل تھیں، قائم کی گئی۔ اس کمیٹی نے بہت عمدہ کام کیا اور مسلمان خواتین

کی ایک بہت بڑی تعداد آل انڈیا ویمنز کانفرنس کو چھوڑ کر مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگی۔

محمد علی جناح کے کانگریسی رہنماؤں سے مذاکرات اور کانگریس کی حکمرانی والے صوبوں میں درپیش شکایات کی ۱۹۳۸ء میں 'پیرپور رپورٹ' میں اشاعت کے باوجود کانگریسی حکومتوں کے طرزِ عمل میں ذرّہ برابر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ ہندو مسلم فسادات جاری تھے اور ایک تخمینہ کے مطابق دو سال کے عرصہ میں جو اکتوبر ۱۹۳۷ء سے شروع ہوتا ہے کم از کم ۸۵ نہایت سنگین نوعیت کے فسادات ہوئے جن میں ۱۷۰۰ افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً دو ہزار زخمی ہوئے۔ درحقیقت ۱۹۳۹ء میں عام طور پر یہ یقین کیا جانے لگا تھا کہ اگر کانگریس کی حکومتیں کچھ دن اور اقتدار میں رہیں تو غیر معمولی سطح پر خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ ہندوستان میں خانہ جنگی کا رُخ دوسری جنگِ عظیم نے پھیر دیا جو یورپ میں شروع ہو گئی تھی اور جس میں ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ ایک فریق بن گیا تھا۔ اس موقع پر کانگریس نے یہ موقف اختیار کیا کہ برطانیہ نے ہندوستان کے عوام کی مرضی و منشا کے بغیر ہندوستان کو جنگ میں ملوث کر دیا ہے۔ کانگریس کی ہائی کمان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے نومبر ۱۹۳۹ء کے وسط تک تمام صوبوں میں کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ ۲۲ دسمبر کو تمام مسلمان یومِ نجات منائیں گے اور کانگریس کے ظلم و جبر کے خاتمہ پر اظہارِ تشکر کریں گے۔

مطالبۂ پاکستان

اس صورتِ حال میں بھی جناح نے ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان مفاہمت کے امکان کو مسترد نہیں کیا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق طلبا کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا "دیانت دارانہ اصطلاحی معنی

میں اب بھی میں قوم پرست ہوں... ہندو مسلم مفاہمت پر میرا ہمیشہ ایمان رہا ہے۔ لیکن یہ مفاہمت صرف باعزت مفاہمت ہوگی جس کی آج کسی کو بھی امید نظر نہیں آتی۔'' یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو جناح نے گاندھی کو لکھا اور ان پر زور دیا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی راہ نکالنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں۔ لیکن کانگریس کے رہنما مسلسل اس دعویٰ پر جمے ہوئے تھے کہ کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ کانگریس کے ارکان کی اکثریت ہندو تھی اور یہ مسلم لیگ ہی تھی جسے ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کی حمایت حاصل تھی اور یہی وجہ تھی کہ کسی بھی زاویے سے دیکھا جائے تو مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی۔ اس صورت حال میں جناح کا حتمی ردعمل یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہونا چاہیے۔

بہرحال ان تمام برسوں کے دوران جناح ہندو مسلم مفاہمت کے لیے سخت کوشاں رہے اور یہ اُمید کرتے رہے کہ ہندو رہنما فرقہ وارانہ مسئلہ پر اپنے رویہ میں کوئی لچک پیدا کریں گے۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں جناح نے ایک برطانوی ہفت روزہ جریدے 'ٹائم اینڈ ٹائڈ' میں ایک مضمون لکھا جس میں تجویز پیش کی کہ ''کوئی ایسا دستور ضرور مرتب کرنا ہوگا جو اس بات کو تسلیم کرتا ہو کہ ہندوستان میں دو اقوام ہیں جو یقیناً پنی مشترکہ مادر وطن کے نظم ونسق کو چلانے میں شراکت دار ہوں گی۔ ایسے کسی دستور کو مرتب کرنے کے لیے مسلمان ہمہ وقت برطانوی حکومت، کانگریس یا کسی اور جماعت سے تعاون کے لیے تیار ہیں۔'' بہرحال ہندوؤں کی جانب سے کسی مثبت رویہ کا ظہار نہیں ہوا اور فروری ۱۹۴۰ء میں جناح اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ہندو کسی قسم کی مفاہمت کے لیے مسلمانوں کے ساتھ تیار نہیں ہیں لہٰذا جناح نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ آزاد ریاست کے قیام کا مطالبہ کریں گے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور ۱۹۴۰ء میں جناح نے اعلان کیا۔

> جیسا کہ عام طور پر غلط تصور کیا جاتا ہے کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں... مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ مسلمان ہر تعریف کی رو سے ایک قوم ہیں... وہ اتحاد جسے حکومت ہند گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے مرکزی وفاقی حکومت کے نفاذ سے حاصل نہیں ہوسکتا... ہندوستان میں مسئلہ فرقوں کے درمیان نہیں ہے بلکہ یہ بین الاقوامی ہے اور اس کو بین الاقوامی سمجھ کر ہی حل کرنے کی کوشش کی جانا چاہیے... ہندو اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رواجوں اور ادبیات سے ہے... یہ دونوں دو ایسی تہذیبوں سے وابستہ ہیں جن کی بنیاد متصادم خیالات اور تصورات پر ہے۔

جب محمد علی جناح یہ مطالبہ کر رہے تھے تو وہ یہ بات جانتے تھے کہ یہ مطالبہ ہندو اکثریتی صوبوں کے اقلیت پر مشتمل مسلمانوں کے لیے سودمند ثابت نہیں ہوگا لیکن اس صورتِ حال میں جناح کے پاس سوائے اس کے اور کیا راستہ تھا کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے یہ کہیں کہ وہ اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کی راہ نہ روکیں۔ جناح کی اسی سوچ کا ساتھ دیتے ہوئے مسلم لیگ کے اجلاس نے وہ قرارداد منظور کی جس میں ہندوستان کے شمالی مغرب اور مشرق میں باہم متصل مسلم اکثریتی علاقوں کی حد بندی کی تجویز رکھی گئی تھی۔ ایک علیحدہ مسلم وطن کے قیام کی قرارداد جو مطالبۂ پاکستان کے طور پر معروف ہوئی۔ ایک علیحدہ وطن کے مطالبہ نے پورے ملک میں مسلمانوں کو ایک نئے تصور سے سرشار کر دیا اور اس مطالبہ کے بعد عوام کے درمیان مسلم لیگ کی مقبولیت کو بڑی تیزی سے فروغ حاصل ہوا لیکن ہندوؤں نے اس مطالبہ کو 'ہند ماں کے ٹکڑے' کرنے کے مترادف قرار دیا اور نہایت شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی

دستوری جدو جہد

مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبہ کے بارے میں برطانوی حکومت کو فیصلہ کرنا تھا لیکن ۱۹۴۰ء میں برطانیہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے سے زیادہ جنگی کوششوں میں ہندوستان کے تعاون کے حصول میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جنگی کوششوں کے سلسلہ میں برطانوی حکومت کو ہندوستان کی آبادی کے تمام طبقات کی حمایت درکار تھی ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں نظریات کلی طور پر ایک دوسرے سے متضاد تھے لہٰذا یہ برطانیہ کے مفاد میں تھا کہ وہ دونوں کو مطمئن رکھے۔ ان حالات کے تناظر میں جب جنگ کی صورتِ حال برطانیہ میں شدید پرتشویش ہوگئی تھی وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے برطانوی حکومت کی منظوری سے ۸؍اگست ۱۹۴۰ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں ہندوستان کا دستور مرتب کرنے کے بارے میں کانگریس کے مطالبہ پر جنگ کے خاتمہ کے بعد عمل درآمد کیا جائے گا اور اسی وقت اقلیتوں کے مفادات کو تحفظ دیا جائے گا اور ان وجوہات کی بنا پر برطانوی حکومت کسی ایسے دستور کو تسلیم نہیں کرے گی جس کو ہندوستان کی قومی زندگی میں موجود کسی بڑے اور طاقتور عناصر نے مسترد کر دیا ہو۔

یہی اسباب تھے کہ وائسرائے نے اپنی ایگزیکٹو کونسل اور کچھ نئے اداروں کی تشکیلِ نو کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ سے تعاون طلب کیا۔ جناح نے یہ اندازِ فکر ختیار کرلیا تھا کہ یہ ہندوستانیوں کے خود اپنے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے ملک کے دفاع میں حصہ لیں۔ بہرحال مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں قائم وزارتوں نے حکومت کی جنگی کوششوں میں تعاون کیا۔ محمد علی جناح نے خود کو مسلم لیگ کے اغراض ومقاصد کی تشہیر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مارچ اور اپریل ۱۹۴۱ء میں انہوں نے متعدد بڑے جتماعات سے خطاب کیا۔ مدراس میں لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے

جناح نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ کا نظریہ اس بنیادی اصول پر مبنی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک آزاد قومیت ہیں اور ان کی قومی اور سیاسی شناخت اور اتحاد کو ضم کرنے کی کسی بھی کوشش کے خلاف نہ صرف مزاحمت کی جائے گی بلکہ میرے خیال میں ایسی کوئی بھی کوشش بے سود اور بے کار ثابت ہوگی۔

چند ہفتوں کے بعد جناح یہ حقیقت ظاہر کرنے کے اہل ہو گئے تھے کہ درحقیقت مسلم لیگ ایک مضبوط اور مستحکم جماعت کا روپ دھار چکی ہے۔ وائسرائے ہند لنلتھگو جیسا کہ معلوم ہوتا تھا جناح کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ لیگ کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے لہٰذا اس نے جناح سے مشورہ کیے بغیر مسلمان وزراء اعلیٰ اور مسلم لیگ کے چند دیگر ممتاز ارکان کو اپنی نوتشکیل شدہ نیشنل ڈیفنس کونسل میں رکن نامزد کر دیا۔ جناح نے وائسرائے کے اس اقدام کو لیگ کی ایگزیکٹو کی منظوری کے بغیر شرمناک تصور کیا، جناح اس وقت وزراء اعلیٰ اور چند دیگر مسلم لیگی رہنماؤں کے استعفیٰ حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

۱۹۴۲ء کے آغاز پر برطانوی حکومت نے اپنی جنگی کابینہ کے ایک ممتاز رکن سر اسٹیفورڈ کرپس کو ایک تجویز لے کر ہندوستانی رہنماؤں سے مذاکرات کے لیے ہندوستان بھیجا۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر قائم ہونے والی منتخب ہندوستانی قانون ساز اسمبلی جو آئین بنائے گی وہ قابلِ عمل ہوگا۔

آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے پہلے سے طے شدہ ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ کانگریس نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ اعلامیہ پاکستان کا اصول تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور اس میں درحقیقت فوری طور پر انتقالِ اقتدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیگ کا اعتراض یہ تھا کہ اس اعلامیہ میں مسلمانوں کے مطالبہ کو غیر مبہم طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کانگریس کے رہنماؤں کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ جاپان بہت جلد ہندوستان پر قبضہ کر لے گا۔ اس لیے انہوں نے مطالبہ کیا کہ برطانوی اقتدار کو

فوری طور پر ہندوستان پر سے ختم کر دیا جائے۔ اس کو تقویت پہنچانے کے لیے کانگریس نے 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کا آغاز کیا جس کی بنا پر ہندوستان کے متعدد حصوں میں سنگین نوعیت کی بدامنی پھیل گئی۔ مسلم لیگ کی قیادت کا یہ خیال تھا کہ کانگریس کی اس تحریک کا مقصد پاکستان کے مطالبہ کو بھی نقصان پہنچانا ہے اس لیے جناح نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس تحریک سے علیحدہ رہیں۔ اس مرحلہ پر جناح نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ''تقسیم کرو اور جاؤ''۔

۱۹۴۳ء تک جناح کے پاس اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے لیے متعدد خوش آئند وجوہات تھیں کہ ان کی شدید محنت کے نتیجہ میں مسلم لیگ مستحکم اور فعال ہو چکی ہے۔ مطالبہ پاکستان کو عوام اور مختلف طبقات کی جانب سے وسیع پیمانے پر جو حمایت حاصل ہوئی اس نے کانگریس کے لیے اس مطالبہ کو یکسر مسترد کر دینے کے امکانات کو بڑی حد تک ناممکن بنا دیا۔ صوبہ مدراس کے سابق وزیراعلیٰ چکرورتی راج گوپال اچاریہ نے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کی بنیاد کے طور پر ایک فارمولا مرتب کیا۔ فروری ۱۹۴۳ء میں انہوں نے یہ فارمولا گاندھی کو دکھایا جنہوں نے اس کی منظوری دے دی۔ اس فارمولے میں کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ آزادی کے لیے کانگریس کے مطالبہ کی توثیق کرے گی اور کانگریس سے عبوری حکمت کی تشکیل میں تعاون کرے گی۔ اگرچہ اس فارمولے کی شرائط مطالبہ پاکستان کی روح کے منافی تھیں لیکن جناح نے ان پر ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی سے مذاکرات کے لیے نہ صرف آمادگی ظاہر کر دی بلکہ دیگر تجاویز پر ان دونوں رہنماؤں نے غور کیا۔ مذاکرات کے دوران گاندھی نے خلافِ توقع یہ موقف اختیار کیا کہ وہ جناح سے کانگریس کی جانب سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں ملاقات کر رہے ہیں۔ گاندھی نے یہ بھی کہا کہ وہ جناح کے اس خیال کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی ذاتی حیثیت میں ایک علیحدہ قوم ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ دنوں صورتیں جناح کے لیے قابلِ

قبول نہیں تھیں۔

پاکستان کی جانب پیش رفت

مئی ۱۹۴۵ء میں یورپ میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ آئندہ ماہ وائسرائے لارڈ ویول نے جنہوں نے ۱۹۴۳ء کے اختتام پر لنلتھگو سے اختیارات حاصل کیے تھے اور جاپان کے خلاف جنگ میں ہندوستانیوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے کوشش کی تھی برطانوی حکومت کی منظوری سے ایک تجویز پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ ان کی ایگزیکٹو کونسل کو مکمل طور پر ہندوستانی بنانے کے لیے ازسرِ نو تشکیل دیا جائے گا (ماسوائے ان کے اور کمانڈر انچیف کے) اور اس میں ہندو اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی جائے گی۔ عین اسی وقت وائسرائے نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ کونسل کی تشکیل نو کی تجویز ہندوستان کے آئندہ آئین کے سلسلہ میں انتظامات پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوگی۔

اس تجویز پر وائسرائے اور ہندوستان کے رہنماؤں نے کونسل میں نمائندگی کے سوال پر اپنے قدیم موقف کو دہرایا جس کا نتیجہ کانفرنس کے تعطل کی صورت میں نکلا۔ کانفرنس میں سب سے پیچیدہ مسئلہ یہ تھا کہ وائسرائے کی کونسل میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کس طرح نمائندگی دی جائے۔ کانگریس یہ چاہتی تھی کہ کم از کم اس کا نامز کردہ ایک رکن مسلم کوٹہ پر لیا جائے۔ وائسرائے اپنی طرف سے یہ چاہتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ممتاز مسلم رکن بھی کونسل میں شامل کیا جائے۔ جناح کو یہ دونوں مطالبے تسلیم نہیں تھے جنہوں نے یہ موقف اختیار کر رکھا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی صرف مسلم لیگ کرتی ہے اور اس لحاظ سے مسلم لیگ ہی تنہا تمام مسلمان ارکان کو نامزد کرے گی۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کا اصل سبب دراصل کانگریس اور وائسرائے کا یہ دعویٰ

تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی ہے۔اگست میں جاپان نے ہتھیار ڈال دیے اور برطانوی حکومت کی ہدایات کے مطابق وائسرائے نے آنے والے موسم سرما میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔توقعات کے مطابق مسلم لیگ نے اپنے دو دعوؤں کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیا یعنی مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے اور مسلمان اپنی ایک علیحدہ ریاست چاہتے ہیں۔ کانگریس اور اس کے اتحادیوں نے ان دونوں دعوؤں کی شدید مخالفت کی۔

انتخابات کے نتائج نے مسلم لیگ کے دعوؤں کی مکمل توثیق کر دی۔ مجموعی طور پر ڈالے گئے مسلم ووٹوں میں سے مسلم لیگ کو تین چوتھائی ووٹ ملے اور اس نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل کی جبکہ صوبائی اسمبلیوں کی ۴۹۲ نشستوں میں سے ۴۲۵ نشستوں پر وہ کامیاب ہوئی۔ جب مسلم لیگ کے دعوؤں کی صداقت سامنے آ گئی تو اپریل ۱۹۴۶ء میں فقط رسمی طور پر مسلم قانون سازوں کا دہلی میں ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی اس قرارداد میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مشرق میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک مسلم زون 'ایک خودمختار آزاد ریاست کے طور پر تشکیل دیا جائے اور یہ کہ پاکستان کے قیام کے بارے میں اسکیم کے بلاتاخیر نفاذ کی واضح ضمانت دی جائے۔' دریں اثنا سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند لارڈ پیتھک لارنس کی سربراہی میں ایک سہ رکنی کابینہ مشن ہندوستان پہنچا تاکہ وہ ہندوستانی رہنماؤں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں سے گفت وشنید کر کے مستقبل کے لیے ہندوستانی آئین کی ترتیب میں تعاون کریں لیکن صرف چند دن پہلے جب مشن ہندستان کے لیے روانہ ہونے والا تھا برطانیہ کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے ایک بیان دیا جس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت جہاں اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں آگاہ اور فکر مند ہے وہاں وہ اقلیت کو یہ اختیار بھی نہیں دے گی کہ وہ اکثریت کی

میں آ گاہ اور فکر مند ہے وہاں وہ اقلیت کو یہ اختیار بھی نہیں دے گی کہ وہ اکثریت کی رائے کو مسترد کر دے۔ محمد علی جناح کو اس بیان سے دکھ پہنچا اور انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ ''میں یہ بات ایک مرتبہ پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور حق خودارادیت ان کا پیدائشی حق ہے۔''

کابینہ مشن نے مختلف فرقوں اور متعلقہ طبقوں مزید برآں ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں سے مذاکرات کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس کے مخالف نقطۂ نظر سے جو اصل مسئلہ پیدا ہو رہا تھا اس کی جانب توجہ دی۔ اس ضمن میں مشن نے ۵/اور ۱۲/مئی ۱۹۴۶ء کو شملہ میں ایک کانفرنس میں مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندوں سے ملاقات کی اور ان کے سامنے ایک فارمولا پیش کیا جس میں ایک لچک دار مرکز کی گنجائش رکھی گئی تھی جو دفاع، اُمور خارجہ اور مواصلات کے شعبوں کی نگرانی کرے گا جبکہ صوبوں کے دو گروپ ہوں گے جن میں سے ایک ہندو اکثریتی اور دوسرا مسلم اکثریتی ہوگا جو علاقائی بنیادوں پر چند طے شدہ معاملات کی نگرانی کریں گے اور دیگر معاملات کو صوبائی انتظامیہ کی صوابدید پر چھوڑ دیں گے لیکن اس فارمولے کی بنیاد پر مسلم لیگ اور کانگریس کسی مفاہمت پر نہیں پہنچ سکیں۔

وزارتی مشن کی سفارشات

محمد علی جناح وزارتی مشن کی سفارشات سے بہت مایوس تھے۔ ۲۲ مئی ۱۹۴۶ء کو انہوں نے مشن کے بیان پر افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ ''ان سفارشات میں پیش پا افتادہ باتوں کے فروغ کو درست تصور کیا گیا ہے پاکستان کے خلاف دلائل کی بھرمار کی گئی ہے اور ارادی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کے لیے مخصوص ہتھکنڈوں کے جواز میں افسوسناک زبان استعمال کی گئی ہے۔'' لیکن محمد علی جناح نے اس منصوبہ کو مسترد نہیں کیا۔ دو دن بعد کانگریس کی

ورکنگ کمیٹی نے یہ موقف اختیار کیا کہ صوبوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ منصوبہ میں ان کو تفویض کیے گئے سیکشنز سے استفادہ کریں یا نہ کریں۔ مشن نے فوری طور پر اس موقف کو مسترد کرتے ہوئے ایک بیان میں کہا کہ صوبائی گروپ بندی وزارتی مشن کی اسکیم کا ایک لازمی جز ہے۔

۶ جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی کونسل کا ایک اجلاس محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا جس میں وزارتی مشن کے منصوبہ کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وزارتی مشن کے منصوبہ میں ایک عبوری اتحادی حکومت کے قیام کی تجویز بھی شامل تھی۔ اس عبوری حکومت کو فوری طور پر تشکیل دینے کے لیے کہا گیا تھا۔ وائسرائے کا نظریہ یہ تھا کہ مجوزہ عبوری حکومت ۵ کانگریسی، ۵ مسلم لیگی اور چھوٹی اقلیتوں کے دو نمائندوں پر مشتمل ہو۔ اس طرح مسلم لیگ کو نئی حکومت میں چالیس فیصد موثر نمائندگی مل رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ کانگریس نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس صورتِ حال میں وائسرائے نے وزارتی مشن کی منظوری سے ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے کہا کہ نئی حکومت میں ۱۴ ارکان ہوں گے جن میں سے چھ کانگریسی، پانچ مسلم لیگی، ایک سکھ، ایک ہندی عیسائیوں اور ایک پارسی فرقہ سے ہوگا۔ بیان میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی تھی کہ مندرجہ بالا خطوط پر اتحادی حکومت کی تشکیل میں اگر دونوں بڑی جماعتوں یا دونوں میں سے کسی ایک نے شمولیت میں عدم دلچسپی کا ثبوت دیا تو ایسی صورت میں وائسرائے کا یہ ارادہ ہے کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے کارروائی کرے گا اور یہ عبوری حکومت ۱۶ر مئی کے بیان کو تسلیم کرنے کے خواہش مند افراد کی ممکنہ حد تک نمائندہ ہوگی۔ یہ حتمی پیشکش بھی کانگریس کے لیے ناقابلِ قبول تھی اور اس نے وزارتی مشن کے ارکان سے خفیہ مذاکرات کا آغاز کر دیا۔ دوسری طرف لیگ یہ واضح کر چکی تھی کہ منظور شدہ پیشکش کے مطابق حکومت کی ہیئت میں اب کسی قسم کی کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی۔ خفیہ مذاکرات

کے نتیجہ میں پیشکش واپس لے لی گئی۔اس صورتِ حال میں مسلم لیگ کی کونسل کا ایک اجلاس جولائی کے آخری ہفتہ میں بمبئی میں طلب کیا گیا۔کونسل کے اجلاس میں محمد علی جناح نے وضاحت کی کہ لیگ ایک دوستانہ اور پُرامن مفاہمت کے حصول کی اپنی شدید خواہش کے پیش نظر رعایت پر رعایت دیتی رہی کیونکہ یہ مفاہمت صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ اس برصغیر میں آباد تمام دیگر فرقوں کو حصول آزادی کی راہ پر ڈال دے گی جبکہ کانگریس نے اپنی تنگ نظری سے ہندوستان کے عوام کو عظیم نقصان پہنچایا ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی جواز نہیں کہ بس مسلم لیگ کو جھکا لے۔ محمد علی جناح نے وزارتی مشن کے کردار پر بھی شدید تنقید کی اور کہا کہ اگرچہ کانگریس نے اپنی وضع کردہ توضیحات کے ساتھ طویل المیعادی منصوبہ قبول کرلیا ہے لیکن یہ عملاً ہر طرح مشن کو مسترد کرنے کے مترادف ہے۔ مشن نے کانگریس کی رضامندی کو مبنی برحقیقت تصور کرلیا ہے اور اس طرح وہ خود اپنے قول سے پھر گیا ہے۔اس صورت حال میں جناح کو مزید قوت کے ساتھ یہ کہنے کا حق حاصل ہوگیا کہ ہندوستان کے مسئلہ کا حل صرف پاکستان کے قیام میں مضمر ہے۔

مسلم لیگ کی کونسل نے وزارتی مشن منصوبہ کے حوالے سے اپنی منظوری واپس لینے کا فیصلہ کرلیا، ایک اور قرارداد کے ذریعہ فیصلہ کیا کہ اب مسلم قوم کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ راست اقدام سے کام لے اور اپنے حقوق کے آزادانہ استعمال، اپنے وقار کی بحالی، برطانیہ کی موجودہ غلامی سے نجات اور مستقبل میں ہندو تسلط کے خواب کو چکنا چور کرنے کے لیے پاکستان حاصل کرے۔۱۶/اگست کو جسے لیگ نے یوم راست اقدام قرار دیا تھا کلکتہ میں سنگین فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے جہاں مسلمان مجموعی آبادی کا چوبیس فیصد تھے۔ ان فسادات نے پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید کشیدگی پیدا کردی۔ ۲۴/ اگست کو وائسرائے نے نئی عبوری حکومت کا اعلان کردیا جسے ۲ ستمبر کو اپنے قلمدان سنبھالنا

تھے۔اس عبوری حکومت کی فہرست میں مسلم لیگ کے لیے نشان زد کوٹہ میں سے تین غیر لیگی افراد کے نام شامل تھے۔اس اعلان کے بعد وائسرائے لارڈ ویول نے مسلم لیگ سے تعاون کا مطالبہ کیا۔اس موقع پر محمد علی جناح نے جواباً کہا کہ وائسرائے مسلم لیگ سے اجتناب برت کر اور اسے نظر انداز کر کے اور اپنے قول سے پھر کر دوہری غداری کے مرتکب ہوئے ہیں۔

وائسرائے عبوری حکومت میں لیگ کو شامل کرنے کے لیے شدید متفکر ہو گئے اور انہوں نے ۱۶/اور ۲۵ ستمبر ۱۹۴۶ء کو جناح سے ملاقات کر کے عبوری حکومت اور آئینی فارمولے سے متعلق متنازعہ اُمور پر بات چیت کی۔ جناح اس بات چیت سے اگرچہ غیر مطمئن تھے لیکن انہوں نے دریں اثنا یہ محسوس کیا کہ عبوری حکومت میں لیگ کی عدم شمولیت مسلم مفادات کے خلاف ثابت ہو رہی ہے لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ لیگ عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کر لے۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان موجود اختلافات کو حل کرنے کے لیے آخری کوشش کے طور پر برطانوی حکومت نے وائسرائے، نہرو، جناح، لیاقت اور سکھ رہنما بلدیو سنگھ کو ایک اجلاس میں شرکت کے لیے لندن بلایا، مگر اس کے باوجود کانگریس کے رویہ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ برطانوی حکومت نے ٦ دسمبر کو ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے کہا کہ گروپنگ کی شق کے بارے میں کانگریس کی توضیحات غلط ہیں۔بیان میں کانگریس کے رہنماؤں پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے موقف پر از سرِ نو غور کریں تا کہ مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں شرکت پر آمادہ ہو سکے۔

برطانوی حکومت کے ٦ دسمبر کے اعلامیہ پر کانگریس کا رویہ جناح کے لیے غیر اطمینان بخش تھا لیکن انہوں نے عجلت میں حتمی فیصلہ نہیں کیا۔انہوں نے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا ایک اجلاس جنوری ۱۹۴۷ء کے آخر میں طلب کیا اور کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ کانگریس نے اپنی قرارداد میں جو شرائط عائد کی ہیں یعنی صوبوں کو صوبائی

ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے نامنظوری کا حق اور مزید احمقانہ بات یہ کہ یہ حق صوبہ کے دیگر حصوں اور پنجاب کے سکھوں کو بھی دے دیا گیا تھا اور اس طرح کانگریس نے مکمل طور پر دسمبر کے اعلامیہ کا بطلان کر دیا ہے۔ اس لیے لیگ نے فیصلہ کیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کی کارروائی میں شرکت نہیں کرے گی۔ لہٰذا اس طرح ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے برطانیہ کی کوششیں بالآخر ناکام ہو گئیں۔

اس صورتِ حال کی سنگینی میں ایک اور وجہ سے بھی اضافہ ہوا۔ وہ یہ کہ عبوری حکومت، مخلوط یا قومی حکومت کی حیثیت سے کام کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ چنانچہ کانگریس نے وائسرائے کو یہ الٹی میٹم دے دیا کہ عبوری حکومت سے لیگ کے نمائندوں کو نکال دیا جائے۔ خود انگریز بھی اب اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ ہندوستان پر اپنی طرف سے کوئی فیصلہ مسلط کر دیتے۔ چنانچہ ہندوستان سے برطانیہ کی واپسی کے لیے ایک وقت کا تعین کر دیا گیا۔ لارڈ ویول کو اس بنا پر ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا کہ بعض مطالبات پورے نہ کرنے کی وجہ سے وہ کانگریس کا اعتماد کھو چکا تھا۔ لارڈ ویول کی جگہ دائی کاؤنٹ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا اور اسے انتقالِ اقتدار کی تفصیلات طے کرنے کے فرائض سونپے گئے۔

ماؤنٹ بیٹن اور پاکستان

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچنے کے بعد ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو حلف اٹھایا اور پھر فوراً ہی مختلف ہندوستانی لیڈروں سے طویل مذاکرات میں مصروف ہو گیا، جناح کے لیے وائسرائے سے ہونے والے یہ طویل مذاکرات تاریخ کے ایک سنگین اور فیصلہ کن دور میں جناح کو کرنا پڑے کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بذاتِ خود قیامِ پاکستان کا بدترین مخالف تھا اور اس مطالبہ کو کسی قیمت پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور وہ ایک آہنی دیوار بن کر قیامِ پاکستان کی راہ میں حائل تھا۔ ۳ جون کے پلان کے ذریعہ جو

عرفِ عام میں ماؤنٹ بیٹن پلان کے نام سے مشہور ہے۔ پاکستان حاصل کرنا بلاشبہ جناح کی ایک بہت بڑی اور عظیم الشان کامیابی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن پیپرز اور اس دور کی دیگر دستاویزات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت کلی طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم سے بچانے کے لیے ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی لیڈروں کے درمیان کتنا قریبی رابطہ اور تعاون تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ان مذاکرات میں ماؤنٹ بیٹن کو جناح سے ہزیمت اٹھانی پڑی تو اس نے جھلا کر انتقامی جذبے سے کام لیتے ہوئے یہ طے کرلیا کہ اگر حالات سے مجبور ہو کر اسے تقسیمِ ہند پر مجبور ہونا پڑا تو پھر وہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی راہ اختیار کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے نتیجہ میں ان صوبوں کے مسلمانوں پر سے جناح کا اثر ورسوخ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ پاکستان کو ایک ناقابلِ عمل اور لنگڑا لولا ملک بنانے پر تل گیا۔ تاہم ان بے پناہ مشکلات کے باوجود ان مذاکرات کے سلسلے میں یہ جناح کی دانشمندانہ صلاحیتوں کا کمال تھا اور سیاسی سودے بازی میں ان کی مہارت تھی کہ انہوں نے وائسرائے اور کانگریس کے لیڈروں کو ۳ جون کے پلان میں قیامِ پاکستان کا مطالبہ ماننے پر مجبور کر ہی دیا۔

مذاکرات میں جناح کی اس کامیابی میں، ان کی آزادی فکر، حق گوئی، بے باکی، دیانت، خلوص، آہنی عزم، مقصد سے گہرے لگاؤ، باطل کو قبول نہ کرنے اور حق سے دستبردار نہ ہونے کی صفات عالیہ کا بھی بڑا دخل تھا۔ اسلامیانِ ہند کے لیے جناح نے انفرادی طور پر جو انتھک جدوجہد کی تھی اور بالآخر ان کے لیے شدید رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود جس طرح ایک آزاد مملکت حاصل کی تھی اس کے عقیدت مندانہ اعتراف کے طور پر مسلم لیگ نے جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کیا حالانکہ اس معاملے میں بھی ماؤنٹ بیٹن مسلسل بلیک میل سے کام لے رہا تھا۔ وہ لیگ کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا لیکن لیگ اس سے مرعوب نہ ہوئی اور اس نے

ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد نہ کیا۔ البتہ کانگریس نے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن کو بھارت کا پہلا گورنر جنرل نامزد کر دیا۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانے کی سفارش کو سمجھنے کے لیے یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں مسلم عوام کے ساتھ جناح کے رشتے اتنی گہرائیوں اور استحکام کے ساتھ قائم ہو چکے تھے کہ شاید یہ کبھی کسی عوامی رہنما اور عوام کے درمیان قائم نہ ہوئے ہوں۔ ۱۹۴۷۔۴۸ء کے دوران وہ ایک عظیم مدبر اور ہیرو اور ایک آزاد مملکت کے بانی تھے۔ یہ تمام عظمتیں صرف ایک شخص کی ذات میں مجتمع ہو چکی تھیں۔ قومی تاریخ کے اس نصف النہار میں اپنے اسی کردار کی بدولت قوم کے ساتھ جناح کی وابستگی اتنی گہری ہو چکی تھی کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس نے قیامِ پاکستان کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

جب گورنر جنرل کی حیثیت سے جناح کے تقرر کا اعلان ہوا تو مسلمان حلقوں میں بے پایاں مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیاقت علی خان نے اس تقرر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کی قیادت میں ہم نے آزادی کی جدوجہد کی ہے یہ اس کا قدرتی حاصل ہے۔'' سردار عبدالرب نشتر نے جو صفِ اوّل کے لیگی رہنماؤں میں سے ایک تھے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''مسٹر جناح اس مملکت کے معمار ہیں اس کے اُمور کی نگرانی کے لیے ان سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں ہو سکتا۔'' بہر حال ماؤنٹ بیٹن پلان کے طے شدہ پروگرام کے تحت برطانوی حکومت کی جانب سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کو اقتدار منتقل کر دیا اور شاہ انگلستان کا جو اس وقت تک شہنشاہ ہندوستان بھی تھا پیغام پڑھ کر سنایا۔ قائداعظم نے جن کو تین دن قبل پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے اپنا صدر مقرر کیا تھا، ماؤنٹ بیٹن کی تقریر اور شاہ انگلستان کے پیغام کا جواب دیا۔ نوزائیدہ مملکت پاکستان کی آزادی کا نشان یعنی پرچم ستارہ و ہلال اسی دن قانون ساز

اسمبلی کی عمارت پر لہرایا گیا۔ دوسرے دن یعنی ۱۵ راگست کو قائداعظم نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا جس کے بعد پاکستان کی پہلی کابینہ نے بھی نواب زادہ لیاقت علی خان کی سربراہی میں حلف اٹھایا۔ اس طرح برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا وہ دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا جو اسلامیانِ ہند دو صدیوں سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔ اس خواب اور تصور کو حقیقت کے پیکر میں تراشنے کے لیے قائداعظم نے کوہکن کا کردار ادا کیا تھا۔

قائداعظم اور پاکستان

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ پاکستان انتشار وافراتفری کے عالم اور ابتر حالات میں قائم ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی شاید ہی کسی اور قوم نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز اس قدر محدود وسائل کے ساتھ ایسے سنگین حالات میں کیا ہو۔ ان حالات میں بھی پاکستان کا زندہ سلامت رہنا ایک معجزے سے کم نہ تھا اور یہ معجزہ صرف ایک فردِ واحد کے دستِ کرشمہ ساز کا نتیجہ تھا اور وہ شخص تھا قائداعظم محمد علی جناح۔ تاریخ کے اس انتہائی نازک مرحلہ پر پاکستان کو ان جیسے کرشمہ ساز شخص کی ہی ضرورت تھی اور اس شخص نے یہ ضرورت نہایت حسن وخوبی سے پوری کی۔ امر واقعہ یہی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح ہی یہ معجزہ نما کام کر سکتے تھے کیونکہ بقول لندن ٹائمز ''وہ ان لوگوں کے لیے، اس قوم کے لیے جو ان کی رہنمائی میں یہاں تک آئی تھی، قائداعظم سے بھی بڑھ کر، سربراہِ مملکت سے بھی زیادہ سربلند اور اس اسلامی مملکت کے، جس کی بنیاد خود انہوں نے رکھی تھی، معمار سے بھی کچھ زیادہ ہی حیثیت رکھتے تھے۔''

بلاشبہ یہ وہ دور تھا جب قائداعظم بہت تھک چکے تھے ان کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے موسم گرما سے ہی ان کی صحت جواب دے گئی تھی اور اب وہ ہڈیوں کا پنجر ہو کر رہ گئے تھے۔ اس علالت، اس کمزوری اور اس شدید تھکن کے

باوجود انہوں نے اس نئے ملک اور نئی مملکت کی زندگی کے پہلے انتہائی اہم اور نازک سال میں ذمہ داریوں کا بیشتر بھاری بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھا۔ انہوں نے نئی مملکت کی پالیسیاں وضع کیں، قوم کو درپیش مسائل کی واضح نشاندہی کی اور انہیں حل کرنے کے لیے انتھک کام کیا۔ انہوں نے آئین ساز اسمبلی، سرکاری ملازمین اور مسلح افواج کو نہ صرف ان کے فرائض سے آگاہ کیا بلکہ انہیں یہ بھی بتایا کہ قوم نے ان سے کیا توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

جناح نے اپنے مشن کی تکمیل پر کلی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ۱۴راگست ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام آخری پیغام میں کہا تھا کہ ''آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کی تعمیر کریں اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس کی تعمیر کریں۔'' قائداعظم کا سماجی فلسفہ اخوّت، مساوات، بھائی چارے اور عدل عمرانی کے انسان دوست اصولوں پر یقین محکم سے عبارت تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ براعظم ہندوستان میں انسانی حقوق سے محرومی کے خدشے اور خطرے نے ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو قیامِ پاکستان کے مطالبہ پر مجبور کیا تھا۔ اسی لیے وہ اس بات کے قائل تھے کہ پاکستان کی تعمیر عدل عمرانی کی ٹھوس بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ قائداعظم جمہوریت پر یقین رکھتے تھے لیکن وہ اس بات کے بھی سختی سے قائل تھے کہ پاکستان کے مستقبل کے آئین میں اسلام کے بنیادی اور لازمی عنصر کا اظہار ہونا چاہیے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ''اسلام اور اس کے تصورات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔'' انہوں نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ اسلام کے عظیم الشان اصولوں ہی کو پاکستان کا رہبر و رہنما ہونا چاہیے۔ وہ حقوق، مراعات اور فرائض میں مساوات، ہر ایک سے ہر

معاملے میں حق و انصاف سے کام لینے اور کسی تفریق کے بغیر سب لوگوں کے لیے مساوی شہریت کے قائل تھے یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر میں شاید ہی کسی اور رہنما کو اتنے شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہو جن الفاظ میں جناح کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تعریف ایسے لوگوں نے بھی کی ہے جو ان کے نظریات کے مخالف تھے۔ آغا خان کا کہنا ہے "میں جتنے لوگوں سے ملا ہوں وہ ان سب سے عظیم تھے۔" *Verdict on India* کے مصنف بیور لے نکلس نے انہیں ایشیا کا انتہائی اہم شخص قرار دیا ہے اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے جو ۱۹۴۸ء میں مغربی بنگال کے گورنر تھے، ان کے بارے میں کہا "وہ اس صدی کے سب سے ممتاز فرد تھے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں۔" قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی قائداعظم نے اپنے شانوں پر جو ذمہ داریاں لی تھیں ان کی تکمیل کرتے ہوئے وہ بالآخر موت کی گہری نیند سو گئے لیکن اس مختصر عرصے میں بقائے پاکستان کے لیے جتنا کام انہوں نے کیا کسی اور نے نہیں کیا۔ قائداعظم کا انتقال ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ آپ کی موت پر سابق وزیر ہند پیتھک لارنس نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ "گاندھی ایک قاتل کے ہاتھوں مارا گیا، لیکن جناح نے پاکستان سے گہری وابستگی اور لگاؤ کی راہ میں اپنی جان دی۔"

قائداعظم کی جائے پیدائش۔۔۔کراچی یا جھرک

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے یا 'جھرک' میں۔ یہ ایسا سوال ہے جس پر ایک عرصے سے گفتگو کی جارہی ہے مگر کوئی واضح ثبوت موجود نہ ہونے کی بنا پر قائداعظم کی حیات وخدمات پر تحقیق کرنے والے اسکالرز نے 'جھرک' میں پیدائش کے موقف کو مسترد کرتے ہوئے کراچی کو ہی قائداعظم کی جائے پیدائش قرار دیا ہے کیونکہ اس حوالے سے نہ صرف دستاویزی ثبوت موجود ہیں بلکہ خود قائداعظم محمد علی جناح نے بھی کراچی ہی کو اپنی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق یہ اختلاف اُس وقت سامنے آیا جب ڈائریکٹر آف ایجوکیشن، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ریجن، ویسٹ پاکستان، کراچی سے ۱۹۶۰ء میں طبع ہونے والی کتاب Sindhi Satun Kitab میں یہ بات درج کی گئی تھی کہ محمد علی جناح جھرک میں پیدا ہوئے تھے جو حیدرآباد سندھ سے ۱۱۴ رکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح پر ۱۹۸۴ء میں قائداعظم یونیورسٹی سے اپنے تحقیقی مقالے پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے والے پہلے پاکستانی اسکالر ڈاکٹر ریاض احمد نے بھی اپنے مقالے میں قائداعظم کی جائے پیدائش 'کراچی' کو ہی ظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض احمد کا یہ مقالہ بعدازاں کتابی صورت میں *Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah: The Formative Years*

1892-1920 کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، اسلام آباد سے شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر ریاض احمد سے ایک ملاقات میں جب اس سلسلے میں تفصیلات دریافت کیں تو انہوں نے بتایا کہ جون ۱۹۸۲ء میں وہ بذاتِ خود جھرک گئے تھے اور وہاں کے رہائشی متعدد افراد سے اس ضمن میں سوالات کیے تھے مگر کسی کے پاس نہ کوئی دستاویزی ثبوت موجود تھا اور نہ ہی کوئی واضح دلیل۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ بات محض قیاس ہے اِس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ راقم الحروف نے بھی پاکستان ٹیلی ویژن کی ڈرامہ سیریل 'جناح سے قائد' کے تحقیقی اسکرپٹ کے حوالے سے جون ۱۹۹۶ء میں جھرک کا دورہ کیا تھا اور وہاں آباد معمر افراد سے گفتگو کی تھی مگر کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے البتہ کچھ افراد زبانی کلامی اس بات پر مصر تھے کہ قائداعظم اس گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ افراد کسی ایسے مکان یا جگہ کی بھی نشاندہی نہ کر سکے جہاں قائداعظم کے والدین کی رہائش تھی۔ راقم الحروف نے اس حوالے سے پیر علی محمد راشدی، جی الانہ، مطلوب الحسن سید، سید ہاشم رضا، سید شریف الدین پیرزادہ، پروفیسر شریف المجاہد، رضوان احمد اور فضل حق قریشی سے بھی مختلف اوقات میں ملاقاتیں کیں اور مسئلہ زیرِ بحث پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔ یہ تمام افراد قائداعظم محمد علی جناح سے قربت، رفاقت اور تحقیق کے حوالے سے نہ صرف بڑی اہمیت رکھتے تھے بلکہ ان کا قائداعظم کی حیات و خدمات کے حوالے سے تحقیقی اور تصنیفی کام آج بھی بہت اہم ہے۔ ان تمام افراد کا بھی موقف یہی تھا کہ قائداعظم کراچی میں پیدا ہوئے جھرک میں نہیں۔ حیرت ہے کہ جو حلقہ قائداعظم کی جھرک میں پیدائش پر مصر رہا ہے اُس کی جانب سے اب تک کوئی ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی جس کو بلا عذر تسلیم کر لیا جائے۔ اس لیے یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی رہی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی میں جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں بھی ہمیشہ قائداعظم کی جائے پیدائش کراچی کو ہی ظاہر کیا گیا۔ اس سلسلہ میں سروجنی نائیڈو کی کتاب *Mohomed Ali Jinnah: An Ambassador of Unity* ۱۹۱۸ء میں مدراس سے شائع ہوئی۔ انگریزی میں یہ قائداعظم کے حوالے سے پہلی کتاب تھی اس میں بھی سروجنی نائیڈو نے قائداعظم کی جائے پیدائش کراچی درج کی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی حیات وخدمات پر V. Narayana Iyer کا پہلا تفصیلی مضمون 'Mahomed Ali Jinnah' *The Indian Review* کلکتہ کے جنوری ۱۹۲۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں بھی قائداعظم محمد علی جناح کی تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء اور جائے پیدائش کراچی درج کی گئی ہے۔ روزنامہ 'ڈکن ٹائمز' کے ایڈیٹر اے اے رؤف نے ۱۹۴۴ء میں قائداعظم کی ایک سوانح عمری *Meet Mr. Jinnah* کے عنوان سے تحریر کی۔ انہوں نے بھی کراچی ہی کو قائداعظم کی جائے پیدائش قرار دیا۔ اس کتاب میں اے اے رؤف نے قائداعظم کی دوسری شادی پر جہیز کے حوالے سے کچھ بے بنیاد تفصیلات درج کردی تھیں۔ جب یہ تفصیلات قائداعظم کے علم میں آئیں تو انہوں نے ۹ جون ۱۹۴۴ء کو مصنف کے نام ایک خط میں اس غلط بیانی کی نشاندہی کی جس کے جواب میں مصنف نے ۲ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں معذرت کی اور لکھا کہ میں دوسرے ایڈیشن میں اس غلط بیان کو نکال دوں گا۔ اس خط کے جواب میں ۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم نے اے اے رؤف کو ایک خط میں لکھا کہ ''یہ ایک مصنف کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی شخص کی زندگی سے متعلق حقائق کو اس وقت تک مشتہر نہ کرے جب تک اس کی تصدیق نہ کرلے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ افواہوں پر مبنی اطلاعات کو تحقیق کرکے کتاب میں سے حذف کریں۔
ایزنگیری، میسور کے ایک صاحب 'امتیازہ بی اے' نے *The Mind of Muslim*

India کے عنوان سے ایک کتاب لکھی اور اس کے چند نسخے ۱۵/نومبر ۱۹۴۵ء کو قائداعظم کو ارسال کرکے یہ درخواست کی کہ اس کتاب پر اپنی رائے ارسال کردیں۔ قائداعظم نے یہ کتاب ملنے کے بعد ۵ دسمبر ۱۹۴۵ء کو امتیازہ صاحب کے خط کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''آپ کی کتاب موصول ہوگئی ہے لیکن میں افسوس کے ساتھ یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ نے بھی وہی غلطی کی ہے جو مدراس کے ایک مصنف نے کی تھی اور لکھا تھا کہ میرے بیوی کو جہیز میں تیس لاکھ روپے ملے تھے۔ انہوں نے اس غلطی کو کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں درست کردیا تھا۔ آپ نے ایک اور غلط بیانی کی ہے کہ میری بیٹی نے ایک پارسی سے شادی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو کسی بھی شخص کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی بات بلاتصدیق درج نہیں کرنا چاہیے۔ آپ نے جس مقصد اور ارادے کے لیے محنت سے یہ مختصر کتابچہ تحریر کیا ہے میں اُس کی قدر کرتا ہوں کیونکہ اس کتابچہ سے یہ خواہش ظاہر ہوتی ہے کہ آپ مسلم لیگ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' قائداعظم کے اس خط سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ اپنے بارے میں کسی غلط اطلاع کو درگزر نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کا نوٹس لیتے اور اُس کی درستگی پر اصرار کرتے تھے۔ اے اے رؤف اور مسٹر امتیازہ سے قائداعظم کی خط و کتابت سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اگر قائداعظم کی جائے پیدائش کراچی نہ ہوتی تو وہ اُس پر بھی اعتراض کرتے۔

۲۵/اپریل ۱۹۴۶ء کو ہفت روزہ 'انجام' دہلی کے ایک منجم نے ایک خط میں قائداعظم سے اُن کی صحیح تاریخ پیدائش، وقت اور مقام دریافت کیا۔ اس خط کے جواب میں ۳۰/اپریل ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے منجم کو مطلع کیا کہ 'علی الصبح ۲۵/دسمبر ۱۸۷۶ء، مقام کراچی'۔ اے اے رؤف کی کتاب *Meet Mr. Jinnah* کی اشاعت کے فوراً بعد قائداعظم محمد علی جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید نے قائداعظم کی ہی خواہش پر ایک سوانح عمری لکھنے کا بیڑا اٹھایا تاکہ وہ قائداعظم کی

نگرانی میں ایک ایسی کتاب لکھیں جو اغلاط سے بھی پاک ہو اور جس میں قائداعظم کے کاغذات سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہو۔ اس کتاب Mohammad Ali Jinnah: A Political Study میں بھی جو ۱۹۴۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی کراچی کو قائداعظم کی جائے پیدائش ظاہر کیا گیا ہے۔ بعد کی دیگر تحقیقات میں بھی اس کتاب کے کثرت سے حوالے دیئے گئے ہیں۔ معروف صحافی زیڈ اے سُلیری نے بھی ۱۹۴۵ء میں قائداعظم کی سوانح میں ایک کتاب My Leader لکھی تھی جس میں انہوں نے بھی کراچی کو قائداعظم کی جائے پیدائش قرار دیا تھا۔ قائداعظم کی زندگی ہی میں اس کتاب کے یعنی اپریل ۱۹۴۵ء سے اگست ۱۹۴۶ء تک تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے فوراً بعد قائداعظم نے ۱۶ر مئی ۱۹۴۵ء کو زیڈ اے سُلیری کی کتاب My Leader ملنے کے بعد ایک خط میں کتاب کے مندرجات کی تعریف کی اور اُن کو مشورہ دیا کہ وہ کتاب کی پورے ملک میں تقسیم فروخت پر توجہ دیں۔

تحریکِ پاکستان کے دوران اور قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی میں یعنی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک اردو زبان میں بھی تقریباً ۲۱ کتابیں شائع ہوئیں اور ان تمام کتابوں میں قائداعظم کی جائے پیدائش کراچی کو ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہوئیں خصوصاً ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۷ء تک اردو میں تقریباً ۳۰ر اور انگریزی میں ۳۸ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس عرصہ میں محترمہ فاطمہ جناح بقیدِ حیات تھیں اور ہر مصنف اپنی کتاب اُن کو ضرور ارسال کرتا تھا۔ ان تمام کتابوں میں بھی قائداعظم کی جائے پیدائش کراچی کو ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ مگر کبھی اس حوالے سے محترمہ فاطمہ جناح معترض نہیں ہوئیں بلکہ خود انہوں نے قائداعظم کی ایک سوانح عمری My Brother کے عنوان سے لکھنے کا فیصلہ کیا تو اُس میں بھی انہوں نے قائداعظم کی جائے پیدائش کھارادر، کراچی کو ہی ظاہر

ہے۔ یہ کتاب جس کے تین ابواب محترمہ فاطمہ جناح لکھ پائی تھیں مسودہ کی صورت میں اُن کے کاغذات سے دستیاب ہوئی تھی۔ بعد میں پروفیسر شریف المجاہد نے اس کو قائداعظم اکادمی سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اگرچہ اپنی زندگی میں بار بار کراچی کو اپنی جائے پیدائش ظاہر کیا مگر کبھی انہوں نے اس عمارت کی نشاندہی نہیں کی جس میں وہ پیدا ہوئے تھے لہٰذا قائداعظم کی رحلت کے فوراً بعد یہ مسئلہ سامنے آیا کہ کھارادر میں وہ عمارت کہاں واقع ہے جس میں قائداعظم کی ولادت ہوئی تھی۔ اس ضمن میں پاکستان کی پہلی وزارت اطلاعات ونشریات کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر کرنل مجید ملک نے وزارت کے تحت نکلنے والے ماہنامہ 'ماہِ نو' کے عملہ ادارت میں شامل صحافی فضلِ حق قریشی کے ذمہ یہ کام کیا کہ وہ قائداعظم کے اُن رشتہ داروں کو تلاش کریں جو شروع سے اب تک کراچی میں مقیم ہیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ 'ماہِ نو' کا اکتوبر ۱۹۴۸ء کا شمارہ 'قائداعظم نمبر' کے طور پر شائع کرنے کا فیصلہ ہوا تھا جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی حیات وخدمات سے متعلق مضامین اوران کے خاندانی حالات شامل کرنا تھے۔ فضلِ حق قریشی نے یہ ذمہ داری نہ صرف قبول کرلی بلکہ وہ قائداعظم کے رشتہ داروں کی تلاش میں سرگرم ہوگئے اور بالآخر ان کو اپنی کوشش سے کامیابی حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی حاصل کردہ معلومات پر مبنی ایک مضمون 'قائداعظم کا گھرانا' لکھا جو 'ماہِ نو' کے مذکورہ نمبر میں اشاعت پذیر ہوا۔ تقریباً ۲۸ سال کے بعد جب قوم قائداعظم کا صد سالہ جشنِ ولادت منارہی تھی تو اس موقع پر فضلِ حق قریشی نے اپنے اسی مضمون میں کچھ اضافہ اور حاشیے لگا کر گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور کے میگزین 'اقراء' کے 'قائداعظم نمبر' کو ارسال کیا جو جون ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

راقم الحروف جب ۱۹۷۵ء میں قائداعظم کے حوالے سے ایک کتاب 'قائداعظم کے ۷۲ سال' کی تالیف میں مصروف تھا اُس وقت راقم الحروف نے فضل

حق قریشی سے ناظم آباد کے علاقہ میں واقع ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن میں ملاقات کی تھی جہاں وہ تصنیف و تالیف کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ اس وقت ان کی عمر چھیاسٹھ برس کے قریب تھی مگر چاق و چوبند تھے اور حافظہ بھی باکمال تھا۔ قائداعظم کے بارے میں وہ اس وقت انگریزی میں اپنی کتاب *Every Day with the Quaid-i-Azam* کی تدوین میں مصروف تھے لہٰذا وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ قائداعظم کے حوالے سے ہی گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنے مضمون 'قائداعظم کا گھرانا' کے حوالے سے اپنی ایسی یادداشتوں کا تذکرہ کیا جو مذکورہ مضمون میں درج نہیں کی جا سکی تھیں۔ ناظم آباد نمبر ۳ میں ہی ان کی رہائش تھی چنانچہ بعد میں یعنی ان کے انتقال ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۹ء تک مجھے متعدد بار ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ خصوصاً پاکستان ٹیلی ویژن کے سیریل 'جناح سے قائد' کی عکس بندی کے دوران ۱۹۹۶ء میں انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد ہم نے جب کراچی میں مقیم قائداعظم کے رشتہ داروں کی تلاش شروع کی تو ایک خاتون فاطمہ بائی تک رسائی حاصل ہوگئی جو کھارادر میں واقع ایک عمارت کھلنانی بلڈنگ میں اپنے تین بیٹوں اور دیگر اہلِ خانہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ فاطمہ بائی قائداعظم کے چچا وال جی پونجا کے بیٹے کانگ جی وال جی کی اہلیہ تھیں اور رشتہ میں قائداعظم کی بھاوج لگتی تھیں۔ فاطمہ بائی کی وال جی سے شادی ۱۸۸۵ء میں ہوئی تھی اور وہ رخصت ہوکر اس گھر میں آئی تھیں جس میں قائداعظم کے والد جناح پونجا کی رہائش تھی۔ اس اعتبار سے انہوں نے محمد علی جناح کو پہلی مرتبہ جب دیکھا تھا تو محمد علی جناح کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ انہی فاطمہ بائی نے نیونہم روڈ، کھارادر میں واقع اُس عمارت کی نشاندہی کی جس میں قائداعظم پیدا ہوئے تھے اور جو بعد میں 'وزیر مینشن' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ بقول فضل حق قریشی یہ عمارت تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ پرانی بنیادوں پر قائم تھی اور اس کی بالائی منزل میں قائداعظم کی ولادت ہوئی تھی۔ اکتوبر

۱۹۴۷ء تک اس عمارت کے مالک کراچی کے قدیم باشندے اور کپڑے کے تاجر گوردھن داس نوتن داس تھے جن سے یہ عمارت بمبئی پونا کے ایک اور تاجر وزیر علی نے جو رنگ و روغن کی تجارت کرتے تھے، ۲۵ ہزار روپے میں خرید کر اس کا نام 'وزیر مینشن' رکھا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اس عمارت کی نچلی منزل میں کپڑے کے آڑھتیوں کی دکانیں تھیں اور بالائی منزلوں میں وزیر علی کے اہلِ خانہ اور رشتہ دار رہتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں اس عمارت کو قائداعظم کی جائے ولادت ہونے کی بنا پر قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور یہاں ایک عوامی دارالمطالعہ اور میوزیم قائم کر دیا گیا۔ میوزیم میں قائداعظم سے متعلق یادگار اشیا اور نوادرات کو سجایا اور آویزاں کیا گیا ہے۔

فضلِ حق قریشی نے راقم الحروف کو یہ بھی بتایا کہ جب 'وزیر مینشن' نامی عمارت کا سراغ مل گیا تو پرنسپل انفارمیشن آفیسر کرنل مجید ملک نے انفارمیشن کے ہی ایک فوٹو گرافر میاں ظہور کو جو قیام پاکستان کے وقت دہلی سے opt کرکے پاکستان آئے تھے حکم دیا کہ وہ اس عمارت کی تصویر کھینچ کر دیں تاکہ اسے 'ماہ نو' کے قائداعظم نمبر میں شائع کیا جاسکے چنانچہ میں نے ایک مرتبہ پھر فاطمہ بائی سے رابطہ کیا اور ان کے بڑے صاحبزادے محمد علی کو جو اس وقت ساٹھ سال کے تھے اور تقریباً قائداعظم سے مشابہہ تھے اس عمارت کے سامنے قائداعظم کی شیروانی، شلوار، ٹوپی اور جوتے پہنا کر کھڑا کیا تاکہ تصویر میں حقیقت کا رنگ بھرا جاسکے۔ یہ تصویر جب 'ماہِ نو' کے قائداعظم نمبر میں شائع ہوئی تو بیشتر افراد کو گمان گزرا کہ شاید قائداعظم عمارت کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بھی ذکر کرتا چلوں راقم الحروف کے والد ہجرت کرکے فروری ۱۹۴۸ء میں جب کراچی آئے تو انہوں نے کھارادر ہی میں واقع ایک عمارت منگامل مولچند بلڈنگ میں قیام کیا تھا۔ جو نہ صرف کھلنانی بلڈنگ بلکہ وزیر مینشن سے بھی قریب تھی۔ میرے والد کی کھارادر میں رہائش ۱۹۵۸ء تک رہی بعد میں وہ ناظم آباد منتقل ہوگئے لہٰذا میں نے اپنے بچپن میں محمد علی اور ان کے بھائی حیدر علی کو متعدد بار

دیکھا جو واقعی قائداعظم سے مشابہہ تھے۔اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کھارادر میں قائداعظم کی جائے پیدائش کی دریافت کے وقت محترمہ فاطمہ جناح اس تمام صورتِ حال کی نگرانی کر رہی تھیں اور انہوں نے بھی قائداعظم کی جائے پیدائش کے طور پر مذکورہ عمارت کی تصدیق کی تھی۔ بقول فضلِ حق قریشی جس وقت اس عمارت کی نشاندہی کی گئی تو فاطمہ بائی اور ان کے خانوادے کے ساتھ محترمہ فاطمہ جناح بھی موقع پر موجود تھیں بعد میں کراچی کے پہلے ایڈمنسٹریٹر اور قائداعظم کے رفیق کار سید ہاشم رضا نے بھی فضلِ حق قریشی کے بیان کی تصدیق کی تھی اور راقم الحروف سے کہا تھا کہ وہ اس موقع پر خود بھی موجود تھے۔ سید ہاشم رضا نے اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب 'ہماری منزل' میں بھی کراچی کو قائداعظم کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کھارادر، کراچی میں واقع مذکورہ عمارت میں ہی پیدا ہوئے تھے کیونکہ گزشتہ ٧٢ سال کے دوران اس حوالے سے کوئی بھی ایسی مستند تحقیق منظرِ عام پر نہیں آئی جس میں دستاویزات کی روشنی میں 'جھرک' کو قائداعظم کی جائے پیدائش ظاہر کیا گیا ہو۔خود قائداعظم نے متعدد مواقع پر کراچی کو اپنی جائے پیدائش قرار دیا بلکہ انہوں نے ١٩٣١ء اور ١٩٤٦ء میں بننے والے اپنے پاسپورٹ میں بھی کراچی کو ہی جائے پیدائش لکھا ہے ایسی صورت میں کسی غیر مصدقہ اطلاع کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔قائداعظم محمد علی جناح کے رفقاء بھی اس بات پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ قائداعظم کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم کی سرکاری سوانح عمری *Jinnah: Creator of Pakistan* نیوزی لینڈ کے سوانح نگار، مورخ اور ناول نگار ہیکٹر بولیتھو سے لکھوائی گئی تھی جس کا پہلا ایڈیشن ١٩٥٤ء میں لندن سے شائع ہوا تھا۔اس میں بھی ہیکٹر بولیتھو نے محمد علی جناح کی رشتہ کی بھاوج فاطمہ بائی سے اپنی ملاقات

ظاہر کی ہے جو کھارادر کی ایک عمارت میں رہائش پذیر تھیں اور اُس وقت ان کی عمر تقریباً ۸۶ سال تھی۔ فاطمہ بائی کے صاحبزادے محمد علی کانگ جی بھی اس ملاقات میں موجود تھے اور انہوں نے بھی قائداعظم کا خاندانی احوال دستاویزات کی مدد سے ہیکٹر بولیتھو کو بتایا تھا۔ فاطمہ بائی کا کہنا تھا کہ محمد علی جناح نیونہم روڈ پر واقع اس عمارت میں پیدا ہوئے تھے جو اب 'وزیر مینشن' کہلاتی ہے۔

ہیکٹر بولیتھو کی کتاب کے بعد محمد علی جناح کی سوانح میں متعدد کتب شائع ہوئیں جن میں جی الانہ کی کتاب *Quaid-I-Azam Jinnah: The Story of a Nation*، ایم ایچ اصفہانی کی کتاب *Quaid-E-Azam Jinnah: As I Knew Him*، سید شمس الحسن کی کتاب *Plain Mr. Jinnah*، عزیز بیگ کی کتاب *Jinnah And His Times* اور اسٹینلے والپرٹ کی کتاب *Jinnah of Pakistan* قابل ذکر ہیں۔ ان تمام کتابوں کے مصنّفین کا بھی اس بات پر اجماع ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کراچی کے ایک محلے کھارادر کی ایک سڑک نیونہم روڈ پر واقع ایک عمارت میں پیدا ہوئے تھے اور یہ عمارت 'وزیر مینشن' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ میرے خیال میں کراچی کے حوالے سے اتنی واضح شہادتوں کے بعد یہ بحث کہ قائداعظم محمد علی جناح کراچی میں پیدا ہوئے تھے یا جھرک میں ختم ہو جانا چاہیے۔

قائداعظم محمد علی جناح اور کراچی

عروس البلاد کراچی کو اپنی دیگر خصوصیات کے علاوہ اس بنا پر بھی شہرت و مقبولیت حاصل ہے کہ اس شہر میں جنوبی ایشیا کی جدید تاریخ کے سب سے بڑے مدبر اور سیاستدان بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے اور اسی شہر کو آپ کی آخری آرام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ قائداعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے اور ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو آپ نے اسی شہر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس دوران بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے وسط سے لے کر پانچویں دہائی کے آخر تک تقریباً بیالیس سال آپ نے اسلامیان ہند اور بعدازاں پاکستان کے عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو قائداعظم نے کراچی میں بہت کم عرصہ قیام کیا مگر اس شہر سے آپ کا تعلق ہمیشہ مستحکم رہا۔ اسی تعلق کے حوالے سے آپ نے ۲۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میونسپل کارپوریشن کی جانب سے پیش کردہ سپاس نامے کے جواب میں فرمایا ”بلاشبہ میرے دل میں اس خوبصورت شہر کی اہمیت، محبت اور قدر ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ اس سے میرا پرانا تعلق ہے اور نہ اس لیے جیسا کہ آپ نے فرمایا یہ میری جائے پیدائش ہے بلکہ اس لیے کہ اب یہ شہر پہلی خود مختار اور آزاد مملکتِ پاکستان کی جائے پیدائش بن گیا ہے۔ اس وجہ سے نہ صرف یہ کہ تمام حریت پسند لوگوں کی نظر میں کراچی خصوصی اہمیت کی علامت بن جائے گا بلکہ تاریخ میں بھی وہ مقام پائے گا جس کی کوئی اور نظیر موجود نہیں۔“

اسی بے نظیر شہر میں بہت سے آثار و عمارات قائداعظم کی یادگار کے طور پر موجود ہیں۔ یہ آثار وعمارات اب ہماری قومی تاریخ اور ثقافت کا عظیم سرمایہ ہیں۔ ان آثار وعمارات سے جہاں ایک طرف قائداعظم محمد علی جناح کی یاد وابستہ ہے وہاں دوسری طرف یہ آثار وعمارات ہماری قومی جدوجہد کی داستان کا حصہ ہیں۔ یہ آثار و عمارات ہم کو اُن روز و شب کی یاددلاتے ہیں جب ہم نے برصغیر میں اپنے قومی تشخص کے تعین اور ایک علیحدہ وطن کے حصول کے لیے طویل جنگ لڑی اور اُس میں کامیاب وبامراد قرار پائے۔

کراچی میں قائداعظم کے حوالے سے یادگار عمارات میں پہلی عمارت 'وزیر مینشن' کہلاتی ہے۔ یہ کراچی کے ایک قدیم محلے کھارادر میں واقع ہے۔ اس عمارت کی جگہ وہ قدیم مکان موجود تھا جس میں ۱۸۷۶ء کو قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔ اس مکان میں رہتے ہوئے آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اسی مکان سے وہ ۱۸۹۳ء میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں جب قائداعظم لندن سے وطن واپس لوٹے تو آپ نے بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور بعد میں اُن کے والد بھی اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ اس مکان سے سکونت ترک کر کے بمبئی چلے گئے۔ یہ مکان آج ایک قومی یادگار کے طور پر باقی ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد اس میں ایک عوامی لائبریری اور ایک ایسی نمائش گاہ قائم کردی گئی ہے جس میں قائداعظم کے استعمال کی اشیاء و دیگر سامان محفوظ کردیا گیا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس عمارت میں قائداعظم نے تقریباً ۱۷ رسال قیام کیا۔

دوسری عمارت 'سندھ مدرستہ السلام' کی ہے جہاں سے ۴ جولائی ۱۸۸۷ء کو قائداعظم نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ یہ اسکول آج بھی قدیم کراچی کے قلب میں واقع ہے۔ اس اسکول میں قائداعظم نے ۳۰ جنوری ۱۸۹۲ء تک تعلیم پائی۔ اس اعتبار سے یہ واحد درسگاہ ہے جس سے ایک طویل عرصہ تک یعنی تقریباً ۵ سال ۵ ماہ اور ۲۱

دن قائداعظم وابستہ رہے۔ آپ نے ۳۰ جنوری ۱۸۹۲ء کوشادی کے لیے اس اسکول سے طویل رخصت لی اور پھر ۸ مارچ ۱۸۹۲ء کو کراچی ہی کے ایک اور اسکول 'چرچ مشن سوسائٹی ہائی اسکول' میں داخلہ لے لیا۔ 'چرچ مشن سوسائٹی ہائی اسکول' میں آپ نے ۳۱/اکتوبر ۱۸۹۲ء تک تعلیم پائی اور انگلستان روانگی کی بنا پر یہ اسکول چھوڑ دیا۔ قائداعظم کی اس اسکول سے وابستگی کی مدت تقریباً سات ماہ اور ۲۳ دن ہے لیکن بعد کے سالوں میں بھی آپ کی اپنی اس درسگاہ سے عقیدت و محبت ہمیشہ برقرار رہی۔

۱۸۹۶ء میں بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد سے تقریباً ۱۹۲۸ء تک قائداعظم کی کراچی آمد کے بارے میں کوئی ثقہ روایات موجود نہیں لیکن ایک روایت کے مطابق ۱۹۲۸ء میں آپ نے پیر صبغت اللہ شاہ پگارا کے مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں سکھر جاتے ہوئے کراچی میں مختصر قیام کیا تھا پھر دسمبر ۱۹۳۰ء میں آپ اسی مقدمہ کی پیروی کے لیے کراچی تشریف لائے۔ اس دوران آپ نے جوڈیشل کمشنرز کورٹ میں مقدمہ کی پیروی کی۔ بعدازاں محمد ایوب کھوڑو نے قائداعظم کے اعزاز میں کینٹ اسٹیشن کے قریب واقع 'کارلٹن ہوٹل' میں ایک عشائیہ دیا جس میں عمائدینِ شہر نے شرکت کی۔ یہ ہوٹل اب منہدم ہوگیا ہے۔ عشائیہ کے بعد قائداعظم کراچی کی بندرگاہ سے بذریعہ بحری جہاز لندن روانہ ہوگئے جہاں آپ کو گول میز کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد آپ نے لندن میں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ازسرِنو صدر منتخب کرلیا گیا چنانچہ آپ ہندوستان واپس آکر آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک بحوالہ تاریخ قائداعظم کراچی نہیں آئے۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں آپ سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس میں شرکت کے لیے بذریعہ ریل کراچی کینٹ اسٹیشن پر اترے۔ اس موقع پر آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اسٹیشن

کے مقابل ایک بہت بڑی آرائشی محراب بنائی گئی تھی جس کا نام 'باب الاسلام' رکھا گیا تھا۔ اس محراب سے کچھ فاصلے پر ہاتھ سے بنائی ہوئی قائداعظم کی ایک قدآدم تصویر آویزاں تھی۔ قائداعظم کو ایک جلوس کی شکل میں 'فریئر ہال' سے متصل سر عبداللہ ہارون کی رہائش گاہ 'سی فیلڈ' پہنچایا گیا جہاں آپ کو قیام کرنا تھا۔ قائداعظم نے ۸ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو 'آرٹلری میدان' میں جہاں اب مسجد خضرا اور سرکاری بیرکس موجود ہیں، سندھ صوبائی لیگ کانفرنس سے خطاب کیا۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کراچی سے اپنی دیرینہ وابستگی کا ذکر کیا اور فرمایا 'جب میں یہ کہتا ہوں کہ کراچی میری جائے پیدائش ہے تو آپ باآسانی کراچی کے بارے میں میرے جذبات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔'

قائداعظم ۱۹ر جون ۱۹۴۳ء کو کراچی پہنچے اور ۲۰ جون کو سندھ مسلم کالج کی افتتاحی تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ کالج کے فنڈ میں اپنی جانب سے دس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ 'سی فیلڈ' میں قیام کیا، ۲۲ دسمبر کو بذریعہ جہاز کراچی پہنچے، اس موقع پر اہلیانِ کراچی نے آپ کا شاندار جلوس نکالا۔ ایک روایت کے مطابق اس جلوس پر جو میکلوڈ روڈ (موجودہ آئی آئی چندریگر روڈ) سے گزرا تھا، وہاں جہاز سے گلاب کے پھول برسائے گئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کو آپ نے آرٹلری میدان میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اکتیسویں سالانہ اجلاس سے خطاب کیا۔ ۲۵ دسمبر کو آپ کی سالگرہ کے موقع پر کراچی میونسپل کارپوریشن کی جانب سے آپ کو شہری استقبالیہ دیا گیا۔ کراچی میں قیام کے دوران آپ نے ۲۸ دسمبر کو مسلم کانفرنس کشمیر کے سربراہ چوہدری غلام عباس اور سیکریٹری اے آر ساغر سے ملاقات کی اور کشمیر سے متعلق اُمور پر بات چیت کی۔ یہ ملاقات 'سی فیلڈ' میں ہوئی۔

۲۸ر اگست ۱۹۴۵ء کو طبیعت کی ناسازی کی بنا پر بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچے اور ملیر میں آرام کی غرض سے قیام کیا۔ کراچی میں ۱۳ر ستمبر تک قیام کے بعد آپ

کوئٹہ روانہ ہو گئے۔ اس دوران آپ سے سر غلام حسین ہدایت اللہ، جی ایم سید، جسٹس دین محمد اور خان بہادر مولا بخش سومرو نے ملاقاتیں کیں۔

قائداعظم ۲۰/ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بذریعہ ریل کوئٹہ سے کراچی کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۱/ اکتوبر کو کراچی پہنچے۔ کینٹ اسٹیشن پر نوابزادہ لیاقت علی خان، جی ایم سید، محمد ایوب کھوڑو، سر غلام حسین ہدایت اللہ نے استقبال کیا۔ ۲۲/ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو جونا مارکیٹ میں ینگ مین کھتری ایسوسی ایشن اور پنجابی مسلم ایسوسی ایشن کے استقبالیہ میں شرکت کی۔ ۲۵/ اکتوبر کو پرانا حاجی کیمپ کا دورہ کیا اور رات کو لیاری میں ایک جلسہ سے خطاب کیا۔ ۲۷/ اکتوبر کی شب بذریعہ ہوائی جہاز احمد آباد روانہ ہو گئے۔

۲۵ نومبر ۱۹۴۶ء کو بذریعہ ہوائی جہاز ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈہ پر اترے اور 'سی فیلڈ' میں قیام کیا۔ یکم دسمبر کو قائداعظم وزیراعظم برطانیہ سے ملاقات کے لیے ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈہ سے لندن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۱/ دسمبر کو برطانوی طیارے 'کارونیشن ایئر کرافٹ' سے کراچی واپس پہنچے اور میر بندے علی تالپور کے مکان میں قیام کیا۔ دورانِ سفر قائداعظم کی طبیعت چونکہ ناساز ہو گئی تھی اس لیے آپ فوری طور پر بمبئی روانہ نہ ہو سکے اور ۲۵ فروری تک کراچی میں ہی مقیم رہے۔ ۱۲/ جنوری کو سندھ مدرسۃ السلام کے استقبالیہ میں شرکت کی۔ ۲۰ جنوری کو ڈاکٹروں کے مشورہ پر آرام کی غرض سے ملیر چلے گئے۔ جہاں آپ حسب سابق نواب آف بہاولپور کی کوٹھی پر ٹھہرے۔ ۲۲ فروری کو آپ ملیر سے 'سی فیلڈ' منتقل ہو گئے اور ۲۵ فروری کو 'ایس ایس بمبورا' نامی بحری جہاز سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے مطابق قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم ۷/ اگست کو پالم ایئر پورٹ، دہلی سے کراچی کے لیے وائسرائے کے خصوصی طیارہ کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ پاکستان کے نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے جب آپ ماری پور کے ہوائی اڈے پر اترے تو ایک لاکھ سے زائد افراد نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ

ایئرپورٹ سے گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ جس پر مسلم لیگ کا پرچم لہرادیا گیا تھا۔ ۹ر اگست کو سندھ کے گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ نے قائداعظم کے اعزاز میں کراچی کلب سے متصل فریئر ہال میں ایک عشائیہ دیا۔ اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کراچی سے اپنے تعلق کا پرجوش انداز میں تذکرہ کیا۔

۱۰ر اور ۱۱ر اگست کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں فیصلہ کیا گیا کہ ۱۵ر اگست کے بعد تمام سرکاری کاغذات میں محمد علی جناح کے ساتھ 'قائداعظم' بھی استعمال کیا جائے۔ ۱۵ر اگست کو قائداعظم نے گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں گورنر جنرل کی حیثیت میں حلف اٹھایا۔ ۱۸ر اگست کو ایم اے جناح روڈ پر واقع عیدگاہ میدان میں نماز عیدالفطر ادا کی۔ ۲۵ر اگست کو ولیکا ٹیکسٹائل ملز کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ۱۱ر اکتوبر کو خالق دینا ہال میں سول، نیوی اور ایئر فورس کے افسروں سے خطاب کیا۔ ۱۴ر اور ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے آخری اجلاس سے خطاب کیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پولو گراؤنڈ میں منعقد ہونے والی اپنی ۷۱ویں سالگرہ کے موقع پر پریڈ کی تقریب سے خطاب کیا۔ ۲۷ دسمبر کو نارتھ ویسٹرن ریلوے انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں منعقدہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کی۔

۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو فسادات کے بعد شہر کا دورہ کیا۔ آپ برنس روڈ پر واقع ویمنز کالج اور مشن روڈ پر واقع کوتوال بلڈنگ اسکول گئے اور وہاں مقیم مہاجروں سے ملاقات کی۔ اسی روز آپ نے ایم اے جناح روڈ پر واقع سوامی نرائن مندر کا بھی دورہ کیا۔ ۲۳ جنوری کو 'ایچ ایم پی ایس، دلاور' کے قیام کی تقریب سے خطاب کیا۔ ۲ فروری کو ماری پور روڈ پر بنگال آئلز ملز کا افتتاح کیا۔ ۳ فروری کو کٹرک پارسی کالونی میں پارسی فرقہ کے ایک استقبالیہ میں شرکت کی۔ ۲۱ فروری کو ملیر کنٹونمنٹ میں فوجی افسروں سے خطاب کیا۔ ۲۲ر اپریل کو پولو گراؤنڈ (موجودہ باغِ قائداعظم) میں

پہلے اولمپکس گیمز کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی۔

یکم جولائی کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی عمارت کا افتتاح کیا۔ ۲ جولائی کو پیراڈائز سینما میں اپنے دورہ مشرقی پاکستان کی دستاویزی فلم دیکھی۔ پیراڈائز سینما سابقہ وکٹوریہ روڈ اور حالیہ سر عبداللہ ہارون روڈ کے وسط میں واقع تھا، اب وہاں ایک کاروباری پیراڈائز سینٹر قائم ہو چکا ہے۔

۷ جولائی کو قائداعظم خرابی صحت کی بنا پر زیارت روانہ ہو گئے۔ ۱۱ ستمبر کو سوا چار بجے شام آپ کو عالم غفلت میں بذریعہ طیارہ ماری پور ایئرپورٹ پر لایا گیا اور اسی دن گورنر جنرل ہاؤس میں رات کو یہ فخرِ قوم، بطلِ جلیل، اسلامیانِ پاکستان کا ناخدا، عزم واستقامت اور فراست و ذہانت کا پیکر ہمیشہ کے لیے اللہ کی رحمت میں پہنچ گیا۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو آپ کو ایم اے جناح روڈ پر واقع ایک ٹیلے پر سپردخاک کیا گیا جہاں آج اُن کا شاندار مقبرہ اُن کی عظیم شخصیت کی گواہی دیتا رہتا ہے۔

قائداعظم بحیثیت قانون داں

بیسویں صدی عیسوی میں قائداعظم محمد علی جناح جہاں ایک بے بدل سیاستدان کے طور پر معروف اور مقبول رہے وہاں بحیثیت وکیل بھی اُن کی شہرت اور عزت عام تھی۔ انہوں نے کراچی میں ابتدائی تعلیم کے بعد انگلینڈ جا کر لنکنز اِن میں ۵ جون ۱۸۹۳ء کو داخلہ لیا اور ۲۹ر اپریل ۱۸۹۶ء کو بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ لنکنز اِن میں تعلیم کے دوران اُن کے اساتذہ اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور یہ تصور کرتے تھے کہ وہ مستقبل میں ایک قابلِ ذکر بااعتماد وکیل کے طور پر نمایاں ہوں گے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے لنکنز اِن میں ایک استاد سر ہاورڈ الفنسٹن نے اپنے سرٹیفکیٹ میں لکھا کہ ''مسٹر ایم اے جناح نے ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء کے دوران میرے لیکچرز میں شرکت کی۔ اس دوران مجھے اُن کے نتائج دیکھنے کا موقع ملا اور میں ان نتائج کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک قابل شخصیت کے مالک ہیں اور جس کام کی جانب اپنی توجہ مبذول کریں گے اُسے بہتر طور پر انجام دیں گے۔'' ایک اور استاد بیرسٹر ڈبلیو ڈگلس ایڈورڈز نے لکھا کہ ''مسٹر جناح جب میرے زیر تعلیم تھے تو انہوں نے امتحانات میں نہایت جاں فشانی، ذود فہمی اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ اس بنا پر میں اُن کی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں ایک مثبت رائے قائم کرنے کی جانب راغب ہوا اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ وہ جس شعبۂ زندگی میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے اُن کو ممکنہ کامیابی حاصل ہو گی۔''

محمد علی جناح نے لندن میں تقریباً تین سال قیام کے دوران جہاں برٹش میوزیم لائبریری میں پابندی سے کتابوں کا مطالعہ کیا وہاں انہوں نے برطانیہ میں جاری مختلف سیاسی تحریکوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ انہوں نے عدالتوں میں وکلاء کو دلائل دیتے ہوئے بھی سنا تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں اس تجربہ سے استفادہ کر سکیں۔ محمد علی جناح ۱۸۹۶ء میں لندن سے کراچی واپس آئے۔ ابتداً اُن کے والد نے مشورہ دیا کہ وہ کراچی میں ہی وکالت کریں لیکن انہوں نے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا اور نہایت ناسازگار اقتصادی حالات میں بمبئی پہنچ گئے۔ ۱۸/اگست ۱۸۹۶ء کو انہوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں بحیثیت وکیل رجسٹریشن کی درخواست داخل کی اور ۲۴/اگست ۱۸۹۶ء کو اُن کا رجسٹریشن ہو گیا۔ ابتدائی طور پر اُن کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تین سال تک اُن کو کوئی قابلِ ذکر مقدمہ نہیں ملا لیکن اس عرصہ میں انہوں نے بمبئی میں قائم مقام ایڈوکیٹ جنرل مسٹر میکفرسن کے چیمبر میں موجود لائبریری سے استفادے کے لیے وہاں جانا شروع کر دیا۔ یہ لائبریری جناح کے لیے سرچشمہ علم ثابت ہوئی۔ کانگریسی رہنما مسز سروجنی نائیڈو، معروف قانون دان سر چمن لال سیتلواڈ اور سید شریف الدین پیرزادہ نے لکھا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہندوستانی کو میکفرسن جیسے وکیل کے چیمبر میں یہ سہولت میسر آئی۔ جناح نے جہاں میکفرسن کی لائبریری سے استفادہ کیا وہاں اُن کو میکفرسن کے اندازِ وکالت، طرزِ استدلال، زباں دانی اور عدالت کے آداب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جناح کی عملی تربیت یہاں سے ہی ہوئی۔ انہوں نے اپنی ذہانت اور تہذیبی رویہ سے میکفرسن سے اس قدر قربت حاصل کر لی تھی کہ میکفرسن اپنے مقدمات کے حوالے سے جناح سے مشورہ بھی کرنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ تقریباً تین سال تک محمد علی جناح نے بمبئی ہائی کورٹ میں سینکڑوں مقدمات کی کارروائی دیکھی۔ نامور وکلاء کو جرح کرتے اور دلائل دیتے سنا۔ عدالتی اہل کاروں کی نفسیات کو سمجھنے کا موقع ملا اور اُن کے تجربے اور مشاہدے میں اضافہ

ہوا۔

اپریل ۱۹۰۰ء میں بمبئی کے تھرڈ پریزیڈنسی مجسٹریٹ پی ایچ دستور کے رخصت پر چلے جانے کی بنا پر عارضی طور پر پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی جب ایک آسامی تین ماہ کے لیے خالی ہوئی تو مسٹر میکفرسن کے مشورہ پر اس آسامی کے لیے محمد علی جناح نے لاء ممبر سر چارلس اولیونٹ سے ملاقات کی تا کہ اس نوکری کے حصول سے وہ اپنی مالی مشکلات پر قابو پا سکیں۔ سر چارلس نے پہلی ہی ملاقات میں کہا کہ میں نے تمہارے بارے میں سن رکھا ہے اور مجھے اس آسامی پر تمہارا تقرر کر کے خوشی ہوگی مگر مسٹر میکفرسن کا ایک تعارفی خط مجھے درکار ہوگا کیونکہ وہ تم کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔ خط موصول ہونے کے بعد مسٹر چارلس نے یکم مئی ۱۹۰۰ء سے اس خالی آسامی پر محمد علی جناح کا تقرر کر دیا۔ ۱۰رمئی ۱۹۰۰ء کو اس تقرر کی خبر مع مبارکباد اور تعارف کے کراچی کے روزنامہ 'سندھ گزٹ' میں شائع ہوئی جبکہ بحیثیت تھرڈ پریزیڈنسی مجسٹریٹ محمد علی جناح نے یکم مئی ۱۹۰۰ء کو ہی چوری کے ایک مقدمے کی سماعت کی۔ جیسا کہ ڈاکٹر ریاض احمد کی کتاب *Quaid-I-Azam As Magistrate* (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) سے ظاہر ہے۔

تھرڈ پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے محمد علی جناح نے نہایت عمدگی سے تین ماہ خدمات انجام دیں اور اُن کی شہرت عدالتی حلقوں میں عام ہوگئی۔ تین ماہ کی مدت مکمل ہونے کے بعد جب پی ایچ دستور رخصت سے واپس آئے تو چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی آسامی پر اُن کا تقرر ہو گیا لہٰذا محمد علی جناح کی مدت میں مزید تین ماہ کی توسیع کر دی گئی۔ اس طرح محمد علی جناح نے چھ ماہ تک بحیثیت مجسٹریٹ خدمات انجام دیں۔ اس عرصہ میں انہوں نے تقریباً ۷۳ مقدمات سماعت کئے اور فیصلہ سنایا۔ ان میں زیادہ تر مقدمات چوری، جیب تراشی کے واقعات، شراب نوشی بدعہدی، صحت عامہ کی خلاف ورزی، کاروباری تنازعات، اسمگلنگ، لاپرواہی وغیر

کے تھے۔ انہوں نے پہلا مقدمہ چوری کا سماعت کیا۔ ویسے تو تمام مقدمات کی کارروائی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی جناح نے مقدمات کی سماعت کے دوران قانون کا پاس ولحاظ رکھا اور انصاف کی بالادستی کے لیے کسی دباؤ کو خاطر میں نہیں لائے جیسا کہ ۲۹ جولائی ۱۹۰۰ء کو ان کی عدالت میں پیش ہونے والے ایک مقدمے کی کارروائی اور فیصلے سے ظاہر ہے۔ اس دور میں جب برطانوی سامراج کو ہندوستان میں اپنے پنجے گاڑھے ہوئے تقریباً نصف صدی گزر چکی تھی اور برطانوی حکمران تو اپنی جگہ، ہندوستان آنے والا ایک عام انگریز بھی ہندوستانیوں کو اپنا غلام تصور کرتا تھا ایک انگریز سیاح نے جو بمبئی کے 'پرنس ڈاک' کے علاقے کے قریب ایک گھوڑا گاڑی سے اترا تھا پہلے تو اُس نے گھوڑا گاڑی والے کو معاوضہ دینے سے انکار کیا اور پھر اُسے زدوکوب کرنے کی دھمکی دی۔ جب گاڑی بان وہاں سے بھاگ گیا تو یہ سیاح وہاں پر موجود ایک پولیس سپاہی کے پاس گیا اور اس سے سلوٹ مارنے کو کہا۔ سپاہی نے جب ایسا کرنے سے منع کر دیا تو انگریز سیاح نے اُسے زدوکوب کیا۔ پولیس رپورٹ ہونے پر جب یہ مقدمہ محمد علی جناح کی عدالت میں پہنچا تو ملزم نے اپنے دفاع میں یہ موقف اختیار کیا کہ 'وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ تھا اور سب ہنسی مذاق کر رہے تھے جس کی بنا پر بندرگاہ کے دروازے پر یہ واقعہ پیش آیا۔ اس نے کہا کہ میں پہلی مرتبہ بمبئی آیا ہوں اور یہ پہلا جرم ہے اور یہ بھی ناگہانی میں سرزد ہوا ہے لہٰذا میں اپنے روّیہ کی معافی طلب کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گا۔' ملزم کے اعترافی بیان پر بحیثیت مجسٹریٹ محمد علی جناح نے کہا کہ 'ہر شخص غلط کام کرنے کے بعد معافی طلب کرتا ہے۔' ملزم نے جواباً کہا کہ 'میں عہد کرتا ہوں کہ آئندہ میں ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ نہ صرف میں اس صورتحال سے پریشان ہوا ہوں بلکہ میری ملازمت بھی متاثر ہوئی ہے۔' محمد علی جناح نے مقدمے کو نمٹاتے ہوئے اپنے ریمارکس میں لکھا کہ پولیس کے سپاہی کو سلوٹ کرنے کا حکم دینے اور ایسا

تخفیف کرتے ہوئے اُس پر پندرہ روپے جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔' اس فیصلے کو 'بمبئی گزٹ' کے علاوہ مقامی اخبارات نے شہہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔

یہ مقدمہ غیر معمولی نوعیت کا تھا کیونکہ کسی انگریز کو سزا دینا اُس زمانے میں بہت حوصلے و ہمت کا اقدام تھا۔ اس مقدمہ کے فیصلے سے محمد علی جناح کے سامراج دشمن روّیہ، شہریوں کے حقوق کی پاسداری، حریت پسندانہ مزاج اور ایک بے خوف و انصاف پسند قانون دان کی حیثیت سے اُن کی شخصیت کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ محمد علی جناح کا بطور وکیل چوبیس برس کی عمر میں جو مزاج ساخت ہو گیا تھا وہ ان کی آخری سانس تک برقرار رہا۔

مجسٹریٹ کی آسامی پر چھ ماہ خدمات انجام دینے کے دوران محمد علی جناح نے متعدد ایسے مقدمات جو مشکوک یا مجسٹریٹ کے دائرۂ کار سے باہر تھے ہائی کورٹ کے رجسٹرار کو غور کرنے کے لیے ارسال کیے جس پر ہائی کورٹ نے اُن کے موقف کو اصولی قرار دیا۔ بمبئی پریزیڈنسی کے قائم مقام مجسٹریٹ کی حیثیت سے خدمات کی انجام دہی کے دوران محمد علی جناح کو بظاہر کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن چند افراد جن میں کچھ وکلاء بھی شامل تھے اُن کے اس عہدے پر تقرر کو ناپسند کرتے تھے۔ شاید اس کا ایک سبب جناح کا مسلمان ہونا اور دوسرا سبب دیگر سینئر وکلاء کی موجودگی میں اُن کا بہت جلد اس عہدے پر تقرر بھی تھا۔ ان وکلاء کو عدالتی تقاضوں کے مطابق جناح کی عدالت میں پیشی کے وقت اُن تمام آداب کی پابندی کرنا پڑتی تھی جو ایک مجسٹریٹ کے احترام کے لیے لازمی تھے چنانچہ ان وکلا نے درپردہ جناح کے ساتھ مخاصمانہ رویہ اختیار کر لیا۔ یہ مخاصمت اس درجہ بڑھ گئی کہ ایک وکیل نے عدالت میں جناح کے ساتھ تلخ کلامی کی اور Scandalous کا لفظ استعمال کیا۔ محمد علی جناح نے اس صورتحال کا سخت نوٹس لیا۔ وہ چونکہ ایک قانونی آدمی تھے اس لیے انہوں نے قانون کو ہاتھ میں لینے کے بجائے پہلے بمبئی کے چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ مسٹر سینڈرسلاٹر سے

شکایت کی اور بعد میں بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس بدرالدین طیب جی سے ایک خط میں اس صورتحال کی وضاحت کی۔ محمد علی جناح کا یہ خط آٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس خط میں انہوں نے حفظِ ماتقدم میں متعلقہ وکیل کا پورا نام درج نہیں کیا صرف 'مسٹر ٹی' لکھا ہے تاکہ وکیل کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ قائم نہ ہو سکے۔ اس خط میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ اس عہدے پر مستقل ہونے کی خواہش نہیں رکھتے جیسا کہ نومبر ۱۹۰۰ء میں جب ممبر لاء سر چارلس اولیونٹ نے محمد علی جناح کو اُن کی قانونی ذکاوت و مہارت اور بے باکی کے پیش نظر بحیثیت مجسٹریٹ مستقل نوکری کی پیشکش کی اور کہا کہ اس طرح وہ ہر ماہ پندرہ سو روپے تنخواہ حاصل کر سکیں گے لیکن محمد علی جناح نے جن کی طبیعت محکمہ جاتی پابندیوں کی عادی نہ تھی اور نہ ہی وہ ملازمت کو پسند کرتے تھے سر چارلس اولیونٹ کی پیشکش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اب وہ ہر روز پندرہ سو روپے کمانے کے لیے وکالت کریں گے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیت وکیل محمد علی جناح کی عدالتی اور سیاسی کامیابیوں کا چرچا عام ہونے کے بعد موکلین کا رجوع اُن کی طرف بہت بڑھ گیا تھا لیکن وہ اپنی سیاسی مصروفیات کی بنا پر محدود اور منتخب مقدمات اپنے ہاتھ میں لیتے تھے اور اُن کی وکالت کی فیس بھی دو تین عشروں میں پندرہ سو روپے روزانہ ہو گئی تھی جیسا کہ اگست ۱۹۳۶ء میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں اُن کی خط و کتابت سے ظاہر ہے۔
یہ مقدمہ ریاست بھوپال کے جنرل عبدالقیوم خان کی صاحبزادی انور جہاں بیگم اور ریاست ٹونک کے نواب سعادت علی خان کے بھائی صاحبزادہ اسماعیل علی خان کے درمیان ازدواجی نوعیت کا تھا۔ اس مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں ریاست ٹونک کے قانونی مشیر سید حامد حسین کی قائداعظم سے خط و کتابت سے ظاہر ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح اس وقت پندرہ سو روپے یومیہ فیس لیا کرتے تھے۔ گویا سر چارلس اولیونٹ سے نومبر ۱۹۰۰ء میں محمد علی جناح نے اپنی فیس کے حوالے سے جس اعتماد کا اظہار کیا تھا

وہ پورا ہو گیا تھا۔

نومبر ۱۹۰۰ء میں محمد علی جناح نے بمبئی کے وسط میں واقع وکٹورین عہد کی ایک لق و دق عمارت میں ذاتی آفس حاصل کر لیا تھا تا کہ باقاعدہ وکالت کا آغاز کر سکیں۔ انہوں نے اس آفس میں عمدہ فرنیچر ڈالا تھا جس کی بنا پر اُن کا آفس دیگر وکلاء کے مقابلے میں زیادہ پر وقار دکھائی دیتا تھا۔ اس آفس میں وہ ایک پر اعتماد اور لائق قانون داں کی حیثیت سے بیٹھنے لگے اور اُن کے موکلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

وکالت کے باقاعدہ آغاز پر وہ کچھ عرصہ معاون وکیل کے طور پر بھی پیش ہوتے رہے۔ پھر اُن کو 'مہتہ گروپ آف لائرز' کے مقدمات میں پیش ہونے کا موقع ملا جس کی بنا پر اُن کی غیر معمولی معاملہ فہمی اور قانونی لیاقت کا شہرہ بمبئی کے عدالتی حلقوں میں عام ہونے لگا۔ اس عرصہ میں انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ وکلاء جن میں سر فیروز شاہ مہتا، ایس پی سنہا، سر سریندر ناتھ بینرجی، گوپال کرشنا گوکھلے، سر چمن لال سیتلواڈ اور دیگر معروف وکلاء سے اُن کا تعلق استوار ہو چکا تھا۔ محمد علی جناح کی ایک سب سے بڑی خوبی جہاں قاعدے اور قوانین کی پابندی تھی وہاں وہ معاوضہ کے لالچی نہیں تھے۔ انہوں نے مختلف قسم کے مقدمات کے سلسلہ میں اپنا جو معاوضہ مقرر کر رکھا تھا اُس سے وہ نہ ایک پیسہ کم اور نہ ایک پیسہ زیادہ لیتے تھے لیکن جہاں انسانی ہمدردی کا سوال آتا وہ سراپا عنایت ہو جاتے۔ ایک مرتبہ ایک موکل نے مقدمہ کی کامیابی کے بعد اُن کو کچھ رقم بطور انعام دینا چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ میں اپنا معاوضہ لے چکا ہوں اب کوئی اضافی رقم لینے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جو کھم اولوا نے اپنی کتاب *Leaders of India* میں محمد علی جناح کی عدالتی زندگی کے حوالے سے کئی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ایسے واقعات جن سے اُن کے کردار کی بلندی اور ارادے کی استقامت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہیکٹر بولیتھو نے اپنی کتاب *Jinnah: Creator of Pakistan* میں ایک باب 'نوجوان جناح عدالت

میں، کے عنوان سے شامل کیا ہے جس میں بولیتھو نے بھی بحیثیت وکیل جناح کی عدالتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

بولیتھو نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں عدالت میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جہاں عدالتی حلقوں میں ایک نئی مثال قائم کی وہاں محمد علی جناح کی بے باکی، جرأت اور اصول پسندی کو عام کیا۔ ہوا یوں کہ بمبئی میونسپل کارپوریشن کے صدر جیمز میکڈانلڈ ایک مقدمہ کی کارروائی سننے کے لیے ہائی کورٹ آئے اور وکلاء کے لیے مخصوص کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد بحیثیت وکیل محمد علی جناح کمرۂ عدالت میں آئے تو اُن کے بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ انہوں نے جیمز میکڈانلڈ سے وکلاء کی کرسی خالی کرنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ محمد علی جناح نے عدالت کے منشی سے کہا کہ وہ کرسی خالی کروائے ورنہ میں جج سے شکایت کرتا ہوں۔ منشی نے جب میکڈانلڈ سے یہ بات کہی تو اُس نے کرسی خالی کر دی۔ میکڈانلڈ اس صورت حال پر قطعی ناراض نہ ہوا بلکہ اُس نے عدالت کے منشی سے محمد علی جناح کا نام دریافت کیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کو ایک ہزار روپے معاوضہ پر بمبئی میونسپل کارپوریشن کا قانونی مشیر مقرر کر دیا۔

۱۹۰۳ء میں ہی لاء ممبر سر چارلس اولیونٹ لندن میں دو سال قیام کے بعد جب بمبئی واپس آئے تو اُن کے اعزاز میں اورینٹ کلب بمبئی میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ اس ضیافت میں محمد علی جناح بھی شریک تھے۔ سر چارلس نے جب جناح کو دیکھا تو قریب آ کر اُن سے دریافت کیا کہ اُن کی وکالت کیسی چل رہی ہے۔ جواباً محمد علی جناح نے کہا کہ وہ اس وقت دو ہزار روپے ماہانہ پا رہے ہیں۔ اس پر چارلس اولیونٹ نے اُن کو مبارکباد دی اور کہا کہ آپ نے میری پیشکش کو مسترد کر کے بہت اچھا کیا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ محمد علی جناح نے بعد میں اپنے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید سے کیا جسے انہوں نے ۱۹۴۵ء میں جناح کی سوانح عمری

Mohammad Ali Jinnah: A Political Study میں درج کیا ہے۔
یہ وہ دور تھا کہ جب جناح کی بحیثیت وکیل شہرت خوشبو کی طرح پھیل رہی تھی اور ہر طبقہ خیال میں اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اُن کی مقدمات کی پیروی کے سلسلہ میں انتھک محنت، ذہانت، متاثر کن طریقہ کار، لباس و رویہ میں نفاست، شرافت اور دیانت، قوتِ فیصلہ اور قانون کے وسیع مطالعے کا عدالتی حلقوں میں چرچا عام تھا۔ مقدمات فوجداری کے ہوں یا دیوانی نوعیت کے ہوں، ابتدائی عدالت ہو یا ہائی کورٹ، ہر جگہ اُن کی قابلیت اور ذہانت ایک جیسی تھی۔ وہ بغیر کسی مرعوبیت کے ہر مقدمے کی پیروی کرتے اور دورانِ بحث اُن کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور جملوں کی ساخت ایسی ہوتی تھی کہ وہ عدالت پر حاوی آ جاتے۔ معمولی معمولی استدلال سے مجسٹریٹ یا جج کو مقدمات کا فیصلہ اپنے موکل کے حق میں کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بلا وجہ مقدمات اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ پہلے وہ مقدمے کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیتے اور جب اُن کو یقین ہو جاتا کہ وہ ایک جائز شکایت یا درخواست کی وکالت کر رہے ہیں تب ہی وہ موکل سے مقدمہ کی پیروی کرنے کا وعدہ کیا کرتے تھے۔

۱۹۰۴ء میں محمد علی جناح کی رسائی اور شناسائی انڈین نیشنل کانگریس کے سینئر رہنماؤں کے ساتھ ہو چکی تھی۔ وہ عملی سیاست سے اگرچہ بہت دور تھے لیکن قومی مسائل کا ایک نکتہ رس سیاستدان کی طرح جائزہ لے رہے تھے۔ وہ تمام اخبارات پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے اور خبروں، بیانات اور مضامین سے نتائج اخذ کرتے رہتے تھے۔ سید شریف الدین پیرزادہ نے لکھا ہے کہ محمد علی جناح نے کچھ عرصہ تک سر جارج لانڈس کے چیمبر میں بھی مطالعہ کیا۔ سر جارج لانڈس بعد میں وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل میں لاء ممبر (وزیر قانون) مقرر ہوا۔ وہ نہایت صاف و شفاف ذہن رکھتا تھا۔ اُس کی وکالت کا انداز بہت پرقوت اور متاثر کن ہوا کرتا تھا۔ اُس نے ایک

دن جناح سے کانگریسی رہنما بال گنگا دھر تلک کی اخبارات میں شائع ہونے والی حکومت کے خلاف ایک تقریر کے خلاف اپنے ایک مختصر بیان کے بارے میں رائے دریافت کی۔ جناح نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ 'میں نے آپ کا وہ بیان نہ پڑھا اور نہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں حکومت کے اس فیصلے پر کہ وہ تلک جیسے ایک عظیم محبِ وطن رہنما پر مقدمہ قائم کر رہی ہے خود کو تنقید کے لیے آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔' مسٹر لانڈس نے اپنے ایک جونیئر نوجوان وکیل کی صاف گوئی اور برہمی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ ہندو رہنما بال گنگا دھر تلک ایک متشدد قوم پرست رہنما تھے۔ وہ اپنی تقاریر اور مضامین میں برطانوی سامراج اور مسلمانوں کے خلاف نہ صرف شدید زبان استعمال کرتے تھے بلکہ یہ الزام بھی لگاتے تھے انگریزوں اور مسلمانوں نے ہندوؤں کا استحصال کیا ہے۔ تلک کے اس رویہ کا حکومت نے سخت نوٹس لیا اور اُن کے خلاف جون ۱۹۰۸ء میں بغاوت کا مقدمہ قائم کر کے اُن کو گرفتار کر لیا۔ بقول جناح کے سوانح نگار اسٹینلے والپرٹ کے اس مرحلہ پر تلک نے ضمانت کے لیے جناح کی خدمات حاصل کیں اور وہ یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو بمبئی ہائی کورٹ میں جسٹس داور کے سامنے ضمانت کے لیے پیش ہوئے اور عدالت سے درخواست کی کہ تلک کی عبوری ضمانت منظور کی جائے۔ جناح نے دلیری سے دلائل بھی دیے لیکن اسٹینلے والپرٹ کے بقول تلک کے مقدمہ کی ساعت سے قبل ہی برطانوی حکومت نے اپنا ذہن بنا لیا تھا اس لیے جناح کے دلائل بہری سماعتوں میں دفن ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود جناح نے استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے برطانوی انصاف کو للکارا لیکن اُن کی تمام کوششوں کے باوجود جسٹس داور نے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے بھی اپنی کتاب *The Works of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah* کے والیوم I میں تلک کی

درخواستِ ضمانت پر عدالتی کارروائی کو تفصیل سے درج کیا ہے۔

سید شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب *Some Aspects of Quaid-I-Azam's Life* میں ایک باب Jinnah as a Lawyer میں جہاں قائداعظم کی بحیثیت وکیل کامیابیوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ جب جسٹس داور نے تلک کو بغاوت کے الزام میں چھ سال قید بامشقت کی سزا سنادی تو حکومت نے جسٹس داور کو 'سر' کے خطاب سے نواز دیا۔ اس سرفرازی کے نتیجے میں بار ایسوسی ایشن آف ہائی کورٹ بمبئی نے جسٹس داور کے لیے ایک تہنیتی عشائیہ کا اہتمام کیا اور ایک گشتی مراسلہ جاری کر کے وکلاء سے کہا کہ جو اس عشائیہ میں شرکت کا خواہشمند ہے اس مراسلہ پر دستخط کر دے۔ جب یہ مراسلہ محمد علی جناح کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس پر سخت تنقیدی نوٹ لکھا۔ نوٹ میں انہوں نے کہا کہ 'بار ایسوسی ایشن کو شرم آنا چاہیے کہ وہ ایک ایسے جج کو عشائیہ دینا چاہتی ہے جس نے حکومت کے ایما پر ایک عظیم محب وطن کو ظالمانہ سزا سنا کر جیل بھیجا اور اپنی وفاداری کے عوض 'سر' کا خطاب حاصل کیا ہے'۔ جب اس نوٹ کا جسٹس داور کو علم ہوا تو اُس نے جناح کو اپنے چیمبر میں بلا کر پوچھا کہ 'میں نے آپ کے ساتھ عدالت میں کیسا رویہ رکھا ہے' جناح نے جواباً کہا کہ آپ نے ہمیشہ بہتر رویہ رکھا ہے۔ اس جواب پر جسٹس داور نے جناح سے دریافت کیا کہ 'پھر آپ نے میرے خلاف اس نوعیت کا نوٹ کیوں لکھا ہے۔' جناح نے کہا کہ 'میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ نوٹ درست لکھا ہے کیونکہ جس طرح سے آپ نے تلک کے کیس میں یکطرفہ فیصلہ کیا ہے اُس سے میرے جذبات کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔' جناح کا ایک جسٹس کے سامنے اس طرح کا بیان جہاں جناح کے قوم پرستانہ رجحان کی عکاسی کرتا تھا وہاں ایک نوجوان وکیل کی جرأت، صاف گوئی اور اصولی نکتۂ نظر کا بھی مظہر تھا۔

۱۹۱۶ء میں بھی جب تلک پر بغاوت کا ایک اور مقدمہ قائم کیا گیا تو محمد علی جناح

اگست ۱۹۱۶ء میں اس مقدمے کی پیروی کے لیے ڈسٹرکٹ کورٹ پونا میں پیش ہوئے اور دلائل دیتے ہوئے کہا کہ تلک کی جن تقاریر کو باغیانہ تصور کیا جارہا ہے وہ باغیانہ نہیں۔ تلک نے عوام سے 'سوراج' کی حمایت کرنے کو کہا ہے۔ سوراج کوئی برالفظ نہیں ہے اور نہ اس سے گورنمنٹ کی مخالفت مقصود ہے۔ 'سوراج' کے معنی جیسا کہ بار بار بیان کیا گیا ہے یہ ہیں کہ ہندوستان کے معاملات کو ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ برطانوی عمال ہندوستان کی حکومت کو چھوڑ کر ہندوستان سے چلے جائیں۔ دلائل کے اختتام پر محمد علی جناح نے کہا کہ تمام بحث سے میرے موکل پر کوئی مقدمہ ثابت نہیں ہوا لہٰذا ضمانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جناح کے دلائل کے بعد تلک کے خلاف مقدمہ خارج کردیا گیا۔ یہ جناح کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ جس کو پورے ہندوستان میں بہ نظرِ استحسان دیکھا گیا۔

محمد علی جناح کو بے اصولی سے سخت نفرت تھی۔ وہ انسانی احساسات اور قدروں کا احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی بعد کی زندگی میں بھی اپنے مخالفین سے کبھی زیادتی نہیں کی اور ہر شخص کا مسکرا کر استقبال کیا۔ دورانِ وکالت ایک مرتبہ اُن کو ایک انگریز بیرسٹر Strangeman کے چیمبر میں کسی کام سے جانا پڑا۔ انگریز چونکہ بحیثیت حکمراں ہر ہندوستانی کو غلام سمجھتے تھے اس لیے Strangeman نے جناح کے ساتھ شائستہ برتاؤ نہیں کیا۔ محمد علی جناح کو اُس کا رویہ اس قدر ناگوار گزرا کہ اُس دن کے بعد انہوں نے کبھی اُس سے بات نہیں کی۔ حتیٰ کہ اگر کبھی وہ عدالت کے احاطہ میں ایک دوسرے کے سامنے پڑتے تو محمد علی جناح اجنبی بن جاتے۔

اس طرح ایک مرتبہ اُن کو جسٹس مرزا کی عدالت میں ایک مقدمے کے سلسلہ میں پیش ہونا تھا۔ دوسری جانب سے سر چمن لال سلواڈ وکالت کررہے تھے۔ محمد علی جناح نے جب جرح شروع کی تو جسٹس مرزا نے ایک مرحلہ پر اُن کو ٹوک دیا کہ 'آپ کا لہجہ بہت تلخ ہے اور آپ توہینِ عدالت کے مرتکب ہورہے ہیں۔' سر چمن لال نے

اپنی کتاب Recollections & Reflections میں یہ واقعہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس موقع پر جسٹس مرزا نے مجھ سے سوال کیا کہ 'کیا مسٹر جناح کا لہجہ توہین آمیز نہیں ہے۔' جس پر میں نے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے میرا نہیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ جناح کا مقصد توہینِ عدالت نہیں تھا۔' بہت بعد میں اس واقعہ کا تذکرہ اپنے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید سے کرتے ہوئے جناح نے کہا کہ اُس دن کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب میں کبھی جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش نہیں ہوں گا۔ اس طرح ایک مرتبہ جرح کے دوران جب جسٹس مارٹن نے برہمی کے انداز میں اُن کوٹوکا اور کہا کہ 'مسٹر جناح آپ کسی تیسرے درجے کے مجسٹریٹ کے سامنے جرح نہیں کر رہے ہیں تو مسٹر جناح نے فوراً جواب دیا کہ 'آپ کے سامنے بھی کوئی تیسرے درجے کا وکیل نہیں کھڑا ہوا ہے۔' محمد علی جناح کا پہلا عشق قانون سے تھا اور اسی عشق سے اُن کی شخصیت کا خمیر اٹھا تھا۔ اُن کی سیاسی کامیابیاں حتیٰ کہ قیامِ پاکستان کا شاندار کارنامہ بھی اُن کے اسی عشق کا ایک شاندار نتیجہ تھا۔

جوکھم اولوا نے Leaders of India میں محمد علی جناح کی عدالتی مصروفیات کا تذکرہ بہت دلکش انداز میں کرتے ہوئے کئی ایسے واقعات درج کیے ہیں جو اُن کے کردار کی بلندی اور ارادے کی پختگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اُس نے لکھا ہے کہ محمد علی جناح بہت جلد اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر موضوع گفتگو بن گئے اور قانونی پیشہ سے تعلق رکھنے والا ہر شخص یہ بات کہنے لگا کہ وہ ایک دن ہندوستان کے بہت بڑے وکیل ثابت ہوں گے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ جناح ایک جرات مند، قابل اور صاف گو وکیل کے طور پر اتنے معروف ہوئے کہ وہ جب مقدمے کی پیروی کے لیے کمرۂ عدالت میں آتے تو وکلاء اور عوام کی ایک بڑی تعداد پہلے سے جناح کی جرح کو سننے کے لیے وہاں موجود ہوتی۔ سید شریف الدین پیرزادہ نے لکھا ہے کہ پیر پگارا کی سز کے خلاف کراچی میں ایک ڈویژن بینچ کے سامنے پیش ہوئے۔ یہ بینچ جسٹس اے سی

وائلڈاور جسٹس آر بی مالکنی پر مشتمل تھا۔ایک نکتہ پر جسٹس مالکنی نے جناح سے کہا کہ 'وہ ذرا زور سے بولیں کیونکہ وہ اُن کی آواز سن نہیں پا رہے ہیں۔' محمد علی جناح نے جواباً کہا کہ میں بیرسٹر ہوں اداکار نہیں۔' جج خاموش رہا لیکن اُس نے جرح کے درمیان پھر جناح سے کہا 'مسٹر جناح میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ آپ زور سے بولیں' اس مرتبہ جناح نے جواباً کہا کہ 'اگر آپ اپنے سامنے رکھی ہوئی کتابوں کا انبار ہٹادیں تو شاید آپ مجھ کو بہتر طور پر سن سکیں گے۔' پیرزادہ نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جناح ایک کاروباری تنازعہ میں سندھ چیف کورٹ میں پیروی کے لیے پہنچے تو وہاں کمرۂ عدالت اور برآمدوں میں ہزاروں افراد اُن کو دیکھنے اور سننے کے لیے جمع تھے۔ جب چیف جسٹس مسٹر ڈیوس اور جسٹس مسٹر ویسٹن پہنچے تو اس قدر ہجوم کو دیکھ کر جسٹس ڈیوس نے عدالت کے کلرک سے کہا کہ کمرۂ عدالت کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ جسٹس ڈیوس کی اس ہدایت پر جناح اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انہوں نے مسکراتے ہوئے جسٹس ڈیوس سے کہا کہ 'انصاف کے دروازے ہمیشہ کھلے رہنا چاہئیں۔' جسٹس ڈیوس نے جناح کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ بہرحال کمرۂ عدالت میں خاموشی رہنا چاہیے۔ جناح نے جواباً کہا 'یقیناً' اور مقدمے کی سماعت پرسکون ماحول میں شروع ہوگئی۔

رضوان احمد نے لکھا ہے کہ قائداعظم جھوٹے مقدمے اپنے ہاتھ میں لینا پسند نہیں کرتے تھے خواہ اس کے عوض اُن کو کتنی ہی رقم کیوں نہ پیش کی جاتی۔ ایک مرتبہ پنجاب کی ریاست کے ایک حکمران نے اپنے مقدمے کے کاغذات قائداعظم کو ایک لاکھ روپے فیس کے ساتھ پیش کیے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ اس مقدمہ کی پیروی کریں مگر جناح نے مقدمہ کی نوعیت کا مطالعہ کرنے کے بعد کاغذات فیس کے ساتھ واپس کردیئے کیونکہ اُن کی نظر میں یہ مقدمہ سچا نہیں تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ اخبار 'ریاست' نے ایک مسلم ریاست کے خلاف ایک مضمون شائع کیا جس کے نتیجے میں

ریاست کی جانب سے اخبار کے ایڈیٹر کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا پیروی کے لیے قائداعظم سے درخواست کی گئی اور اس سلسلہ میں ایک گرانقدر رقم بطور فیس قائداعظم کو پیش کی گئی مگر قائداعظم نے اس فیس کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ ذاتی مفاد میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں ہندوستان کے پریس کی آواز کو دبانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں تو پریس کی آزادی کے لیے لڑتا رہا ہوں۔

قائداعظم کی ایمانداری نے اُن کے اندر اس قدر جرات اور اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ بعض اوقات دورانِ جرح وہ ہائی کورٹ کے ججوں کو ٹوک دیتے تھے۔ پیرزادہ نے لکھا ہے کہ بمبئی کے ایک وکیل لیھی والا نے اپنے ایک مضمون میں جسٹس کانیا کے ساتھ جناح کے ٹکراؤ اور تصادم کے واقعات درج کیے ہیں۔ جسٹس کانیا بعد میں انڈیا کے چیف جسٹس کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔ ایک موقع پر جب جناح ایک مقدمے کے سلسلہ میں جسٹس کانیا کے سامنے پرجوش انداز میں دلائل دے رہے تھے جسٹس کانیا نے جناح کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ شاید آپ سرکاری وکیل کے معروضات پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ جسٹس کانیا کی اس مداخلت پر محمد علی جناح بھڑک اٹھے اور انہوں نے جسٹس کانیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ 'عزت مآب یہ آپ کا کام نہیں ہے کہ آپ وکیل کو یہ باور کرائیں کہ وہ سرکاری وکیل کے نکات کو سمجھے یا اُن نکات کے مطابق دلائل پیش کرے۔' کچھ عرصہ کے بعد ایک ہندو تاجر اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے محمد علی جناح کے پاس آیا اور اصرار کیا کہ آپ میرے مقدمے میں عدالت عالیہ کے سامنے پیش ہوں۔ محمد علی جناح نے اُس سے دریافت کیا کہ مقدمہ کس کی عدالت میں ہے۔ اُس نے بتایا جسٹس کانیا کی عدالت میں ہے۔ محمد علی جناح نے اُس سے کہا کہ تم کوئی اور وکیل کر لو کیونکہ جسٹس کانیا سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں اس لیے مقدمہ کا فیصلہ یقیناً تمہارے خلاف ہوگا۔ ہندو تاجر نے کہا کہ کوئی بات نہیں چنانچہ محمد علی جناح اُس کی طرف سے عدالت میں پیش ہوئے اور مقدمہ کا فیصلہ موکل

کے خلاف ہو گیا۔ محمد علی جناح نے عدالت میں موجود اپنے موکل سے کہا کہ 'میں نے تم سے منع کیا تھا کہ اس بد بخت عدالت میں مجھے مت لے جاؤ مگر تم نہیں مانے اب نتیجہ سامنے ہے۔' اتفاق سے جسٹس کانیا نے جناح کے یہ الفاظ سن لیے اور جناح سے پوچھا کہ ابھی تم نے اپنے موکل سے کچھ کہا تھا۔ محمد علی جناح نے جسٹس کانیا سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو اُس گفتگو سے دلچسپی ہے جو ایک وکیل اپنے موکل سے کرتا ہے۔ جسٹس کانیا نے اثبات میں جواب دیا تو جناح نے وہی الفاظ دھرا دیے۔ جسٹس کانیا نے فوری طور پر ایڈوکیٹ جنرل سے پوچھا کہ کیا ان الفاظ سے عدالت کی توہین ہوتی ہے۔ ایڈوکیٹ جنرل کے جواب دینے سے پہلے ہی جناح عدالت سے باہر آ گئے۔

محمد علی جناح کی جرات و ہمت، بے باکی وتحمل، تدبر، قانونی نکات کا فہم، خلوص مقصد، پرکشش شخصیت نے اُن کو ایک بے مثال قانون داں کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ اُن کو اپنے مقدمات میں وکیل کرنے کے لیے بیشتر لوگ متمنی رہتے تھے مگر وہ صرف وہی مقدمات اپنے ہاتھ میں لیتے تھے جن کے بارے میں انہیں یقین ہوتا تھا کہ یہ سچے اور حق طلبی پر مبنی مقدمات ہیں۔ محمد علی جناح کی اصول پسندی بھی منفرد تھی۔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو جب محمد علی جناح مسلمانوں کے قائداعظم کے طور پر تحریکِ پاکستان کی قیادت کر رہے تھے کہ بمبئی میں ایک خاکسار نے اُن پر قاتلانہ حملہ کیا۔ قائداعظم کے معمولی زخم آئے اور قاتل کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ جب عدالت میں اس مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو جناح کے ایک وکیل دوست مسٹر سوم جی مقدمہ میں سرکاری وکیل تھے۔ سوم جی نے مقدمہ کے حوالے سے جناح سے اُن کے گھر آ کر بات کرنا چاہی تو انہوں نے منع کر دیا اور کہا کہ مقدمہ کے حوالے سے تمام باتیں عدالت میں ہوں گی۔ سید شریف الدین پیرزادہ نے ایک ملاقات میں راقم الحروف کو بتایا کہ اسی مقدمے کی جب بمبئی ہائی کورٹ میں سماعت شروع ہوئی تو محمد علی

جناح کے احترام میں مقدمہ کی سماعت کرنے والے جسٹس بلیک ڈین چاہتے تھے کہ محمد علی جناح عدالت میں اُس دروازے سے آئیں جہاں سے وکلاء اور جج آتے ہیں لیکن محمد علی جناح نے کہا کہ میں ایک گواہ کی حیثیت سے عدالت میں آ رہا ہوں اس لیے اُسی دروازے سے عدالت میں آؤں گا جس سے عام گواہ آتے ہیں۔ بقول پیرزادہ اس صورت حال کو دیکھ کر جسٹس بلیک ڈین نے کہا کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں قانون کا ایسا پاسدار اور سچا گواہ نہیں دیکھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کے رپورٹڈ مقدمات کی تعداد تقریباً ۱۷۰ ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت سے مقدمات میں پیروی کے لیے عدالت میں پیش ہوئے۔ بڑے مقدمات جن کی اخبارات میں تشہیر ہوئی وہ بھی بہت ہیں لیکن ان کی تفصیلات میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً غازی علم الدین کے مقدمے کی تفصیلات مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔ اسی طرح نومبر ۱۹۴۲ء کے ایک مقدمہ میں جو رشوت ستانی کے حوالے سے تھا قائداعظم سٹی مجسٹریٹ آگرہ کی عدالت میں پیش ہوئے۔ اس مقدمے کی تفصیلات بھی شفیق احمد قریشی کے ایک کتابچہ میں موجود ہیں جو یہاں درج نہیں کی جا رہی ہیں کیونکہ اس مضمون کا مقصد محمد علی جناح کی بحیثیت وکیل صلاحیتوں کا جائزہ لینا ہے اور یہ بات طے ہے کہ وہ تقریباً ۴۶ سال بحیثیت وکیل ہندوستان میں معروف و ممتاز رہے۔ حال ہی میں ایک معروف وکیل ظہیر احمد میر کی ایک ضخیم کتاب قائداعظم محمد علی جناح کے مقدمات کے بارے میں *The Genius Jurist* کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جو بہت اہم ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ریاض احمد کی کتاب *Quaid-i-Azam: As an Advocate* بھی قابلِ ذکر ہے جو ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی تھی اور اس موضوع پر بنیادی مواد فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ قائداعظم جہاں ایک بہت عظیم سیاستدان تھے وہاں وہ ایک ایسے قانون داں بھی تھے جن کا متحدہ ہندوستان میں کوئی ثانی نہیں تھا۔ بقول

سید شریف الدین پیرزادہ' آزادی کے لیے جناح کی جدوجہد جہاں یاد رکھی جائے گی وہاں عدالتوں میں اُن کے اندازِ وکالت کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک ہمہ جہت اور ہمہ داں وکیل تھے اور مقدمات میں کامیابی اُن کی ذات سے مشروط ہوگئی تھی۔ وہ نہایت ایماندار، ناانصافی سے دور اور بے مثال دلائل سے لیس تھے۔ اُن کے ہمعصر وکلاء اُن جیسا بننے کی آرزو وحسرت رکھتے تھے۔

قائداعظم اور پاکستان کی نظریاتی اساس

'قائداعظم اور پاکستان کی نظریاتی اساس' ایک ایسا موضوع ہے جو اپنی وسعت اور معنویت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اپنی وضاحت میں پاکستان کی نظریاتی حیثیت کو بھی ظاہر اور متعین کرتا ہے۔ اس عنوان کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ قائداعظم محمد علی جناح کی جدوجہد، دوراندیشی، حکمتِ عملی اور فراست وبصیرت سے متعلق ہے۔ جبکہ دوسرا حصہ پاکستان کی نظریاتی اساس سے متعلق ہے۔ اور یہ دونوں حصے باہم لازم و ملزوم ہیں۔ جب تک آپ ایک حصے کا تاریخی طور پر فہم پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک دوسرے حصے کی حقیقت و معنویت آپ پر منکشف نہیں ہو سکے گی۔ یقیناً ایسی صورت میں میرا یہ فرض ہے کہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے پہلے قائداعظم محمد علی جناح کی حیات و خدمات کو واضح کروں اور اس کے بعد قائداعظم کی تقاریر کے اقتباسات کی روشنی میں پاکستان کی نظریاتی اساس کو واضح کروں۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا شمار عہدِ جدید کی تاریخ کی اُن عظیم شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنی حیات وخدمات کی روشنی میں تاریخ کا ایک ایسا باب بن جاتی ہیں کہ آنے والی صدیاں اُن کے تذکرے سے گونجتی رہتی ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی ۷۲ سالہ زندگی کے تقریباً ۴۴ سال ہندوستان کے عوام خصوصاً مسلمانوں کی ترقی، خوشحالی، سیاسی بالادستی، ثقافتی تحفظات اور حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کے حوالے سے بسر کیے۔ اس عرصے میں آپ کو اگرچہ بعض مراحل پر اپنوں

اور غیروں کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا، مگر آپ کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں اور نا قابلِ تسخیر سیاسی بصیرت نے بالآخر یہ بات طے کر دی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے آپ ہی بلاشرکتِ غیرے 'قائداعظم' ہیں۔ قائداعظم کی اسی سیاسی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے جون ۱۹۳۷ء میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ ''اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے اُس میں صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے مسلمان قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔''

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ سے قبل ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی وحدت نہ صرف انتشار کا شکار ہوگئی تھی بلکہ اُن کی نمائندہ سیاسی جماعت 'آل انڈیا مسلم لیگ' بھی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی، لہٰذا تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر جب ہندوستان کے مسلمان اپنی بقا اور سلامتی کی جانب سے بڑی حد تک مایوس ہو چکے تھے، قائداعظم محمد علی جناح نے تدبر، فراست، غیر متزلزل عزم، سیاسی بصیرت اور بے مثل قائدانہ صفات سے کام لے کر مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایسے متحد و منظم کر دیا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں نہ صرف ایک علیحدہ مسلم وطن کی قرارداد منظور ہوگئی بلکہ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔

برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا وہ دیرینہ خواب جو ہندوستان کے مسلمان دو صدیوں سے دیکھتے چلے آ رہے تھے، ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو شرمندۂ تعبیر ہوا اور بلاشبہ اس خواب کی تعبیر ایک فرد کی چشم کرشمہ ساز کا نتیجہ تھی، اور وہ فردِ واحد تھے 'قائداعظم محمد علی جناح'۔ جو اپنی سیاسی زندگی کے اولین عشرہ میں ہی ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلائے۔ یعنی ۱۹۱۶ء میں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب ملتے ہی اُن کی ذات دو قومی نظریے کی علامت بن گئی تھی اور یہ اُصول طے ہوگیا تھا کہ مستقبل کے

ہندوستان کی سیاسی اور دستوری صورتِ حال اسی اُصول کے تحت پروان چڑھے گی جیسا کہ بعد میں حالات اور وقت نے ثابت کر دیا۔

قائداعظم کی سیاسی زندگی کے آخری پندرہ سال مسلم ہندوستان کی آئینی اور سیاسی بالادستی کے حصول کے حوالے سے بسر ہوئے۔ انہی پندرہ سال کے دوران جہاں انہوں نے مسلمانوں کے منتشر ہجوم کو ایک قوم کی صورت میں متشکل کیا وہاں اُن کو یہ بھی باور کرایا کہ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں ایک عظیم تاریخی ورثے کے ہی مالک نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسے مذہب کے پیروکار بھی ہیں جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظم نے اپنی تقاریر، بیانات اور خطوط کے ذریعے جہاں دوقومی نظریے کی وضاحت کی وہاں مطالبۂ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی حقانیت کا بھی اعلان کیا۔

قائداعظم کی تقاریر، بیانات اور خطوط ایسی بنیادی سچائیاں ہیں جن کی تفہیم اور تفتیش سے ہم نہ صرف قائداعظم کے تصورِ پاکستان، اُن کی حکمتِ عملی اور سیاسی بصیرت سے آشنا ہو سکتے ہیں بلکہ اپنے ملک کی ترقی وخوشحالی اور استحکام کے لیے ایک حتمی لائحۂ عمل تک رسائی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تک ہم ان تقاریر، بیانات اور خطوط کا مطالعہ نہیں کریں گے اور اپنے اندر ان کا فہم پیدا نہیں کریں گے اُس وقت تک نظریاتی تحفظ اور قومی وحدت کے حوالے سے بہت سے سوالات ہمیں ہمارے قومی مستقبل کے حوالے سے ڈراتے رہیں گے۔ جہاں تک ۱۹۴۹ء میں منظور ہونے والی 'قراردادِ مقاصد' کا تعلق ہے تو میں قائداعظم کی تقاریر و بیانات کے آئینے میں اس قرارداد کو پاکستان کے آئین کی تشکیل کی جانب پہلا قدم تصور کرتا ہوں۔ ایک ایسا قدم جس میں وہ وعدے اور دعوے پورے ہوتے دکھائی دے رہے تھے جو قائداعظم اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے تحریکِ پاکستان کے دوران متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں اور قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے عوام سے کیے تھے۔ قائداعظم

نے جہاں اپنی تقاریر سے مسلمانوں کے اندر اُن کے جذبہ قومیت کو فروغ دیا، وہاں متعدد بار اس امر کا اعادہ کیا کہ پاکستان کا آئین قرآن وسنت کے مطابق ہوگا اور ہم پاکستان کو حقیقی معنی میں ایک اسلامی فلاحی مملکت بنائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مطالبۂ پاکستان کو مسلمانوں کی ملی وفکری بیداری کی تحریک قرار دیا اور ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔'' یہ فخر تاریخی شعور اور ملی احساسِ وراثت کی دلیل تھا جس کا قائداعظم بار بار اعلان کیا کرتے تھے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۳ء کو ایک پیغام میں انہوں نے فرمایا ''ہم ایک عظیم الشان تاریخ اور درخشاں ماضی کے وارث ہیں۔ ہمیں خود کو اسلام کی حقیقی نشاۃ الثانیہ کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔''

اسی طرح مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جب آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ پاکستان کا آئین کس طرح کا ہوگا؟ تو آپ نے جواب میں کہا ''میں کون ہوتا ہوں آپ کو آئین دینے والا! ہمارا آئین ہمیں آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے عظیم پیغمبر ﷺ نے دے دیا تھا۔ ہمیں تو صرف اس آئین کی پیروی کرتے ہوئے اسے نافذ کرنا ہے اور اس کی بنیاد پر اپنی مملکت میں اسلام کا عظیم نظامِ حکومت قائم کرنا ہے اور یہی پاکستان کا مقصد ہے۔''

۳۰ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور سے ایک نشری تقریر میں قوم سے فرمایا ''اسلام کی تاریخ جواں مردی اور عزم وحوصلہ کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔۔۔ ایک متحد قوم کو جس کے پاس ایک عظیم تہذیب وتاریخ ہے، کسی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایک اور مرحلے پر انہوں نے فرمایا ''تم میں ایک اعلیٰ قوم کی نشانیاں موجود ہیں جو دنیا کی کسی قوم میں نہیں۔ بس اپنی تاریخ کے سائے میں سانس لیتے رہو اور عظمت کے ایک نئے دور کا آغاز کرو۔'' ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کو مسلم افواج کے حفاظتی دستوں اور راولپنڈی کے عوام کے نام ایک پیغام میں فرمایا ''ہم کو خطرات درپیش ہیں

لیکن آپ سب کامل اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستان کا وقار پہلے سے زیادہ بلند رکھتے ہوئے اور اسلام کی عظیم روایات اور قومی پرچم کو بلند کیے ہوئے ان خطرات کے درمیان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں گے۔"

اس کے علاوہ قائداعظم نے قیامِ پاکستان کے بعد ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ان الزامات اور شکوک و شبہات کی جن کے تحت بعض حلقوں کی طرف سے کہا جاتا تھا کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست ہوگا اور بعض حلقے یہ کہتے تھے کہ پاکستان ایک تھیوکریٹک ریاست ہوگی، براہ راست اور واضح طور پر تردید کرتے ہوئے کہا کہ

> میں ان لوگوں کی ذہنیت کو نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ و دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلامی اصول آج بھی اسی طرح قابل نفاذ ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام محض رسوم و روایات کا مجموعہ یا روحانی ضابطہ نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے زندگی کا ایک ضابطہ بھی ہے، جو سیاست، معیشت اور اسی طرح کے دوسرے معاملات میں اس کے رویے کو منضبط کرتا ہے۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں، بلکہ غیر مسلموں کو بھی کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔ کسی کو ایسی جمہوریت سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے اصولوں پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستورِ پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔

فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام اپنے نشری خطاب میں فرمایا "مجھے

نہیں معلوم کہ پاکستان کے آئین کی حتمی صورت کیا ہوگی۔ البتہ مجھے اتنا یقین ہے کہ پاکستان کا آئین جمہوری طرز کا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اسلام کے تمام ضروری اور بنیادی اصولوں پر مبنی ہوگا۔" ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے عوام کے نام نشری خطاب میں فرمایا "پاکستان کے عوام کی عظیم اکثریت مسلمان ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔ ہم اُس اسلامی ملت اور برادری کے رکن ہیں جس میں حقوق، وقار اور خودداری کے تعلق سے سب برابر ہیں۔ ہم میں اتحاد کا ایک خصوصی اور گہرا شعور موجود ہے۔ لیکن غلط نہ سمجھیے، پاکستان میں کوئی نظامِ پاپائیت رائج نہیں ہوگا۔ اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دیگر عقائد کو گوارا کریں۔"

قائداعظم کی تقاریر سے یہ اقتباسات درج کرنے کی مجھے ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ جہاں قائداعظم کی اُس فکر تک رسائی ممکن ہو سکے جو اپنی معنویت میں اسلام دوستی پر مبنی تھی وہاں یہ بھی معلوم ہو سکے کہ وہ پاکستان کے آئین کے حوالے سے کیا عزائم رکھتے تھے۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو انتقالِ اقتدار کی تقریب میں جب ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں پاکستان میں آباد اقلیتوں کے ساتھ سلوک کے حوالے سے مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی مثال دی تو قائداعظم نے مجلس دستور ساز پاکستان کے افتتاح کے موقع پر ماؤنٹ بیٹن کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی جوابی تقریر میں واضح طور پر کہا کہ

> اکبر اعظم نے تمام غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کی ابتدا تو آج سے تیرہ سو سال پہلے ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کر دی تھی۔ آپؐ نے زبان سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے یہود ونصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا۔ اُن کے ساتھ رواداری برتی اور اُن کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمان

جہاں کہیں بھی حکمران رہے ایسے ہی رہے۔ مسلمانوں کی تاریخ
دیکھی جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اُصولوں
سے بھری ہوئی ہے۔ ان اصولوں کی ہم سب کو تقلید کرنا چاہیے۔

قائداعظم کی تقاریر کی سب سے اہم فضیلت ہی یہ ہے کہ وہ مختصر فقروں میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتے ہیں۔ تقاریر کے اِن اقتباسات میں ایک عقیدہ بھی موجود ہے اور ایک لائحہ عمل بھی۔ ایسا لائحہ عمل جو ہندوستان میں مسلم قوم کے مسلمہ کردار کی بازیابی کے لیے ایک منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ قائداعظم نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علموں کو باور کرایا کہ ''پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ جہاں دیگر مذہبی اور ثقافتی وجوہات رہی ہیں وہاں اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ مطالبہ جداگانہ قومیت کی بنیاد پر اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔''

۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار بلوچستان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''میرا عقیدہ ہے کہ ہماری نجات انہی سنہری قوانین کی پابندی کرنے میں ہے جو ہمارے شارح اعظم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے لیے متعین کیے۔ آیئے ہم اپنی جمہوریت کی اساس صحیح اسلامی تصورات اور اصولوں پر استوار کریں۔ ۱۲ر اپریل ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج پشاور کے ایک استقبالیہ میں فرمایا ''ہم ایک ایسی مملکت تعمیر کر رہے ہیں جو پورے عالم اسلام کی تقدیر سازی میں بھرپور کردار ادا کرے گی۔''

یہاں اس تقریر کا حوالہ دینا ضروری ہے جو قائداعظم کے تصور پاکستان کے حوالے سے نہ صرف معروف ہے بلکہ جس کو ایک مخصوص مکتبۂ فکر ذاتی تاویلوں اور عذرِ بے جا کے ذریعے متنازع بنا دینے کی دانستہ کوششوں میں مصروف ہے۔ میری مراد ہے ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی وہ تقریر جو قائداعظم نے قیامِ پاکستان سے قبل کراچی میں مجلسِ دستور ساز کے افتتاح کے موقع پر کی تھی اور جو واضح طور پر ۱۹۴۹ء میں مجلسِ دستور ساز میں منظور کی جانے والی قراردادِ مقاصد کو استناد فراہم کرتی ہے۔

میں یقیناً اس تقریر کو من وعن یہاں نقل نہیں کر رہا ہوں لیکن جزوی طور پر اس کے مفہوم کو پیرا وائز ضرور بیان کروں گا:

۱) پاکستان کے لیے دستور مرتب کرنا
۲) وفاقی قانون ساز ادارے کو کامل خودمختار ادارے کی شکل دینا
۳) امن وامان کو برقرار رکھنا تاکہ مملکت اپنے عوام کی جان ومال اور اُن کے مذہبی عقائد کو مکمل طور پر تحفظ دے سکے
۴) رشوت ستانی اور بدعنوانی کا خاتمہ۔ یہ ایک زہر ہے، اس کا سختی سے قلع قمع کرنا پڑے گا
۵) غذائی اجناس اور اشیائے ضرورت کی چور بازاری اور گرانی کا خاتمہ
۶) اقربا پروری، احباب نوازی اور ذاتی مفادات کے حصول کی لعنت کا خاتمہ
۷) فرقہ وارانہ ہم آہنگی
۸) اپنی عبادت گاہوں میں جانے کا آزادانہ حق
۹) پاکستان کو خوشحال بنانے کے لیے عوام کی فلاح وبہبود پر توجہ۔ عوام سے میری مراد عامتہ الناس اور غریب عوام ہیں
۱۰) ذات پات کے نظام اور صوبائی عصبیتوں کا خاتمہ (یہاں میں یہ بات پوچھنے میں شاید حق بجانب ہوں گا کہ ان دس نکات میں سے ہم نے کس پر اور کہاں تک عمل کیا؟)

قائداعظم نے ان نکات کو بیان کرنے کے بعد فرمایا "اب آپ آزاد ہیں۔ اس مملکت پاکستان میں آپ آزاد ہیں۔ اپنے مندروں میں جائیں، اپنی مساجد میں جائیں یا کسی اور عبادت گاہ میں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، کاروبار مملکت کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔"

آخر میں یہ بھی فرمایا کہ "جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا، نہ

مسلمان مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔''

یہی دو پیراگراف ہیں جن کی بنیاد پر کچھ لوگ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ تصور کرنے کے حق میں ہیں لیکن وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں کہ یہ دونوں پیراگراف میثاقِ مدینہ میں بھی موجود ہیں۔ یہ پیراگراف اقلیتوں سے معاملات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ تحقیق قائداعظم اور تحریکِ پاکستان کے ضمن میں بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق پروفیسر شریف المجاہد کی ہے اور جسے گزشتہ بیس سال کے دوران کسی جانب سے بھی رد نہیں کیا گیا۔ اسی نوعیت کی ایک تحقیق معروف قانون دان اور محقق سید شریف الدین پیرزادہ نے بھی اپنے ایک مضمون میں درج کی تھی۔ پروفیسر شریف المجاہد اور سید شریف الدین پیرزادہ کے مضامین روزنامہ 'ڈان' میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ قائداعظم محمد علی جناح نے تحریکِ پاکستان کے دوران یا قیامِ پاکستان کے بعد اپنی تقاریر میں کبھی نظریاتی حوالے سے سیکولر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ افسوس یہ کیسا غیر اخلاقی رویہ ہے کہ ایک ایسا لفظ قائداعظم کے نظریات سے منسوب کیا جاتا ہے جو کبھی آپ نے لادینی معانی میں اپنی زبان سے ادا ہی نہیں کیا۔

مجھے مضمون کی طوالت کا احساس ہے لیکن یہ موضوع ہی ایسا ہے جس سے سرسری طور پر گزرا نہیں جاسکتا۔ قائداعظم کے کسی بیان یا نکتہ نظر سے سیاسی روایت کے پیشِ نظر یا آزادیٔ اظہار کی تائید میں اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اُس کی حقیقی معنویت کو تاویلات میں الجھا کر یا اُس میں اپنے نکتۂ نظر کی مماثلت تلاش کرنے کی کوشش ایک واضح بددیانتی ہے۔ ایک مخصوص مکتبۂ فکر قائداعظم کے خیالات کو اپنے نظریات کے آئینے میں پیش کرتا ہے جو یقیناً بابائے قوم قائداعظم کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے۔ شاید اسی لیے یہ مخصوص طبقہ قراردادِ مقاصد کو بھی مطعون کرتا رہتا ہے

اور اس کی ضرورت و اہمیت سے انکاری ہے جبکہ قراردادِ مقاصد اپنے متن میں قائداعظم کی حقیقی فکر کی ترجمان ہے۔

قراردادِ مقاصد قائداعظم کے انتقال کے تقریباً چھ ماہ بعد یعنی ۱۲/ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں پیش کی گئی۔ پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ میں 'قراردادِ مقاصد' ایک بنیادی دستاویز ہے۔ اس قرارداد میں نہ صرف قوم کے مخصوص تاریخی ورثے کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ اس میں قائداعظم محمد علی جناح کے افکار و خیالات کی روشنی میں قومی نصب العین کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ قراردادِ مقاصد میں اُن اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی بنیادوں پر مستقبل میں پاکستان کا آئین مرتب کیا جانا تھا۔ اسی لیے اس قرارداد کو آئین ساز اسمبلی نے منظور کر کے پاکستان کے آئین کے دیباچے کی حیثیت دے دی۔ پاکستان کے تمام آئین اسی قرارداد کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں۔

یہاں اس قرارداد کے نکات کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ قرارداد منظور نہ کی جاتی تو پاکستان کے آئین کو قرآن و سنت اور قائداعظم کے افکار کے مطابق خطوط میسر نہ آتے اور وہ طبقہ جو انگریزوں اور ہندوؤں کے زیر اثر پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانے کے لیے کوشاں تھا اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا اور ہم تحریکِ پاکستان اور مطالبۂ پاکستان کے حقیقی مقاصد سے روگردانی کے مرتکب ہو جاتے۔ اس قرارداد نے پاکستان کی نظریاتی حیثیت کا تعین کیا اور ہم کو اپنی نومولود ریاست کو 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' کہنے کا اعزاز بخشا اور یہ سب کچھ بانئ پاکستان کی دور اندیشی، بصیرت اور اپنے مقاصد سے گہری اور ناقابلِ شکست وابستگی کے نتیجے میں ہوا اور ہم اس پر فخر مند ہیں کہ یہی قرارداد قائداعظم کے افکار و خیالات کی روشنی میں پاکستان کی نظریاتی اساس ہے۔

قائداعظم کی سیاسی بصیرت اور دوقومی نظریہ

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی ۷۲ سالہ زندگی کے تقریباً ۴۴ سال قومی سیاست کے حوالے سے بسر کیے۔ مذکورہ ۴۴ سال کے دوران انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس، ہوم رول لیگ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کی آزادی، ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کے لیے جدوجہد کی۔ ۱۹۰۶ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے رکن ہوئے پھر ۱۹۱۳ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہوئے جو خالصتاً مسلمانوں کی سیاسی جماعت کے طور پر ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ستمبر ۱۹۱۶ء میں ہندوستان کے عوام کو حکومتِ خوداختیاری دلانے کے لیے قائم کی جانے والی جماعت ہوم رول لیگ میں انہوں نے جون ۱۹۱۷ء میں شمولیت اختیار کی اور ہوم رول لیگ، بمبئی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس سال الٰہ آباد میں ہوم رول لیگ کے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے عوام سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ مطالبات کی حمایت کریں کیونکہ ہوم رول لیگ کا مقصد بھی انہی مطالبات کا حصول ہے جو ۱۹۱۶ء کے مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ اجلاس میں 'میثاقِ لکھنؤ' کی صورت میں منظور کیے گئے ہیں۔

محمد علی جناح کی سیاسی حکمتِ عملی نے اُس دَور میں ہی یہ ثابت کردیا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی منظر پر وہ واحد رہنما ہیں جو کسی قوم پرستانہ رویے سے بالاتر ہوکر ہندوستان کی آزادی، ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کے لیے

جدوجہد کر رہے ہیں۔ اسی دور میں ان کو 'ہندو مسلم اتحاد کے سفیر' کے خطاب سے بھی یاد کیا گیا۔ محمد علی جناح کی یہ جدوجہد ایک طویل عرصہ تک جاری رہی مگر آہستہ آہستہ اُن پر واضح ہوتا چلا گیا کہ کانگریس کے ہندو رہنما ہندوستان کی آزادی تو چاہتے ہیں لیکن مسلمانوں کو اُن کے جائز حقوق کسی طور پر بھی دینے کو تیار نہیں بلکہ وہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستان میں 'ہندو راج' قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا راج جس میں مسلمان ایک پسماندہ اور محکوم اقلیت کے طور پر زندگی بسر کریں۔ محمد علی جناح اس صورتِ حال کو کسی صورت بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا انہوں نے ہندوستان کے آئینی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومتِ برطانیہ کے نمائندوں اور کانگریسی رہنماؤں سے متعدد بار مذاکرات کیے لیکن ہندو رہنماؤں نے اپنی ہٹ دھرمی برقرار رکھی۔ ان مذاکرات کے ذریعہ ہی محمد علی جناح نے یہ اُصول واضح کیا کہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ آئینی مسئلہ کا حل صرف اور صرف مطالبۂ پاکستان کی منظوری میں مضمر ہے کیونکہ اس خطے میں مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ ہمیشہ برقرار رہا اور اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومت اور تمام سیاسی جماعتیں تقریباً نوے سال سرگرم رہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قائداعظم محمد علی جناح نے ابتداً ہندو مسلم اتحاد کے لیے وسیع پیمانے پر کوششیں کیں لیکن کانگریسی رہنماؤں نے ان کوششوں کو کبھی بارآور ہونے نہیں دیا۔ دراصل انڈین نیشنل کانگریس اور خصوصاً قوم پرست رہنما موہن داس کرم چند گاندھی کسی قیمت پر بھی ہندستان میں مسلمانوں کے وجود کو یا اُن کی علیحدہ کسی خودمختار حیثیت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ میثاقِ لکھنؤ کی صورت میں ۱۹۱۶ء میں مسلمانوں کو اس ضمن ایک جزوی کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن اس کے بعد تقسیمِ ہند تک ہندوؤں کی جانب سے کسی خیرسگالی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کانگریس کے مسلم دشمن رویہ کی بدترین مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ ایسی

رپورٹ کے بعد مسلم رہنماؤں کے اذہان میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کا تصور متشکل ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں بھی جب فرقہ وارانہ مسائل کے حل کا سوال آیا تو ہندو رہنماؤں نے عدم تعاون کا مظاہرہ کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں گاندھی نے مسلمان مندوبین کی جانب سے فرقہ وارانہ مسائل کے ضمن میں کسی بھی مطالبہ کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان اور دیگر مندوبین نہرو رپورٹ کو اُس کی کلیت میں تسلیم کرلیں۔ گاندھی کی اس شرط سے ایک مرتبہ پھر فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل تعطل کا شکار ہوگیا۔

۱۹۳۵ء میں نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا اعلان کیا گیا۔ اس ایکٹ میں فرقہ وارانہ مسئلہ کا جو حل تجویز کیا گیا تھا وہ مایوس کن تھا لیکن جناح نے یہ استدلال کیا کہ ''اگر یہ ایوارڈ قبول نہ کیا گیا تو پھر کوئی آئینی اسکیم ممکن نہیں۔'' ساتھ ہی ساتھ جناح کسی ایسے متبادل فارمولے کے لیے بھی تیار تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو لہٰذا جب کانگریس کے صدر راجندر پرشاد نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مذاکرات کے آغاز کی تجویز پیش کی تو جناح نے فوری طور پر آمادگی ظاہر کردی۔ جناح اور کانگریس کے صدر کے درمیان جنوری اور مارچ ۱۹۳۵ء میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ لیکن ان مذاکرات کے نتیجے میں جو فارمولا مرتب کیا گیا وہ خود چند کانگریسی رہنماؤں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ جہاں تک انتہا پسند ہندو رہنماؤں کا تعلق تھا ان میں سے بیشتر نے اس فارمولے کی مخالفت کی۔ اس طرح یہ مذاکرات مایوس کن حالات میں ختم ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک قائداعظم محمد علی جناح ہندو مسلم مفاہمت کے لیے جدوجہد کرتے رہے لیکن اُن کو ہر مرحلہ پر مایوس ہونا پڑا۔ اس ضمن میں انہوں نے کانگریس کے تمام سرکردہ رہنماؤں سے مذاکرات کیے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس وزارتوں نے ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں پر عرصہ زندگی تنگ کردیا

اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا ملی۔ جناح نے نہرو کی توجہ اس جانب دلائی مگر وہ بھی جناح کے نقطۂ نظر پر توجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ وہ اگرچہ مسلم لیگ کو ایک اہم فرقہ پرست تنظیم تصور کرتے ہیں لیکن دیگر مسلمان تنظیموں کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔

اس صورتِ حال میں بھی جناح اپنے موقف پر قائم رہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب تک کانگریس مساوی بنیادوں پر لیگ کو تسلیم نہیں کرلیتی اور ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلہ میں مذاکرات پر آمادگی ظاہر نہیں کرتی اُس وقت تک ہندوستان کے مسئلہ کا آئینی حل ممکن نہیں۔ ۱۹۳۸ء میں جناح اور کانگریس کے نئے صدر سبھاش چندر بوس کے درمیان خط و کتابت کا تبادلہ ہوا لیکن یہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔

محمد علی جناح کے کانگریسی رہنماؤں سے مذاکرات اور کانگریسی حکمرانی والے صوبوں میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اس بات کا واضح ثبوت تھے کہ کانگریس مسلمانوں کے کسی مسئلہ کا حل کرنا نہیں چاہتی ہے۔ بہرحال جناح نے اس کے باوجود ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان مفاہمت کے امکان کو مسترد نہیں کیا۔ انہوں نے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو گاندھی کے نام ایک خط میں لکھا کہ ''وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی راہ نکالنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔'' لیکن کانگریس کے رہنما مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ و تیار نہیں تھے۔ اس صورتِ حال میں جناح کا حتمی ردِعمل یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہونا چاہیے۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک محمد علی جناح نے ابوالکلام آزاد، گاندھی، جواہر لال نہرو، سرتیج بہادر سپرو، راجندر پرشاد، راج گوپال اچاریہ، خضر حیات وغیرہ سے خط و کتابت اور مذاکرات کیے لیکن ہندو مسلم مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ راج گوپال اچاریہ نے ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کی مفاہمت کے لیے ایک فارمولا مرتب کیا۔

اگرچہ اس فارمولے کی شرائط مطالبۂ پاکستان کی روح کے منافی تھیں لیکن جناح نے ان شرائط پر ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی سے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی لیکن مذاکرات کے دوران گاندھی نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ جناح سے کانگریس کی جانب سے نہیں بلکہ ذاتی حیثیت میں ملاقات کر رہے ہیں۔ گاندھی نے یہ بھی کہا کہ وہ جناح کے اس خیال کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی ذاتی حیثیت میں ایک علیحدہ قوم ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قائداعظم محمد علی جناح کے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔

اگرچہ قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے ۲۷ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور ۱۹۴۰ء میں دوقومی نظریہ کی وضاحت کر چکے تھے لیکن انہوں نے اس مرحلہ پر گاندھی کو ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۴ء کو ایک خط میں واضح طور پر لکھا کہ ''ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کی رو سے ہندوستان میں مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنے خاص تہذیب وتمدن، زبان وادب، فنون وتعمیرات، اسم واصطلاحات، معیارِ قدر وتناسب، تشریحی قوانین، ضوابطہ اخلاق، رسم ورواج، نظامِ تقویم، تاریخ وروایات اور رجحانات وعزائم رکھتی ہے۔ غرض یہ کہ ہمارا ایک خاص نظریہ حیات ہے اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصور رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اُصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔''

ان مذاکرات کے دوران یہ بات بھی واضح طور پر سامنے آ گئی کہ گاندھی درحقیقت یہ چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت پہلے ہندوستان چھوڑے اس کے بعد ہندوستان کی تقسیم کے سوال پر غور کیا جائے۔ محمد علی جناح چونکہ گاندھی کے اس موقف کی تائید نہیں کر سکتے تھے اس لیے یہ مذاکرات ختم ہو گئے۔ لیکن محمد علی جناح کے کانگریسی رہنماؤں سے مذاکرات اور خط وکتابت سے یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ

ہندو مسلم مسئلہ کا حل دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تقسیمِ ہند میں مضمر ہے لہٰذا حکومت برطانیہ نے آنے والے برسوں میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے تقسیمِ ہند کو ناگزیر تصور کرلیا اور ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ بلاشبہ قائداعظم محمد علی جناح کی ایک ایسی کامیابی تھی جس نے اُن کو دنیا کے عظیم مدبروں کی صف میں کھڑا کردیا۔

قائداعظم کے خطوط کی اہمیت

بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی ۷۲ سالہ زندگی ایک مسلسل جدوجہد کی آئینہ دار ہے۔ اس جدوجہد کا مختلف کتابوں میں تاریخ کے اسکالرز نے سیر حاصل احاطہ کیا ہے اور اب تک قائداعظم کی حیات وخدمات پر متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بیشتر مصنفین نے اخباری مواد، سیاسی دستاویزات اور ذاتی مشاہدہ کی روشنی میں یہ کتابیں مرتب کی ہیں اور قائداعظم کے خطوط کو بہت کم استعمال کیا ہے، جبکہ قائداعظم کے خطوط ایک ایسا ذریعہ ہیں جن کی مدد سے قائد کی حیات وخدمات کو نہایت مفصل اور جامع انداز میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مشاہیر کے خطوط نہ صرف اپنے عہد کی سیاسی، معاشرتی، سماجی، عوامی اور اجتماعی صورت حال کے آئینہ دار ہوتے ہیں بلکہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے سیاسی وسماجی تدبر اور تاریخی شعور کے بھی عکاس ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی عہد یا شخص کی تاریخ یا سوانح کی ترتیب وتالیف میں مکتوبات یا خطوط کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف بھی اکثر وبیشتر کیا جاتا رہا ہے کہ مشاہیر کی حیات و خدمات کا تجزیہ کرنے اور اُن کو سمجھنے کے لیے مشاہیر کی تقاریر اور تصانیف سے زیادہ اُن کے خطوط اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ خطوط واقعی جذبات، حقیقی خیالات اور معیار اخلاق کا آئینہ ہوتے ہیں۔ بعض محققین نے تو مشاہیر کے خطوط کو بجائے خود ایک قابل غور

خودنوشتہ سوانح عمری سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اس لیے خطوط سے تاریخی اور سوانحی مواد سب سے زیادہ میسر آتا ہے۔ خطوط دراصل معاصر تاریخ کی ذاتی شہادت ہوتے ہیں، انسان یہ خطوط اپنی قلبی وارداتوں، مخصوص فکری رجحان اور ذہنی رویہ کے اشتراک عمل سے لکھتا ہے۔ اس لیے ان خطوط میں انسان کا پورا وجود بولتا ہوا نظر آتا ہے۔

برصغیر کی جدید تاریخ میں سیاسی خدمات کے اعتبار سے قائداعظم جس مقام و مرتبہ پر فائز ہیں وہ مقام و مرتبہ، اس خطہ میں کسی رہنما کو حاصل نہیں ہوا۔ فراست، راست گوئی، صبر وتحمل، خوداعتمادی، مقاصد اور مطمع نظر سے گہری وابستگی، استقامت، مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت، یہ تمام اوصاف قائداعظم کی فطرت ثانیہ بن گئے تھے۔ وہ ایک منطقی انسان تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کی تقاریر، بیانات اور خطوط نہ صرف جذباتیت اور اشتعال سے عاری ہیں بلکہ ایک مخصوص سنجیدگی اور فکری توازن کے طابع ہیں۔

قائداعظم کو علم تھا کہ مسلمانوں کو ایک واضح نصب العین پر متحد و منظم کرنے کے لیے ان کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ ان رکاوٹوں میں ایک بڑی رکاوٹ مخالف پریس تھا جس کا رویہ ابتدا ہی سے شرپسندانہ تھا۔ وہ کوئی ایسی بات مسلمانوں تک پہنچنے ہی نہیں دیتا تھا جو ان میں اتحاد و تنظیم کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کر سکے۔ قائداعظم نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے جہاں ایک مضبوط مسلم پریس کے قیام پر توجہ دی وہاں انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے مسلم لیگی رہنماؤں، کارکنوں اور عام افراد سے بڑے پیمانے پر خط و کتابت کا آغاز کیا۔ یہ خط و کتابت قائداعظم کے لیے اپنی بات عوام تک پہنچانے کا ایک موثر ذریعہ بن گئی۔

مسلمانوں میں خطوط کو تبلیغ و اشاعت، رہنمائی اور دعوت کا وسیلہ بنانے کا رجحان ظہورِ اسلام کے ساتھ عام ہوا۔ خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے اسلام کی تبلیغ کے لیے خطوط کو وسیلہ بنایا اور مختلف سربراہانِ مملکت وقبائل کے

سرداروں کو خطوط لکھے۔ پھر اس سنت پر خلفاء راشدین، اولیائے اُمت، فقہائے ملت اور مسلمان حکمرانوں نے عمل کیا۔ اسلامی تاریخ میں ایسے خطوط کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جو دعوت، اصلاح، تربیت اور مکتوب نگار کے موقف کی تشہیر کا شاہکار ہیں۔

برصغیر میں بھی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین نے اس سنت اسلاف پر عمل کیا مگر اس خطہ میں قائداعظم کے سوا کسی اور سیاسی شخصیت یا رہنما نے اپنے پیغام کو عام کرنے، رائے عامہ کو اس پیغام کے حق میں ہموار کرنے اور ایک تحریک میں اُن کو عملی طور پر شریک کرنے کے لیے تسلسل کے ساتھ اور منظم اور موثر انداز میں نہ تو خط و کتابت کی اور نہ ہی خط و کتابت کو اپنی سیاسی حکمت عملی کا حصہ بنایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید احمد خان، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، بہادر یار جنگ وغیرہ نے جو خط و کتابت کی ہے وہ باہمی تبادلہ خیال کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُس کا مقصد کسی خاص سیاسی پروگرام کی ترویج و اشاعت نہیں البتہ یہ خط و کتابت ایک قومی مقصد کی جانب پیش رفت میں معاون ضرور ثابت ہوئی ہے۔

برصغیر کے بزرگانِ دین اور علماء سلف میں مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط ایک خاص مقصد کے طابع ہیں۔ اگرچہ ان خطوط کی بھی مجموعی نوعیت علمی و مذہبی ہے لیکن ان خطوط کے مندرجات اپنے عہد کے تاریخی واقعات اور حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ خصوصاً مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے مکتوبات کا ایک بڑا حصہ اُس عہد کے تاریخی عمل کا غماز ہے۔

بیسویں صدی میں اگرچہ وسائل کی فراوانی کی بنا پر خط و کتابت کو خاص فروغ حاصل ہو گیا تھا اور تقریباً تمام مذہبی اور سیاسی رہنماؤں نے خط و کتابت کی ہے جو اردو

اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے لیکن قائداعظم محمد علی جناح کی تمام تر خط و کتابت انگریزی زبان میں ہونے کے باوجود اس میں جہاں مشرقی اخلاقیات موجود ہیں۔ وہاں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت اُن کی خط و کتابت کے آئینہ میں اپنی تمام تر سیاسی توانائیوں اور حکمتِ عملی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق قائداعظم نے صرف ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ میں یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو اور تحریکِ پاکستان کے دوران چار ہزار سے زائد خطوط لکھے ہوں گے۔ اگرچہ قائداعظم کے خطوط کی خاصی بڑی تعداد، قائداعظم پیپر سیل، فریڈم موومنٹ آرکائیوز، شمس الحسن کلیکشن، نشتر کلیکشن اور M.A. Jinnah-Ispahani Correspondence (1936-1948) میں موجود ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی خطوط کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو مختلف نجی ذخائر میں موجود ہیں یا جو دست بردِ زمانہ سے تلف یا ضائع ہو گئے ہیں۔

قائداعظم کے ایک پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید کا بیان ہے کہ ”قائداعظم خطوط کے جوابات فوری طور پر دے دیتے تھے۔ وہ روزانہ اپنی ڈاک دیکھتے اور شاید ہی کوئی خط ایسا ہو جس کا جواب نہ دیتے ہوں۔ وہ فرماتے تھے کہ خط کا جواب دینا میرے فرائضِ قومی میں شامل ہے۔ قائداعظم ہر روز تقریباً پندرہ بیس خطوط کا جواب دیا کرتے تھے۔ میں نے دورانِ ملازمت یعنی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک بحیثیت پرائیویٹ سیکریٹری تقریباً دو ہزار سے زائد خطوط کے جوابات ٹائپ کیے تھے جبکہ تحریکِ پاکستان کی مقبولیت میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس تعداد میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔“

قائداعظم کے پاس دسمبر ۱۹۳۷ء سے جون ۱۹۴۰ء تک بحیثیت اسٹینوگرافر خدمات انجام دینے والے جناب مجاہد حسین کا کہنا ہے کہ ”قائداعظم۔ خط الف سے

بے تک لکھوایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آخر میں اپنا نام 'ایم اے جناح' بھی بولا کرتے تھے۔ تلفظ صحیح اور لہجہ ٹھیٹھ انگریزی تھا۔ جس جس خط کا جواب لکھاتے جاتے میرے حوالے کرتے جاتے۔ بعض خطوط بہت تھرڈ کلاس ہوتے تھے جن کو اگر میرا بس چلتا تو پھاڑ کر پھینک دیتا۔ مگر اسے قیادت عظمیٰ ہی کہیے کہ وہ ہر خط کا جواب دیتے اور بعض اوقات ایسا جواب دیتے کہ میں اُسے ٹائپ کر کے بار بار پڑھتا اور اُس خط سے ملا کر دیکھتا جس کا وہ جواب ہوتا تھا کہ کہیں غلط تو نہیں ٹائپ ہو گیا۔ یہ بات میں نے قائداعظم کے علاوہ آج تک کسی میں بھی نہیں دیکھی۔''

ان حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم نے خط و کتابت کو بھی حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد کا ایک موثر وسیلہ بنا دیا تھا۔ قائداعظم کی یہ خط و کتابت بیسویں صدی کے محکوم ہندوستان کے سیاسی ارتقا کی تاریخ ہے۔ اس سے جہاں برطانوی عمال کے رویہ اور ہندو مسلم مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے وہاں اُس جوش و جذبہ کا بھی اظہار ہوتا ہے جو حصولِ پاکستان کے لیے اسلامیانِ ہند کے دلوں میں موجزن تھا۔ یہ خط و کتابت جہاں ایک طرف قائداعظم کی سیاسی حکمت عملی، آپ کے تدبر، قوت فیصلہ اور سیاسی بصیرت کی آئینہ دار ہے وہاں دوسری طرف قائداعظم کی اصول پسندی، خوش طبعی، اخلاق اور عمومی رواداری کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں اور نرم و ملائم الفاظ میں قائداعظم نے ان خطوط میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط کا مطالعہ کرنے والا کہیں الجھتا نہیں اور قائداعظم کی بات اُس کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

قائداعظم چونکہ ایک مایہ ناز وکیل بھی تھے اور وہ تحریکِ پاکستان کے دوران خود کو اسلامیانِ ہند کا وکیل کہا کرتے تھے اس لیے وہ جانتے تھے کہ اُن کا نجی یا عوامی کوئی بھی عمل ایسا نہ ہو جو مسلمانوں کے اس مقدمہ کی کارروائی پر منفی اثرات مرتب کرے۔ چنانچہ آپ نے اپنی تقاریر، بیانات، مذاکرات اور خط و کتابت میں بھی کوئی

ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس کو فریقِ مخالف اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکے۔ قائداعظم کے خطوط رسمی، تمہیدی اور مروجہ اختتامی کلمات سے بھی عاری ہوتے تھے۔ ہر خط میں آپ فوری طور پر ہی اُس مقصد، موضوع اور مسئلہ کے بیان پر آ جاتے ہیں جو خط لکھنے کا باعث ہوتا تھا۔ آپ مکتوب الیہ کو حقائق و دلائل سے قائل کرتے تھے اور اس ضمن میں کسی قسم کی رعایت اور مروّت سے کام نہیں لیتے تھے۔ دوٹوک اور کھری بات کرنا آپ کا امتیاز تھا۔ آپ کی تمام خط و کتابت آپ کی سچائی اور صاف گوئی کی مظہر ہے۔

اگرچہ قائداعظم نے نجی نوعیت کی خط و کتابت بہت کم کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے بعض خطوط نجی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یعنی ان خطوط سے قائداعظم کی سیاسی جدوجہد کے علاوہ نجی مصروفیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس قسم کے خطوط قائداعظم کی سوانح کی تصنیف میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قائداعظم کے خطوط کا ایک اور وصف مختصر نویسی یعنی 'ایجاز' ہے۔ اس لیے آپ کے خطوط کا ایک ایک لفظ معنیٰ اور مقصدیت سے بھرپور ہے۔ بعض خطوط تفصیلی ہیں لیکن اُن میں بھی واقعات کے بیان میں اختصار نے تفصیل کی ثقالت کو ختم کر دیا ہے اور ان خطوط کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔

قائداعظم کی تمام خط و کتابت انگریزی میں ہے۔ سوائے اُن چند خطوط کے جو مختلف افراد نے قائداعظم کو اردو میں لکھے ہیں۔ ان خطوط میں قائداعظم کا ایک خط ایسا بھی ہے جو انگریزی میں ہے لیکن اُس کے نیچے قائداعظم نے اردو میں دستخط کیے ہیں۔ قائداعظم کے یہ خطوط یقیناً ہمارا قومی، ملی اور ثقافتی سرمایہ ہیں۔ نہ صرف ان کی حفاظت کرنا ہمارا فریضہ ہے بلکہ ان خطوط سے رہنمائی حاصل کرنا بھی محسن شناسی کی ایک واضح دلیل ہے۔

قائداعظم کی دستاویزات

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی تاریخ ساز شخصیت اور قیامِ پاکستان کی تاریخ گزشتہ ستر سال سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر عوام وخواص میں جاذبِ نظر، پرکشش اور حیرت انگیز رہی ہے۔ خصوصاً قائداعظم کی شخصیت جو تحریک پاکستان سے لازم وملزوم ہوگئی تھی مصنفین ومحققین کے لیے توجہ کا مرکز رہی۔ ان کی سیاسی جدوجہد، قیادت کے انداز، آزادیٔ فکر، قوتِ استدلال، مسحور کن اندازِ خطابت، حاضر جوابی معقولیت پسندی، آئینی حکمتِ عملی، اصولوں کی پاسداری، مستقبل شناسی، تدبر فراست، عوامی امنگوں کی ترجمانی، آہنی عزم، مقصد سے گہرا لگاؤ، بے مثل سیاسی بصیرت، ضبط وتحمل، راست گوئی، قیامِ پاکستان کے لیے انتھک کوشش اور پراستحکام پاکستان کے لیے منصوبہ بندی، یہ تمام ایسے موضوعات ہیں جن پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن اس کے باوجود یہ موضوعات ابھی تشنۂ تحقیق وتشریح ہیں۔ اس صورتِ حال کی جہاں دیگر وجوہات رہی ہیں وہاں ایک واضح وجہ یہ بھی ہے کہ قائداعظم اور تحریکِ پاکستان سے متعلق بیشتر دستاویزات اور کاغذات قیامِ پاکستان کے بعد بہت تاخیر سے منظرِ عام پر آئے لہٰذا نہ صرف مستند تاریخ نویسی کا عمل متاثر ہوا بلکہ واقعاتی افراط وتفریط کی شکایت بھی عام ہوئی اور غیر مستند ماخذ وذرائع پر مبنی ایسی کتابیں اور تفصیلات سامنے آئیں جو آج بھی استناد سے محروم ہیں۔ اس صورتِ حال نے جہاں بدگمانیوں اور شکوک وشبہات کو راہ دی وہاں ایک تفہیمی خلاء بھی پیدا ہوا۔ ایسا

خلا جس نے ماضی کی تاریخ کو حال کے شب وروز سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیا۔

ادھر پچاس سال کے دوران ہندوستان کی جدوجہد آزادی، تحریکِ پاکستان اور قائداعظم سے متعلق تاریخی دستاویزات اور کاغذات کے جو بڑے ذخائر منظر عام پر آئے ان میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پیپرز، ٹرانسفر آف پاور والیومز، سرونسٹن چرچل پیپرز، ویول جرنل، قائداعظم پیپرز، شمس الحسن کلیکشن، آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ، گورنر جنرل پیپرز، نشتر کلیکشن، سرعبداللہ ہارون کلیکشن، کلکٹیڈ ورکس آف گاندھی، نہرو پیپرز، پٹیل پیپرز، راجندر پرشاد کرسپانڈنس، سپرو پیپرز، سلیکٹڈ ورکس آف ایم این رائے، جناح اصفہانی کرسپانڈنس، سریامین خان کلیکشن اور میاں عبدالعزیز کلیکشن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ذخائر کے منظر عام پر آنے کے بعد تحریکِ پاکستان اور قائداعظم کی حیات وخدمات کے نہ صرف متعدد گوشے اُجاگر ہوئے بلکہ ان کی مزید تشریح کی بھی گنجائش پیدا ہوگئی۔

قائداعظم اور تحریک پاکستان کے بارے میں بااعتبار دستاویزات آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ، قائداعظم پیپرز اور شمس الحسن کلیکشن میں زیادہ دستاویزات موجود ہیں۔ ٹرانسفر آف پاور پیپرز اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن پیپرز میں بھی اس ضمن میں اہم دستاویزات شامل ہیں لیکن ان دستاویزات میں سرکاری نکتہ نظر موجود ہے اور مذکورہ بالا ذخائر متعلقہ فریق کے نکتہ نظر کے آئینہ دار ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے ریکارڈز سے جماعتی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے جبکہ شمس الحسن کلیکشن اور قائداعظم پیپرز میں موجود خطوط، دستاویزات اور بعض اہم کاغذات سے قائداعظم کی نجی، عوامی اور سیاسی زندگی سے متعلق معلومات سامنے آتی ہیں۔ گورنر جنرل پیپرز اُس جدوجہد پر روشنی ڈالتے ہیں جو قائداعظم نے پاکستان کے استحکام کے لیے کی۔ اہم اور عظیم شخصیات وتحریکات سے متعلق خطوط اور دستاویزات کی ایک مستقل تاریخی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ دستاویزات معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہوتی ہیں۔ ان کی حیثیت ایک تاریخی

شہادت کی سی ہوتی ہے اور یہ ماضی کے تجربات کی روشنی میں مستقبل کی منصوبہ بندی میں معاون ومددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں اپنی تاریخی دستاویزات اور کاغذات کی مناسب اور صحیح انداز میں نگہداشت اور حفاظت کرتی ہیں ان کا تاریخی پس منظر کبھی ماند نہیں پڑتا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ، قائداعظم پیپرز، گورنر جنرل پیپرز اور شمس الحسن کلیکشن ہمارا تاریخی ورثہ ہیں۔ ہماری قومی جدوجہد کا آئینہ ہیں۔ ہماری قومی شناخت ہیں اور ان کی مناسب دیکھ بھال اور حفاظت ہماری قومی ذمہ داری ہے۔ ان خطوط اور دستاویزات کے مندرجات سے واقفیت اور آگہی حاصل کرنے سے ہمارا قومی شعور بالیدہ اور مستحکم ہوتا ہے۔

قائداعظم پیپرز کے نام سے قائداعظم کے ذاتی دستاویزات و کاغذات پر مشتمل جو ذخیرہ معروف ہے وہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد سے ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل میں تھا اور جولائی ۱۹۶۷ئ ءمیں محترمہ فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد ان کی ذاتی رہائش گاہ موہاٹہ پیلس سے برآمد ہوا۔ اس ذخیرہ میں تقریباً ایک لاکھ سے زائد کاغذات شامل ہیں جو قائداعظم کے زمانہ طالب علمی سے لے کر ان کے انتقال تک کے عرصہ سے متعلق معلومات پر محیط ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد وزارتِ تعلیم نے قائداعظم پیپرز سیل قائم کیا جس کے تحت ایک مشاورتی کمیٹی کی نگرانی میں ان کاغذات ودستاویزات کی ترتیب اور موضوعاتی درجہ بندی کا کام شروع کیا گیا۔ مشاورتی کمیٹی میں وفاقی سیکریٹریز کے علاوہ مختلف جامعات کے وائس چانسلرز ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام اور سید شریف الدین پیرزادہ بھی شامل تھے۔ قائداعظم پیپرز سیل پہلے وزارتِ تعلیم کی نگرانی میں کام کرتا رہا بعد میں وزارتِ ثقافت کی نگرانی میں آ گیا اور دستاویزات کا یہ ذخیرہ اب ڈپارٹمنٹ آف نیشنل آرکائیوز، اسلام آباد، میں موجود ہے۔

قائداعظم سے متعلق ان خطوط، دستاویزات اور کاغذات کی ترتیب، موضوعاتی درجہ بندی، شناخت اور تدوین ایک دشوار ترین کام تھا جسے قائداعظم پیپرز سیل نے بحسن وخوبی انجام دیا اور اب تک تقریباً ۱۳۶۵ ارعنوانات کے تحت ان کاغذات و دستاویزات کی موضوعاتی ترتیب مکمل ہو چکی ہے۔ مزید برآں ان تمام کاغذات و دستاویزات کی نہ صرف مائیکروفلم بن چکی ہے بلکہ ان کی توضیحی فہرستیں بھی کتابی صورت میں شائع کی جا چکی ہیں۔ ان فہرستوں کی تعداد پانچ ہے اور یہ مجموعی طور پر تقریباً ۲۶۵ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان پیپرز میں قائداعظم کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو سے متعلق دستاویزات و کاغذات موجود ہیں۔ یہ پیپرز عام استفادہ کے لیے ۱۹۷۴ء میں کھول دیئے گئے تھے اور اس وقت سے اب تک۔ بے شمار اسکالرز ان سے استفادہ کر چکے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مسلم لیگی رہنماؤں، کارکنوں اور غیر مسلم لیڈروں کے ساتھ ہونے والی خط و کتابت کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس سے اسکالرز نے ابھی تک قابلِ ذکر استفادہ نہیں کیا۔ قائداعظم پیپرز سے اگر بھرپور استفادہ کیا جائے تو یہ نہ صرف قائداعظم کی حیات وخدمات کے مزید نئے گوشے اجاگر ہوں گے بلکہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں بھی نئی معلومات کا گرانقدر اضافہ ہوگا۔

قائداعظم کی سیاسی خط و کتابت کے علاوہ ان پیپرز میں قائداعظم کی جائیدادوں، شیئرز کی خرید وفروخت، بنک اکاؤنٹس، انشورنس پالیسیوں کے کاغذات، وکالت سے متعلق نوٹس اور کاغذات، دعوت نامے، تہنیت نامے، سیر و سیاحت اور بیرون ملک سفر سے متعلق کاغذات، ڈائریاں، نوٹ بکیں اور فوٹوگراف وغیرہ کی کثیر تعداد موجود ہے۔ ان کاغذات کے مطالعہ سے جہاں قائداعظم کے روز و شب کی مصروفیتوں پر روشنی پڑتی ہے وہاں قائداعظم کے مزاج، عادات و اطوار اور مختلف ادوار میں ان کی خرید وفروخت میں پسند و ناپسند کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قائداعظم سے متعلق دستاویزات کے ذخائر میں قائداعظم پیپرز اپنی تعداد اور موضوعاتی تنوع کے

اعتبار سے سب سے زیادہ اہم، معلومات افزا، وقیع اور خصوصی کشش کے حامل ہیں۔

قائداعظم پیپرز کی موضوعاتی ترتیب وتعین کے بعد ان کی مرحلہ وار اشاعت ایک اہم ترین کام تھا۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے نیشنل آرکائیوز آف پاکستان کی عمارت میں قائداعظم پیپرز پروجیکٹ کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا، جس کا نگراں بین الاقوامی طور پر معروف محقق اور تاریخ داں ڈاکٹر زوار حسین زیدی کو مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر زیدی نہ صرف جنوبی ایشیا کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے، بلکہ اس خطہ میں موجود بیشتر دستاویزی ریکارڈ سے بھی کماحقہ واقف تھے۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ تک انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ریکارڈ پر بھی تحقیق کی تھی۔ مزید یہ کہ تحریکِ پاکستان کے رہنما مرزا ابوالحسن اصفہانی اور قائداعظم محمد علی جناح کے درمیان ہونے والی طویل ترین خط و کتابت کو بھی انہوں نے *M.A. Jinnah-Ispahani Correspondence (1936-1948)* کے نام سے مرتب کیا تھا۔

ڈاکٹر زوار حسین زیدی نے قائداعظم پیپرز میں شامل ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء سے ۲ جون ۱۹۴۷ء تک کی دستاویزات پر کام شروع کیا اور ۱۹۹۳ء میں انہوں نے ایک نہایت وقیع اور جامع کتاب *Jinnah Papers - Prelude to Pakistan* شائع کی۔ یہ کتاب تقریباً دو جلدوں میں پونے دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

قائداعظم پیپرز پروجیکٹ ابتداً کیبنٹ ڈویژن کی نگرانی میں کام کرتا رہا پھر ۲۵ مئی ۲۰۱۵ء کو اسے قائداعظم اکادمی میں ضم کر دیا گیا۔ فی الوقت یہ نیشنل ہسٹری اینڈ لٹریری ہیری ٹیج ڈویژن، اسلام آباد کے زیر انتظام آ گیا ہے اور قائداعظم اکادمی کے اسلام آباد میں سب آفس کے طور پر موجود ہے۔ اس ادارے سے قائداعظم پیپرز میں موجود دستاویزات پر مشتمل ۱۸ر جلدیں انگریزی میں اور

جلدیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں، جو کئی ہزار صفحات پر مبنی ہیں۔ یہ ایک اہم ترین قومی نوعیت کا تحقیقی کام ہے جو مسلسل جاری ہے اور قائداعظم کی حیات وخدمات اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں کے لیے بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ سے مراد وہ کاغذات و دستاویزات ہیں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسوں اور دفتر سے ہونے والی تنظیمی کارروائیوں سے متعلق ہیں۔ یہ ریکارڈ اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس سے بیسویں صدی کے نصف اول میں اسلامیانِ ہند کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں، جدوجہد اور ماحصل سے متعلق تفصیلات ومعلومات سامنے آتی ہیں۔ یہ ریکارڈ مسلم رجال کے اعتبار سے بھی تاریخی ہے کیونکہ اس سے ان شخصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام، اس کی تنظیم اور مختلف تحریکات میں اہم اور موثر کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ قیام پاکستان تک یہ ریکارڈ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر واقع دہلی میں موجود تھا لیکن قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی اس ریکارڈ کو بحفاظت کراچی منتقل کیا گیا۔ پاکستان میں ابتداً یعنی ۱۹۵۸ء تک یہ ریکارڈ پاکستان مسلم لیگ کے مرکزی دفتر میں بوریوں اور صندوقوں میں بند پڑا رہا۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کی بنا پر جب ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دیا گیا تو اس ریکارڈ کو پاکستان مسلم لیگ کے آفس سے ایک سرکاری دفتر میں منتقل کر دیا گیا۔ اگرچہ اس ریکارڈ کی ابتدا ہی سے مناسبت دیکھ بھال اور حفاظت کی جانا چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں ہوسکا اور اس ریکارڈ کے کچھ حصے دست بردِ زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو گئے۔ خصوصاً پاکستان مسلم لیگ کے دفتر سے ایک سرکاری دفتر کی چھت پر اس کی منتقلی بہت نقصان دہ ثابت ہوئی، دھوپ، برسات اور موسم کے گرم وسرد نے اس ریکارڈ کو شدید متاثر کیا۔ یہ ایک قومی زیاں تھا جس کا چند ہمدردانِ قوم اور تاریخ دانوں کو شدت سے احساس تھا لہٰذا انہوں نے اس وقت کے

وزیر خارجہ بیرسٹر منظور قادر سے رابطہ قائم کر کے اس ریکارڈ کو پاکستان سیکریٹریٹ کے ایک محفوظ بلاک میں منتقل کرا دیا۔ اس ریکارڈ کی حفاظت میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر زوار حسین زیدی نے نہ صرف موثر کردار ادا کیا بلکہ بعد میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کوششوں سے جو اس زمانہ میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر تھے یہ ریکارڈ کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ ریکارڈ جب جامعہ کراچی پہنچا تو نہایت بوسیدہ حالت میں تھا اس لیے جامعہ کراچی کی لائبریری کی عمارت میں ہی اس ریکارڈ کی حفاظت، مرمت، ترتیب اور شناخت کے لیے ایک علیحدہ شعبہ 'فریڈم موومنٹ آرکائیوز' کے نام سے قائم کیا گیا جو گزشتہ نصف صدی سے اس ریکارڈ کی ترتیب و تحفظ کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے مذکورہ ریکارڈ کی حفاظت کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے چیئرمین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور سیکریٹری پروفیسر شریف المجاہد تھے۔ کمیٹی کے ارکان میں ڈاکٹر محمود حسین، پروفیسر اے بی اے حلیم، ڈاکٹر زوار حسین زیدی، ڈاکٹر ریاض الاسلام، ڈاکٹر ایم ایچ صدیقی اور ڈاکٹر عبدالمعید شامل تھے۔ اس کمیٹی کی نگرانی میں اہلِ علم کی ایک جماعت نے جن میں ڈاکٹر زوار حسین زیدی، ڈاکٹر ریاض الاسلام، ڈاکٹر ایم ایچ صدیقی شامل تھے ۱۲۳ ر بوریوں اور ۴۶ صندوقوں میں بھرے ہوئے ریکارڈ کی ترتیب، مرمت، حفاظت اور نگہداشت کا کام شروع کیا۔ خصوصاً گزشتہ چار عشروں کے دوران میں ڈاکٹر ریاض الاسلام، ڈاکٹر ایم ایچ صدیقی اور عقیل الظفر خان نے اس ریکارڈ کی ترتیب و تحفظ کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی تھیں وہ ناقابلِ فراموش اور علم دوستی کی نادر مثال ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس ریکارڈ میں دستاویزات، خطوط، رپورٹس، تصاویر، اشتہارات، اخبارات کے تراشے، کتابچے، پمفلٹ، تقاریر کے مجموعے اور مختلف موضوعات پر کتابوں کی تعداد ۵ لاکھ صفحات سے زائد ہے۔ فریڈم موومنٹ آرکائیوز نے اب تک

ایک لاکھ سے زائد خطوط، دستاویزات اور کاغذات کو چھ سو فائلوں میں مرتب کر دیا ہے جبکہ باقی ماندہ ریکارڈ پر ڈاکٹر ایم ایچ صدیقی کی نگرانی میں عقیل الظفر خان اور مہتاب جہاں نے کام کیا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اس ریکارڈ پر بہت تاخیر سے کام شروع ہوا اور اس کا بیشتر حصہ عدم توجہی کی بنا پر تلف ہو گیا لیکن اس کے باوجود تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کے ضمن میں یہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اہم تاریخی ریکارڈ ہے۔

پروفیسر شریف المجاہد نے جو ۱۹۷۶ء میں قائداعظم اکادمی کے بانی ڈائریکٹر مقرر ہوئے تھے ۱۹۸۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ کی طباعت کا بیڑا اٹھایا۔ ریکارڈ کی طباعت کا خیال دراصل اس لیے آیا کہ ۱۹۸۰ء تک آل انڈیا مسلم لیگ سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں اور پی ایچ ڈی کے مقالوں میں اس ریکارڈ سے بہت کم استفادہ کیا گیا تھا۔ پروفیسر شریف المجاہد نے لکھا ہے کہ "سید شریف الدین پیرزادہ نے آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ سے اپنی کتاب *Foundations of Pakistan* مطبوعہ ۱۹۶۹ء میں استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان کی بھی رسائی انہی دستاویزات تک ہو سکی جو اس ریکارڈ میں مطبوعہ صورت میں موجود تھیں۔ ۱۹۷۹ء میں ایم اے زیدی کی مرتبہ کتاب *Evolution of Muslim Political Thought in India* چھ جلدوں میں دہلی سے شائع ہوئی لیکن اس میں بھی مذکورہ ریکارڈ میں شامل ان ہی مطبوعہ دستاویزات کو شامل کیا گیا جو قبل ازیں سید شریف الدین پیرزادہ کی مذکورہ بالا کتاب میں شائع ہو چکی تھیں۔ ۱۹۷۹ میں ہی بی این پانڈے کی مرتبہ کتاب *The Indian Nationalist Movement (1885-1947)* لندن سے شائع ہوئی اور پانڈے بھی کوئی غیر مطبوعہ خط یا دستاویز اپنی کتاب میں شامل کرنے میں ناکام رہے۔ ۱۹۸۰ء میں میرٹھ سے شان محمد کی سات جلدوں پر مشتمل کتاب *The Indian Muslim: A*

Documentary Record of Muslim Struggle for Independence شائع ہوئی اس میں بھی آل انڈیا مسلم لیگ سے متعلق کوئی غیر مطبوعہ دستاویز شامل نہیں تھی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا ریکارڈ ب آسانی دستیاب نہیں تھا۔ اس سے ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کا موقف واضح اور مدلل طور پر مطبوعہ کتب میں نہ آسکا اور یکطرفہ تاریخی یا ذاتی شہادتوں کے انبار لگ گئے۔''

آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ کے طباعتی منصوبے کے آغاز پر قائداعظم اکادمی کے عملہ پر مشتمل ایک ریسرچ ٹیم نے پروفیسر شریف المجاہد کی نگرانی میں اس ریکارڈ میں شامل خطی دستاویزات کی شناخت، تعین اور مطالعہ کا کام شروع کیا۔ ان دستاویزات میں زیادہ تر خطوط، اجلاسوں کی کارروائیاں اور قراردادیں شامل تھیں۔ ریسرچ ٹیم نے اس ریکارڈ کی فوٹو کاپی کر کے دستاویزات کو اس مرحلہ تک پہنچایا جہاں ان کی باقاعدہ تدوین کا کام شروع ہو سکے۔ اس ریکارڈ کی طباعت چونکہ کئی جلدوں پر مشتمل ہونا تھی اس لیے پہلی جلد کو ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۸ء تک کی دستاویزات تک محدود کر دیا گیا جو ۱۹۹۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہو گئی۔ پروفیسر شریف المجاہد نے اس جلد میں ریکارڈ میں شامل تمام بنیادی، ذیلی اور الحاقی دستاویزات شامل کر دیں جبکہ بعض دستاویزات کو وقیع اور خود وضاحتی بنانے کے لیے ضمیمہ جات میں ایسی دستاویزات بھی شامل کر دی گئیں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے ریکارڈ میں موجود نہیں تھیں۔ شریف المجاہد کی تالیف کردہ اس کتاب کا نام *Muslim League Documents* ہے۔ اگرچہ اس کتاب کی ابھی تک پہلی جلد شائع ہوئی ہے لیکن باور کیا جاتا ہے کہ مسلم ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے بارے میں اس کتاب کی آئندہ جدول کی تکمیل کے بعد یہ ایک اہم بنیادی کتاب ثابت ہوگی۔

شمس الحسن کلیکشن میں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکریٹری سید شمس الحسن کے نام سے منسوب ہے، اس میں قائداعظم محمد علی جناح کے تقریباً دس ہزار ذاتی کاغذات اور دستاویزات موجود ہیں۔ اس ذخیرے کو بھی بہ اعتبار موضوع تقریباً نوے جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس ذخیرے سے بھی اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ کیا ہے، جبکہ خود سید شمس الحسن نے اس ذخیرے سے قائداعظم کی نجی زندگی اور تنظیمی جدوجہد کے بارے میں کچھ دستاویزات منتخب کر کے ۱۹۷۶ء میں ایک کتاب *Plain Mr. Jinnah* مرتب کی تھی۔ سید شمس الحسن چونکہ تحریکِ پاکستان کے عینی شاہد تھے، اس لیے انہوں نے کتاب میں شامل دستاویزات کی وضاحت اور صراحت میں نوٹس بھی تحریر کیے ہیں، جو بہرحال تحریکِ پاکستان اور قائداعظم کے بارے میں کچھ جاننے کے خواہش مند افراد کے لیے معلومات افزا ہیں۔

شمس الحسن کلیکشن، قائداعظم پیپرز اور آل انڈیا مسلم لیگ ریکارڈ کے علاوہ قائداعظم اور تحریکِ پاکستان سے متعلق غیر مطبوعہ خطوط و کاغذات کی ایک بڑی تعداد پاکستان، بھارت، برطانیہ اور سری لنکا وغیرہ میں بھی انفرادی طور پر مختلف لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ ان خطوط و کاغذات کی بازیافت کے لیے ڈپارٹمنٹ آف نیشنل آرکائیوز برابر کوشش کر رہا ہے اور اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ دراصل یہ کاغذات اور دستاویزات ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔ ہماری جدوجہد کا تاریخی ریکارڈ ہیں، ان سے نہ صرف قائداعظم محمد علی جناح کی حیات و خدمات کے پنہاں و پیدا گوشوں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی ایک علیحدہ وطن کے قیام کے لیے جدوجہد کے بھی بیشتر تشنہ و مخفی پہلو واضح اور اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کاغذات اور دستاویزات کی حفاظت کرنا اور ان کے مندرجات سے واقفیت حاصل کرنا ہمارے قومی فرائض میں شامل ہے۔

قائداعظم اور مسلم اخبارات

قائداعظم محمد علی جناح کی حیات و خدمات اور تحریکِ پاکستان کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح ایک مکمل سیاستدان تھے۔ آپ اپنے مقاصد سے نہ صرف پوری طرح آگاہ تھے بلکہ آپ کو ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک موثر لائحہ عمل بنانے پر بھی قدرت اور کمال حاصل تھا۔ آپ کی شخصیت پہلودار اور ہمہ گیر تھی۔ فتح و نصرت ہر گام پر آپ کے لیے فرش راہ رہتی تھی۔ آپ کی طویل اور انتہائی مصروف سیاسی زندگی میں آپ کو بے شمار کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن بلاشبہ پاکستان کا قیام آپ کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور اسی کامیابی نے آپ کو بین الاقوامی تناظر میں ایک جامع اور مکمل معمارِ قوم ثابت کیا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۴ء میں ازسرِ نو مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی اور اس کی تنظیمِ نو کی جانب بھرپور توجہ دی۔ اسی دوران آپ کو شدت سے اس امر کا احساس ہونے لگا کہ جب تک دو قومی نظریہ کے حامی اخبارات کو فروغ حاصل نہیں ہوگا مسلمانوں کی تمام کاوشیں صدا بصحرا ہی رہیں گی۔ ویسے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں مسلم اخبارات شائع ہو رہے تھے اور انہوں نے اس دور میں بڑی موثر خدمات بھی انجام دی تھیں لیکن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ تک ان میں سے اکثر اخبارات یا تو بند ہو چکے تھے یا پھر اُن کی آواز دب چکی تھی۔ اس دور میں جن مسلم اخبارات نے ہندوستان کی سیاست میں مسلم کاز

کے لیے موثر اور اہم کردار ادا کیا اُن میں 'پیسہ اخبار' لاہور، 'روزنامہ زمیندار' لاہور، 'ہمدرد' دہلی، 'اردوئے معلّٰی' علی گڑھ، 'احسان' لاہور، 'مسلم گزٹ' کلکتہ، 'روزنامہ خلافت' بمبئی، 'روزنامہ سرحد' پشاور اور 'سندھ زمیندار' سکھر کے نام شامل ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح کو ۱۹۳۷ء کے انتخابات اور آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کے دوران یہ احساس ہوا کہ سرکاری اور ہندو پریس نہ صرف اپنے مقاصد کے لیے سرگرمِ عمل ہے بلکہ اُس کا مسلم سیاست کی جانب سے رویہ نہایت معاندانہ ہے۔ وہ نہ صرف مسلم کاز کو نقصان پہنچانے پر ہمہ وقت آمادہ تیار رہتا ہے بلکہ عمداً ایسے حربے استعمال کرتا ہے جس سے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار، بدامنی اور بداعتمادی پیدا ہو۔ خصوصاً ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجہ میں ہندوستان کے گیارہ میں سے سات صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہونے کے بعد تو مسلم پریس بالکل ہی بے دست و پا ہو گیا تھا۔ بیشتر اخبارات کے خلاف مقدمات قائم کئے گئے۔ صحافیوں کو قید اور جرمانے کی سزا دی گئی اور ضمانتیں طلب کی گئیں۔ یوں بھی آل انڈیا مسلم لیگ کی جدوجہد کے نتیجے میں ہندوستان کی مجموعی سیاسی صورت حال میں جو تبدیلی آئی تھی اُس سے یہ بات کسی حد تک طے ہو گئی تھی کہ ہندوستان میں مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور اُن کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ ہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قراردادِ پاکستان کی منظوری نے اس حقیقت کو مزید روشن کر دیا اور یہ طے پا گیا کہ ہندوستان کی سیاسی تقدیر تین طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک برطانوی حکومت، دوسرے انڈین نیشنل کانگریس اور تیسرے آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرکاری اور ہندو اخبارات اپنا کام کر رہے تھے۔ انہوں نے موثر مسلم پریس کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف قائداعظم کے افکار و خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی بلکہ قراردادِ پاکستان کو بھی غیر اہم ثابت کرنا چاہا۔ اُس دور کے سرکاری اور ہندو اخبارات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے

کے لاہور کے تاریخی اجلاس کی رپورٹنگ میں صحافیانہ دیانت داری کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ، ٹائمز آف انڈیا، اسٹیٹسمین اور دیگر اخبارات نے اس قرارداد کی منظوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک سیاسی حربہ قرار دیا اور اپنے صفحات پر ایسے مضامین اور خبریں شائع کیں جو قراردادِ پاکستان کے تاثر کو مسلم اذہان میں مشکوک کرسکیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ریکارڈ، قائداعظم پیپرز اور شمس الحسن کلیکشن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء کے دوران نہ صرف مسلم لیگ بلکہ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ذاتی طور پر مسلم پریس کے فروغ کو خصوصی اہمیت دی اور ایسے اخبارات کے اجراء کی کوشش کی جو مطالبۂ پاکستان کو مقبول بنانے اور مسلم عوام کو اُن کی قومی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرنے میں موثر کردار ادا کرسکیں۔ اس سلسلہ میں قائداعظم نے مختلف رہنماؤں سے خط و کتابت کی اور اُن پر مسلم پریس کے فروغ کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکریٹری سید شمس الحسن کے کاغذات میں جو "شمس الحسن کلیکشن" کے نام سے معروف ہیں اخبارات کے مالکان، صحافیوں اور کارکنوں سے ہونے والی قائداعظم کی خط و کتابت کو تین علیحدہ جلدوں (volumes) میں ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ جلدیں *Press and Publication Volumes* کہلاتے ہیں۔ اس خط و کتابت کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۴ء کے دوران میں مسلم پریس کے فروغ کے لیے کس قدر منظم انداز میں جدوجہد کی۔

اس ضمن میں سب سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر سے ہی ایک ہفت روزہ اخبار 'منشور' کا اجراء کیا گیا۔ 'منشور' ایک اخبار ہی نہیں تھا بلکہ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا ترجمان بھی تھا۔ اس اخبار کی ادارت کے لیے قائداعظم نے مسلم لیگ کے ایک دیرینہ کارکن اور تجربہ کار صحافی سید حسن ریاض کا انتخاب کیا۔ اس اخبار کے اجراء سے

مسلم لیگ کو تنظیمی سطح پر بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ اس میں سیاستِ حاضرہ کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ضمنی اور ذیلی مراکز کی کارکردگی کی رپورٹس شائع ہوتی تھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح ذاتی طور پر 'منشور' کے انتظامی معاملات کی نگرانی بھی کرتے تھے جیسا کہ قائداعظم اور سید حسن ریاض کے درمیان ہونے والی طویل خط و کتابت سے ظاہر ہے۔ بعد میں 'منشور' کو روزنامہ اخبار میں تبدیل کر دیا گیا۔

قائداعظم کے ایک رفیقِ خاص اور مسلم لیگ کے رہنما مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب *Quaid-E-Azam Jinnah: As I Knew Him* میں مسلم پریس کے فروغ کے سلسلہ میں قائداعظم سے اپنی خط و کتابت درج کی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم مسلمانوں کا ایک ایسا انگریزی اخبار دہلی سے سے نکالنے کے خواہش مند تھے جو نہ صرف پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کے پیغام کو عام کر سکے بلکہ حکام پر بھی لیگ کے موقف کو پوری طرح عیاں کرے۔ قائداعظم کی خواہش ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو دہلی سے ہفت روزہ 'ڈان' کے اجراء کی صورت میں پوری ہوئی۔ اس موقع پر آپ نے اپنے ایک بیان میں مسلمِ ہند کی رائے اور جذبات کو پیش کرنے کے لیے دہلی سے ایک انگریزی روزنامے کے اجراء کی ضرورت واضح کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ''مسلمانوں کے تعاون سے ہی اس ہفت روزہ اخبار کو ہم بہت جلد ایک اعلیٰ پائے کے انگریزی روزنامے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔''

ہفت روزہ 'ڈان' کے اجراء کا پورے ہندوستان میں زبردست خیر مقدم کیا گیا اور آٹھ ماہ کے اندر اندر اس کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی جو اس زمانے میں کسی ہفت روزہ کے لیے ایک معقول تعدادِ اشاعت تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ہفت روزہ 'ڈان' کو روزنامے میں تبدیل کرنے کے لیے مسلمانوں نے فنڈز مہیا کرنے کے سلسلے میں بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ یہ قائداعظم کے لیے بڑی طمانیت کی بات تھی چنانچہ آپ

نے اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ ہفت روزہ 'ڈان' کو روزنامہ اخبار میں تبدیل کرنے کے لیے تیاریاں شروع کریں۔ قائداعظم نے ۳/ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو مرزا ابوالحسن اصفہانی کے نام ایک خط میں روزنامہ 'ڈان' کے اجراء سے متعلق معاملات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ "مجھے امید ہے کہ میں اس اخبار کو واقعی ایک ایسا اوّل درجہ کا انگریزی روزنامہ بنتے دیکھوں گا جو ہندوستان کے مسلمانوں کی حقیقی اور سچی آواز ہوگا۔"

قائداعظم کے اس خط کے صرف نو دن بعد ۱۲/ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو روزنامہ 'ڈان' کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر 'پوتھن جوزف' تھے جن کا اس وقت ہندوستان کے معروف صحافیوں میں شمار ہوتا تھا۔ پوتھن جوزف نے تقریباً تین سال 'ڈان' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ اس موقع پر بنگال سے تعلق رکھنے والے انگریزی کے ایک پروفیسر الطاف حسین کو جو 'اسٹیٹسمین' کلکتہ اور 'مسلمان' کلکتہ میں کالم لکھا کرتے تھے 'ڈان' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ الطاف حسین کی ادارت میں روزنامہ 'ڈان' نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ایسی مقبولیت کہ روزنامہ 'ڈان' کو مسلم ہند کا وکیل تصور کیا جانے لگا۔ روزنامہ 'ڈان' کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم حلقوں سے مزید اخبارات کی اشاعت کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ آپ کو اِس حقیقت کا پوری طرح اندازہ تھا کہ اخبار پڑھنے والے عوام کی تعداد بڑھ رہی ہے اور لوگ ہندوستان کے مسلمانوں کی خبریں اور خیالات جاننے کے بہت مشتاق ہیں۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ مطالبۂ پاکستان کی مقبولیت، آل انڈیا مسلم لیگ کا تنظیمی استحکام، انتخابات کے نتیجہ میں مسلم لیگ کے امیدواروں کی بھاری اکثریت سے کامیابی، برطانوی حکام اور کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کی خط وکتابت اور مذاکرات، ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کی جانب

سے کانگریس کی ہٹ دھرمی اور سب سے بڑھ کر حکمران طبقہ کے کانگریس کی جانب مسلسل جھکاؤ کے نتیجہ میں مسلم ہند کے اندر ایک ایسی بیداری پیدا ہوئی تھی جس نے مسلمانوں کو نہ صرف ایک پلیٹ فارم پر متحد و منظم کر دیا تھا بلکہ اُن کے اندر ایثار اور قربانی کا ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا جو روز بروز فزوں تر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے قائد کی ایک آواز پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ و تیار تھے۔ مسلم پریس کے فروغ کے سلسلہ میں بھی انہوں نے قائداعظم کی اپیلوں اور بیانات کو اہمیت دیتے ہوئے پورے ہندوستان میں اخبارات اور رسائل کا ایک ایسا جال بچھا دیا جس کے آگے سرکاری اور ہندو پریس بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران اورینٹ پریس آف انڈیا کے نام سے مسلمانوں کی اپنی خبر رساں ایجنسی اور دہلی میں مسلم جرنلسٹس فیڈریشن قائم ہو چکی تھی بلکہ مئی ۱۹۴۷ء میں جب دہلی کے اینگلو عربک کالج ہال میں آل انڈیا مسلم نیوز پیپرز کنونشن منعقد ہوا تو اُس میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے ۵۴/اخبارات و جرائد کے مدیران نے شرکت کی۔ اس کنونشن کا افتتاح آلِ انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری نوابزادہ لیاقت علی خان نے کیا تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ کے دیگر سرکردہ رہنماؤں کی مسلسل اور انتھک جدوجہد کے نتیجے میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران یعنی تحریکِ پاکستان کے آخری تین سالوں میں ہندوستان کے ہر صوبے سے آل انڈیا مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کی حمایت کرنے والے روزنامہ اور ہفت روزہ اخبارات انگریزی، اردو، بنگالی، سندھی، گجراتی، تامل اور پشتو زبان میں پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہے تھے۔ اُس دور میں جو شہر اخبارات کے مرکز کے طور پر معروف تھے اُن میں آسام، کلکتہ، پٹنہ، بمبئی، ناگپور، اجمیر، دہلی، لاہور، حیدرآباد دکن، مدراس، میسور، کراچی، الہ آباد، حیدرآباد (سندھ)، لکھنؤ، میرٹھ،

کانپور، امرتسر، بنارس اور بدایوں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ڈان' دہلی اور روزنامہ 'منشور' دہلی کے علاوہ تحریکِ پاکستان کی پرزور حمایت کرنے والے انگریزی اخبارات و رسائل میں 'دی اسٹار آف انڈیا' کلکتہ، 'مارننگ نیوز' کلکتہ، 'پاکستان ٹائمز' لاہور، 'ایسٹرن ٹائمز' لاہور، 'دی اسٹار' بمبئی، 'مارننگ ہیرالڈ' بمبئی، 'دی مسلم ٹائمز' بمبئی، 'پروگریس' بمبئی، 'ویکلی آبزرور' الٰہ آباد، 'نیولائف' پٹنہ، 'دی سندھ ٹائمز' کراچی، 'خیبر میل' پشاور، 'آسام ہیرالڈ' شیلانگ، 'دکن ٹائمز' مدراس، بہت معروف ہوئے۔ جبکہ اردو اخبارات میں 'نوائے وقت' لاہور، 'احسان' لاہور، 'عصرِ جدید' کلکتہ، 'خلافت' بمبئی، روزنامہ 'وحدت' دہلی، روزنامہ 'ہند' کلکتہ، 'صدائے عوام' پٹنہ، 'ہمدم' لکھنؤ، 'جنگ' دہلی، روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 'انجام' دہلی، 'مسلمان' مدراس، 'وقت' حیدرآباد دکن، 'قومی اخبار' کانپور، 'تنویر' لکھنؤ، روزنامہ 'نیا اخبار' الٰہ آباد، 'شہباز' لاہور، 'سعادت' فیصل آباد، 'پاسبان'، 'میسور'، روزنامہ 'سرحد' پشاور اور 'زمیندار' لاہور وغیرہ کو خصوصی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ بنگالی زبان میں کلکتہ کے اخبار 'آزاد' اور گجراتی میں 'روزنامہ وطن' نے تحریکِ پاکستان کی حمایت میں اہم کردار ادا کیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر قائداعظم محمد علی جناح مسلم اخبارات کے اجراء اور فروغ کو اتنی اہمیت نہ دیتے تو تحریکِ پاکستان کی کامیابی اتنی جلد ممکن نہ ہوتی۔ یہ اخبارات ہی تھے جنہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو اُس وقت کے حالات و واقعات سے پوری طرح باخبر رکھا بلکہ مطالبۂ پاکستان کے خلاف ہندو کانگریس اور قوم پرست لیڈروں کی جانب سے کی جانے والی تمام سازشوں کو ناکام بنایا۔ مسلمانوں کے دلوں میں ایک علیحدہ وطن کی اہمیت اور ضرورت کے تصور کو راسخ کیا۔ اُن کے اندر مقصدیت کو فروغ دیا اور اُن کو ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ و تیار رکھا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اخبارات کے اجراء کے حوالے سے قائداعظم نے ہندوستان گیر

دورے کیے اور مسلم پریس کے قیام کے لیے مسلمانوں سے چندے کی اپلیں کیں جس کے نتیجے میں ایک کثیر سرمایہ جمع ہوا۔

روزنامہ 'ڈان' دہلی کی اشاعت کی پہلی سالگرہ پر قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے ایک پیغام میں فرمایا "کسی قوم کی ترقی اور بہبود کے لیے اخبارات ایک اہم ضرورت ہوتے ہیں۔ کیونکہ قومیں اخبارات کے ہی ذریعہ رہنمائی حاصل کرتی ہیں اور اس رہنمائی سے جو رائے قائم ہوتی ہے وہی بالآخر زندگی کے ہر شعبہ میں قومی سرگرمیوں کا باعث بنتی ہے۔" قائداعظم کے اس پیغام کی روشنی میں آج جب ہم تحریکِ پاکستان کی کامیابی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ مطالبۂ پاکستان کی منظوری اور تحریکِ پاکستان کی کامیابی میں اخبارات نے نہایت موثر اور اہم کردار ادا کیا۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے میں تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں کو تعاون فراہم کیا اور نامساعد حالات کے باوجود کانگریسی اخبارات کے تمام ہتھکنڈوں کو نہایت دانشمندی سے ناکام بنایا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران جاری ہونے والے اخبارات ہماری قومی تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہمارے قومی شعور کے ارتقا کی داستان ہیں۔ ہمارے عزمِ صمیم کی دستاویز ہیں۔ یہ کل بھی ہمارے قلوب کو یقینِ محکم سے معمور کررہے تھے اور آج بھی ہم کو اپنی قومی تاریخ سے وابستگی کا درس دے رہے ہیں۔

محمد علی جناح کے خطاب 'قائداعظم' کا تحقیقی جائزہ

مسلم معاشرے میں اعلیٰ صلاحیتوں اور نمایاں اوصاف کے حامل افراد کو ان کی شخصیت سے مختص وصف وصلاحیت کے اعتراف کے طور پر خطاب والقاب دینے کی روایت قدیم ودیرینہ رہی ہے۔ دورِ رسالت مآب ﷺ میں بھی کئی ایسے صحابہؓ موجود تھے جن کو ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے القابات سے نوازا۔ خصوصاً حضرت عمیر بن عامر الدوسی الیمانی کو بلیوں کی جانب ان کی رغبت دیکھ کر آپ ﷺ نے 'ابوہریرہ' کہہ کر مخاطب کیا اور یہ لقب ان کی ذات سے اس طرح پیوست ہو گیا کہ ان کا اصل نام معدوم ہو گیا اور وہ عالمِ اسلام میں ہمیشہ کے لیے ابوہریرہ کے لقب سے معروف ہو گئے۔ چنانچہ خطاب یا لقب دینا مسلم معاشرے کی ایک ایسی روایت بن گئی جو خلافت راشدہ سے خلافتِ عثمانیہ تک عام رہی ہے۔ حضرت نعمان بن ثابت اپنی کنیت 'ابوحنیفہ' سے اور محی الدین ابنِ عربی اپنے لقب 'شیخِ اکبر' سے معروف ہوئے۔ 'سیاست نامہ' کے مصنف اور سلجوقی سلطان الپ ارسلان کے وزیر ابوعلی الحسن نے 'نظام الملک الطّوسی' کے لقب سے شہرت پائی۔ جب مسلمانوں کا ہندوستان میں ورود ہوا تو یہاں بھی یہ روایت قائم و جاری رہی۔ مختلف شہنشاہوں اور حکمرانوں کو ان کے درباروں سے القابات اور خطابات دیے گئے۔ اسی طرح شہنشاہوں اور حکمرانوں نے بھی اپنے درباروں سے وابستہ اہم اور باصلاحیت افراد کو ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر خطاب اور لقب عطا کیے۔

برصغیر پاک و ہند میں بعض مغل شہنشاہوں نے جن میں جہانگیر اور اورنگزیب عالمگیر سرِ فہرست ہیں، تخت نشینی کے بعد اپنے لیے ایسے خطابات بذاتِ خود اختیار کیے جو عصری تاریخ میں ان کے کردار کے آئینہ دار ثابت ہوئے۔ القابات اور خطابات کی یہ روایات درباروں اور حکمرانوں تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ صوفیا، علما، ادباء اور شعراء میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہوئی اور عوامی حلقوں کی جانب سے القابات اور خطابات دینے کے رجحان کو تقویت ملی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو 'سلطان الہند' اور 'غریب نواز' اور حضرت خواجہ نظام الدین کو 'سلطان الاولیا' کہا گیا۔ سید علی ہجویری کو 'داتا گنج بخش'، سید عثمان مروندی کو 'قلندر شہباز'، حافظ عبدالوہاب کو 'سچل سرمست' اور پیر صبغت اللہ شاہ کو 'پیر پگارو' کے خطابات سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ علمائے دین میں حضرت شیخ احمد سرہندی اپنے خطاب 'مجدد الف ثانی' سے معروف ہوئے۔ ملاّ عبدالعلی فرنگی محلی کو 'بحر العلوم' کہا گیا۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو 'استاد العلما'، مولانا احمد رضا خان بریلوی کو 'اعلیٰ حضرت'، مولانا اشرف علی تھانوی کو 'حکیم الامت' اور مولانا محمود الحسن کو 'شیخ الہند' کے خطابات سے شہرت ملی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں انگریزوں نے بھی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے 'خان بہادر'، 'شمس العلما'، اور 'سر' جیسے خطابات سے ممتاز افراد کو نوازا۔ مثلاً سید احمد خان کو سر کا خطاب دیا گیا اور یہ خطاب ان کے نام کا ایسا حصہ بن گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے سرسید ہو گئے۔ مرزا داغ دہلوی 'فصیح الملک' نواب مشتاق حسین 'وقار الملک'، نواب مہدی علی خان 'محسن الملک' اور حکیم محمد اجمل خان 'مسیح الملک' کے خطابات سے پہچانے گئے۔ اکبر الہٰ آبادی کو 'لسان العصر' مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کو 'صدر یار جنگ'، علامہ راشد الخیری کو 'مصورِ غم' اور مولوی عبدالحق کو 'بابائے اردو' کے خطابات سے عمومی شہرت ملی۔

ہندوستان میں جدوجہدِ آزادی کے دوران اس روایت کو عوامی سطح پر مزید

مقبولیت حاصل ہوئی اور مختلف رہنماؤں کو خطابات دیے گئے مثلاً مولانا محمد علی جوہر کو 'رئیس الاحرار'، مولانا ابوالکلام آزاد کو 'امام الہند'، مولانا حسرت موہانی کو 'سید الاحرار'، علامہ اقبال کو 'شاعرِ مشرق'، نواب بہادر خان کو پہلے 'بہادر یار جنگ' اور پھر 'قائدِ ملت' کے خطابات سے نوازا گیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کو تحریکِ پاکستان کے دوران 'قائدملت' اور شہادت کے بعد 'شہیدِ ملت' کے خطاب سے یاد کیا گیا۔ محترمہ فاطمہ جناح 'مادرِملت' کے خطاب سے معروف ہوئیں۔ عوامی تحریکات سے وابستہ افراد کو خطابات سے نوازنے کا جہاں ایک مقصد سامراجی حکومت کی جانب سے عطا کردہ سرکاری خطابات کی قدر ومنزلت کو گھٹانا تھا، وہاں دوسری طرف ہندو رہنماؤں کے مقابلے میں مسلم قیادت کا اعتراف واعلان بھی تھا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی تین عشروں میں کسی رہنما کے لیے قائد کا لفظ تو بطور خطاب اکثر استعمال ہوتا رہا، البتہ 'قائداعظم' کا خطاب خال خال ہی استعمال کیا گیا۔ لیکن تحریکِ پاکستان اور علیحدہ مسلم قومیت کے احساس کے فروغ کے ساتھ بالآخر یہ خطاب مسلمانوں کے مسلمہ رہنما محمد علی جناح کے لیے مخصوص ہوکر رہ گیا۔ بحوالہٴ تاریخ برصغیر پاک وہند میں یہ خطاب سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے استعمال کیا گیا مولانا آزاد کی ۱۰ر جنوری ۱۹۱۳ء کی ایک تقریر ۱۹۲۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی تو اس کتاب کے پبلشر مشتاق احمد نے کتاب کے آغاز پر لکھا کہ ''مولانا کی چشم حقیقت بیں اس وقت وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو آج پیش آیا ہے۔ ایک حقیقی مصلح، ریفارمر یا 'قائداعظم' میں یہ وصف ہونا لازمی ہے کہ آئندہ کے متعلق صحیح نتائج پر پہنچا جائے۔'' اس کتاب کی اشاعت کے تقریباً دو برس بعد یعنی ۳۱ مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی مجلسِ استقبالیہ کے چیئرمین شاہد حسین نے اپنے خطبہٴ استقبالیہ میں یہ خطاب ترکی کے رہنما مصطفیٰ کمال پاشا کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''ملتِ ترکیہ جس کی قیادت اس وقت دنیائے اسلام

کے وہ پُر جلال باجبروت ہیرو کررہے ہیں، جن کا پیارا نام مجددِ خلافت، بطلِ حریت، خالدثانی، قائداعظم، غازی مصطفیٰ کمال پاشا ہے۔''

انڈین نیشنل کانگریس اور تحریکِ خلافت کے رہنماڈاکٹر مختار احمد انصاری کا ایک بیان شائع کرتے ہوئے لاہور کے ایک اخبار 'اخبارِ انقلاب' نے اپنی اشاعت ۶/ اپریل ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام کے ساتھ 'قائداعظم' کا خطاب استعمال کیا۔ اسی سال علی گڑھ سے سید طفیل احمد منگلوری کی ایک کتاب جداگانہ انتخابات کے بارے میں شائع ہوئی جس کے آخر میں نظامی پریس، بدایوں کی مطبوعات کے اشتہارات درج تھے انہی اشتہارات میں سے ایک میں روس کے مشہور افسانہ نگار ٹالسٹائی کو 'روس کا قائداعظم' لکھا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں ہی ہندو رہنما موہن داس کرم چند گاندھی کی تقریروں اور تحریروں کا ایک مجموعہ لالہ متعدی لال ہندی نے 'بیداریٔ ہند' کے نام سے ترتیب دیا۔ اس مجموعے کا ایک اشتہار کانپور کے رسالے ماہنامہ 'زمانہ' کی اشاعت بابت ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا جس میں گاندھی کے نام کے ساتھ بیک وقت 'مہاتما' اور 'قائداعظم' کے خطابات استعمال کیے گئے۔ بجنور سے شائع ہونے والے سہ روزہ اخبار 'مدینہ' نے ۱۳/جنوری ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں تحریکِ خلافت کے رہنما مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر ایک تعزیتی شذرہ شائع کیا جس کا عنوان تھا'' قائداعظم کی وفات۔ ہندوستانی جرائد کی حسیاتِ غم''۔ 'مدینہ' اخبار کی اسی اشاعت میں 'اشکِ خوں' کے عنوان سے خورشید آرا بیگم (بعدازاں بیگم نواب صدیق علی خان) کی ایک نظم شائع ہوئی جس میں مولانا محمد علی جوہر کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ اس نظم کے ایک شعر میں بھی مولانا محمد علی جوہر کے لیے 'قائداعظم' کا خطاب استعمال کیا گیا تھا، شعر یہ تھا:

الوداع اے قائداعظم اوبطل حریت
الوداع اے بہتریٔ قوم را زوح الامیں

مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر مختلف رہنماؤں نے اپنے تعزیتی پیغامات میں اور اخبارات نے خبروں اور ادارتی تبصروں میں مولانا محمد علی جوہر کے لیے قائدِ ملت، شہیدِ ملت، شہیدِ اسلام اور زعیم اعظم کے بھی خطابات استعمال کیے، جبکہ دہلی کے ایک اخبار 'ملت' نے ان کو اسلامی ملت کا قائداعظم قرار دیا۔ اسی طرح ۱۹۳۶ء میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے نام کے ساتھ بھی 'قائداعظم' لکھا گیا۔ دراصل ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کی انتخابی مہم کے سلسلے میں ایک کتابچہ شائع کیا گیا جس کے آخر میں علامہ اقبال کا ایک پیغام بعنوان 'مسلمانانِ لاہور سے اپیل' درج کیا گیا۔ یہ کتابچہ غلام رسول خان، بیرسٹرایٹ لاء، سیکریٹری پنجاب مسلم لیگ، پارلیمنٹری بورڈ نے لاہور سے شائع کیا تھا۔ اس کتابچہ میں علامہ اقبال کے پیغام کے آغاز پر یوں لکھا گیا تھا 'مسلمانانِ پنجاب کے مخلص رہنما اور 'قائداعظم' علامہ سر محمد اقبال کے حسبِ ذیل پیغام پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔''

دراصل اس دور میں اردو اخبارات و رسائل جب کسی اہم رہنما کی توقیر اور عزت افزائی چاہتے تھے تو اسے 'قائداعظم' کے خطاب سے نواز دیتے تھے۔ لیکن یہ عمل مستقل نہیں ہوتا تھا جس کی بنا پر قائداعظم کا خطاب کسی ایک رہنما کے نام سے وابستہ نہیں ہو سکا۔ اس عمل میں کوئی خاص تخصیص بھی روا نہیں رکھی جاتی تھی جیسا کہ روزنامہ 'زمیندار' لاہور نے کشمیر کے ایک مذہبی رہنما پیر حسام الدین جیلانی کی قید سے رہائی کی خبر ۷ جولائی ۱۹۳۲ء کو شائع کرتے ہوئے ان کے نام کے ساتھ 'قائداعظم' کا خطاب استعمال کیا۔ اس طرح جب ۱۹۳۷ء میں چینی فوج کے کمانڈر نے مکہ معظمہ کا دورہ کیا تو دہلی کے اخبار 'الجمیعت' نے ۹ فروری ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں اس خبر کی سرخی لگائی۔ 'چینی فوج کا قائداعظم بیت اللہ میں'۔ مزید برآں پنجاب کے ایک شاعر مرز بیضہ خاں امرتسری نے ۱۹۳۸ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کے انتقال پر اپنے منظوم خراجِ عقیدت میں ان کو 'قائداعظم' کہا۔ یہ نظم ۱۵ر نومبر ۱۹۳۸ء کے روزنامہ 'انقلاب' لاہور

میں شائع ہوئی تھی۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں خالقِ اسمِ پاکستان چوہدری رحمت علی کو بھی غلام مصطفیٰ نامی ایک شخص نے لاہور سے اپنے خط میں قائداعظم لکھ کر مخاطب کیا تھا۔ یہ خط چوہدری رحمت علی کے پیپرز میں موجود ہے اور کے کے عزیز نے چوہدری رحمت علی کی سوانح میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

محمد علی جناح نے اپریل ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی از سرِ نو صدارت سنبھالی اور شبانہ روز جدوجہد سے بہت جلد مسلم لیگ کے تنِ مُردہ میں جان ڈال دی۔ اس دور میں مسلمانانِ ہند کو نہ صرف ایک مضبوط سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی بلکہ وہ ایک ایسا رہنما بھی چاہتے تھے جو ان کی دیرینہ قومی اُمنگوں اور آرزوؤں کی آبیاری کر کے ان کو ایک تناور درخت کی شکل دے سکے اور اُس دور میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ صرف محمد علی جناح ہی اس کام کو بحسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں، چنانچہ مسلمانوں نے ان کو ۱۹۳۶ء کے آخر میں اپنا 'قائداعظم' کہنا شروع کر دیا۔ اپنے تاریخی تناظر اور تسلسل میں جناح کے لیے قائداعظم کا خطاب کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کیونکہ ان سے قبل بھی بہت سے رہنماؤں کو اس خطاب سے نوازا گیا، مگر جناح کو جس انداز میں اس خطاب سے نوازا گیا اور جس طرح یہ خطاب ان کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گیا وہ یقیناً غیر معمولی بات تھی اور اس کا تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ محمد علی جناح کو قائداعظم کا خطاب ملنے سے قبل ان کے نام کے ساتھ عموماً رائٹ آنریبل، زعیمِ ملت اور قائدِ ملت جیسے القابات استعمال کیے جاتے رہے لیکن جیسے جیسے وہ مقبولیت حاصل کرتے گئے 'قائداعظم' کا خطاب ان کے نام کا متبادل قرار پاتا چلا گیا۔

بحوالۂ تاریخ محمد علی جناح کے لیے سب سے پہلے یہ خطاب جمعیتِ علمائے ہند کے سیکریٹری مولانا احمد سعید دہلوی نے استعمال کیا تھا۔ محمد امین زبیری مارہروی نے اپنی کتاب 'سیاستِ ملیہ' میں لکھا ہے کہ "۷ دسمبر ۱۹۳۶ء کو مراد آباد کی جامع مسجد میں

مولانا احمد سعید دہلوی نے جناح کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج مسلمانوں میں سیاست کو سمجھنے والا اس سے بہتر کوئی شخص نہیں، لہٰذا مسلمانوں کے 'قائداعظم' ہونے کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔'' جبکہ ایک معروف مصنف اور تحریکِ پاکستان کے قلمی معاون جمیل الدین احمد نے اپنی انگریزی کتاب *Glimpses of Quaid-I-Azam* میں خیال ظاہر کیا ہے کہ محمد علی جناح کے لیے یہ خطاب دہلی کے پندرہ روزہ اخبار 'الامان' کے مدیر مولانا مظہر الدین شیرکوٹی نے تجویز کیا تھا۔ مشہور صحافی اور شاعر عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب 'سرگزشت' میں خیال ظاہر کیا ہے کہ لاہور سے تعلق رکھنے والے تحریکِ خلافت کے ایک پرانے کارکن میاں فیروز الدین نے لیگ کے جلسوں میں 'قائداعظم زندہ باد' کے نعرے لگا کر اس خطاب کو مقبول بنایا۔ پروفیسر شریف المجاہد نے قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید کے حوالے سے اپنی کتاب *Quaid-I-Azam Jinnah: Studies in Interpretation* میں لکھا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مولانا ظفر علی خان نے محمد علی جناح کو قائداعظم کے خطاب سے مخاطب کیا۔ مولانا ظفر علی خان کے الفاظ تھے 'ہمارے قائداعظم محمد علی جناح، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے قائداعظم محمد علی جناح...' دسمبر ۱۹۳۷ء کے اواخر میں محمد علی جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے تنظیمی دورہ پر بہار گئے تو اُس موقع پر کلکتہ کے اخبار 'عصرِ جدید' نے اپنی ۳ جنوری ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں ایک خبر کی سرخی میں لکھا 'گیا میں مسلمانانِ ہند کا قائداعظم' اپریل ۱۹۳۸ء میں پنجاب کے وزیراعلیٰ سر سکندر حیات خان نے کلکتہ میں اپنی ایک تقریر کے دوران جناح کے لیے قائداعظم کا خطاب بار بار استعمال کیا۔ غرض کہ ۱۹۳۸ء کے آغاز پر ہی محمد علی جناح کے لیے قائداعظم کا خطاب اس قدر عام ہوگیا تھا کہ تمام مسلم پریس اور رہنما جناح کو 'قائداعظم' کے خطاب سے ہی مخاطب کرنے لگے تھے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو مسلمانانِ ہند نے کانگریسی حکومت کے خاتمے کی خوشی میں قائداعظم کی اپیل پر نہایت جوش وخروش سے یومِ نجات منایا۔ اس موقع پر گلبرگہ کے مسلمانوں نے ایک ٹیلی گرام گاندھی جی کو ارسال کیا جس کے الفاظ تھے 'یومِ نجات کی تہنیت... قائداعظم زندہ باد' گاندھی جی کانگریسی حکومتوں کے خاتمے پر ویسے ہی چراغ پا تھے، یہ ٹیلی گرام ملتے ہی اور بھڑک اٹھے۔ انہوں نے ۱۶ جنوری ۱۹۴۰ء کو قائداعظم کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا جس کے آغاز پر محمد علی جناح کے بجائے محترم قائداعظم لکھا اور پھر خط میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ 'کسی ہندوستان کے نام کے آگے 'مسٹر' تحریر کرنا مجھے پسند نہیں اور یہ غیر موزوں بھی ہے، اس لیے حکیم صاحب مرحوم (حکیم محمد اجمل خان) کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق میں آپ کو ہمیشہ 'جناح صاحب' کے الفاظ سے مخاطب کرتا رہا ہوں، لیکن امت السلام (گاندھی جی کی ایک داسی) نے مجھ سے کہا کہ لیگی حلقوں میں آپ کو قائداعظم کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور اب یہ ٹیلی گرام دیکھ کر جو گلبرگہ سے موصول ہوا ہے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ باور کریں گے کہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ نیک نیتی کے ساتھ اور آپ کی خاطر کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ میں کسی دوسرے القاب سے آپ کو مخاطب کروں تو بہر حال اس کی بھی تعمیل کی جائے گی۔' گاندھی جی کے اس خط کا جواب قائداعظم نے ۲۱ جنوری ۱۹۴۰ء کو دیا۔ قائداعظم نے اپنے خط میں دیگر اُمور پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اس خطاب کے استعمال کے بارے میں لکھا کہ 'القاب' کی اہمیت ہی کتنی ہوتی ہے۔ گلاب کو خواہ کسی بھی نام سے یاد کیا جائے، اس کی خوشبو بہر حال باقی رہے گی۔ اس لیے میں اس معاملے کو آپ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں اور اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کرتا۔ البتہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ اس کے لیے اتنے پریشان کیوں ہیں۔ بہر حال مجھے معلوم ہوا ہے کہ جو خطاب اس وقت آپ استعمال کر رہے ہیں وہ حکیم صاحب مرحوم کے

بتائے ہوئے ہیں، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے انتقال کے بعد بھی ایک عرصے تک آپ نے مجھے 'مسٹر' ہی کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے اس کے بعد حال تک آپ نے 'شری' کے القاب سے مخاطب کیا ہے لیکن اس ضمن میں زیادہ تردّد اور فکر کی حاجت نہیں۔'

گاندھی جی کی جانب سے محمد علی جناح کے لیے 'قائداعظم' کا خطاب استعمال کرنے کا سب سے زیادہ رنج مولانا ابولکلام آزاد کو ہوا جس کا انہوں نے برسوں کے بعد اپنی کتاب *India Wins Freedom* میں اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'یہ گاندھی کی ذات تھی جس نے 'قائداعظم' کے خطاب کو جو مسٹر جناح سے منسوب ہوا، شہرت عطا کی۔ گاندھی کے آشرم میں ایک سادہ مگر نیک خاتون مس امت السلام تھیں۔ انہوں نے چند اردو اخبارات میں دیکھا کہ مسٹر جناح کو قائداعظم کہا گیا ہے، چنانچہ جب گاندھی جی مسٹر جناح سے ملاقات کا وقت طے کرنے کے لیے خط لکھ رہے تھے تو انہوں نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات مسٹر جناح کو قائداعظم کہتے ہیں اس لیے آپ بھی یہی خطاب استعمال کیجیے۔ گاندھی جی نے اپنے اس عمل کے نتائج پر ایک لحہ بھی غور کیے بغیر مسٹر جناح کو 'قائداعظم' لکھ کر مخاطب کر لیا۔ گاندھی جی کا یہ خط بعد میں اخبارات میں شائع ہوا۔ جب ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ گاندھی جی نے بھی مسٹر جناح کو قائداعظم کہہ کر مخاطب کیا ہے تو انہوں نے بھی یہ طے کر لیا کہ واقعی مسٹر جناح قائداعظم ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بیان صرف مولانا کی انانیت اور خفگی کو ہی ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان کے اُس رنج کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ برصغیر میں یہ خطاب سب سے پہلے ان کے لیے استعمال ہوا تھا لیکن آج مسٹر محمد علی جناح کی ذات سے ہمیشہ کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مولانا آزاد کے بیان کا یہ حصہ کہ گاندھی جی نے مسٹر جناح کو قائداعظم لکھ کر اس خطاب کو مسلمانانِ ہند میں قبولیت عطا کی، حقائق

سے چشم پوشی کی واضح دلیل ہے۔ محمد علی جناح کو پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں قائداعظم کہا گیا اور پھر یہ خطاب ۱۹۳۸ء کے آغاز میں ان کے نام کا ایک حصہ بن گیا جبکہ گاندھی جی نے بہت بعد میں یعنی ۱۶ر جنوری ۱۹۴۰ء کو اپنے خط میں محمد علی جناح کے لیے قائداعظم کا خطاب استعمال کیا تھا۔

قائداعظم کا یہ خطاب محمد علی جناح کو ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے مکمل اعتماد کی علامت کے طور پر دیا تھا۔ اس طرح مسلمان کانگریس کے ان دعوؤں اور پروپیگنڈے کی بھی نفی کرنا چاہتے تھے جو کانگریس بعض قوم پرست مسلمانوں کو اسلامیانِ ہند کا رہنما بنانے کے سلسلے میں کرتی رہتی تھی چنانچہ اس طرح مسلمانوں نے محمد علی جناح کو مسلمانوں کی مکمل نیابت کو وہ حق بھی فراہم کر دیا تھا جو اس دور میں کسی اور مسلمان کو حاصل نہیں تھا۔

قائداعظم کا خطاب محمد علی جناح کے نام کے ساتھ استعمال ہونا اگرچہ ۳۸۔۱۹۳۷ء میں عام ہو گیا تھا لیکن جہاں تک لیگ کی سرکاری دستاویزات کا تعلق ہے، ان میں اس خطاب کو کئی برس بعد استعمال کیا گیا۔ سب سے پہلے لیگ کی دستاویزات میں یہ خطاب مسلم لیگ کونسل کی اس قرارداد میں استعمال ہوا تھا جو ۷ مارچ ۱۹۴۳ء کو دہلی کے اجلاس میں منظور کی گئی اور جس میں لیگ کے از سر نو صدر کی حیثیت سے محمد علی جناح کے انتخاب کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ بعدازاں محمد علی جناح کے نام کے ساتھ اس خطاب کے استعمال کی اہمیت ان کی اعلیٰ ترین قیادت اور ہندوستان کی سیاست میں ان کے موثر ترین کردار کی روشنی میں پوری دنیا پر واضح ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ جون ۱۹۴۷ء میں اسلامیانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا اور وہ اس ملک خداداد 'پاکستان' کے بانی اور پہلے گورنر جنرل قرار پائے۔ ان کی اسی حیرت انگریز کامیابی، بے لوث خدمتِ قومی اور شاندار قیادت کو تسلیم کرتے ہوئے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے پاکستان کے باقاعدہ قائم

ہونے سے صرف دو دن قبل ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے صدر اور پاکستان کے نامزد گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح کو تمام سرکاری قوانین، دستاویزات، خطوط اور مراسلات میں ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے 'قائداعظم محمد علی جناح' لکھا جائے گا۔ ایک رہنما کی زندگی میں اس کی قوم کا یہ اعتراف بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کم ہی ایسے رہنما ہوں گے جن کو ان کی قوم نے متفقہ طور پر ایسی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا ہو اور پھر اس کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہو۔ اگرچہ قائداعظم محمد علی جناح ہر طرح کے القابات و خطابات سے بے نیاز تھے۔ وہ اپنی عوامی زندگی کے تمام عرصے میں ہمیشہ ہی حکومت کی طرف سے کوئی بھی عہدہ، منصب، خطاب یا لقب قبول کرنے سے گریزاں رہے حتیٰ کہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تک لینا پسند نہ کیا حالانکہ وہ اس یونیورسٹی کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاالدین احمد کے نام ۴/اکتوبر ۱۹۴۲ء کو اپنے خط میں لکھا 'بلاشبہ میں اس جذبے کی بے حد قدر کرتا ہوں جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلم یونیورسٹی کے کورٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے تاہم میں بادل نخواستہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اب تک محض 'مسٹر جناح' کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا ہوں اور یہ توقع کرتا ہوں کہ میں صرف 'مسٹر جناح' کی حیثیت سے ہی انتقال کروں گا۔ میں ہر قسم کے خطاب، لقب اور اعزاز کا مخالف ہوں اور میرے لیے یہ زیادہ خوشی کی بات ہوگی کہ میرے نام کے ساتھ کوئی سابقہ نہ لگایا جائے۔'

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے محمد علی جناح کو 'قائداعظم' کا خطاب دے کر ان کی ان خدماتِ جلیلہ کا عام اعتراف کیا تھا جو انہوں نے اپنی ۷۲ سالہ زندگی میں تقریباً ۴۲ سال پر محیط اپنی سیاسی اور عوامی زندگی کے

دوران آزادی اور اسلامیانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کے لیے سرانجام دی تھیں اور یہ ایک شاکر قوم کا اپنے مسلمہ رہنما کے لیے ایک جذباتی اور قلبی اعتراف تھا جیسا کہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو ان کے انتقال پر لندن کے اخبار 'دی ٹائمز' نے اپنے اداریہ میں اعتراف کیا ہے کہ 'محمد علی جناح، ان لوگوں کے لیے جن کی انہوں نے رہنمائی کی، 'قائداعظم' سے بھی بڑھ کر کچھ اور تھے اور جس اسلامی قوم کی تشکیل انہوں نے خود کی تھی، وہ اس کے معمار ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ تھے۔'

قائداعظم کی خوش پوشا کی اور نفاست

قائداعظم محمد علی جناح برصغیر پاک و ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ کے نہایت خوش پوشاک اور نفیس انسان تھے۔ جہاں مورخین نے اُن کی سیاسی بصیرت کو موضوع بنایا ہے وہاں جزوی طور پر اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ قائداعظم کی خوش پوشا کی بھی ان کی شخصیت کا ایک ایسا جزو تھی جس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے اپنے مضمون میں جو قائداعظم کی سیاست سے نہیں بلکہ اُن کی جمالیات سے تعلق رکھتا ہے قائداعظم کی خوش پوشا کی اور لباس کے حوالے سے ان کی طبیعت کی نفاست کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

لباس کسی شخص کے ذوقِ جامہ زیبی، نظریات اور رجحانات کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ اُس شخص کے علاقائی تعلق اور ثقافت کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی سورۃ الآعراف میں لباس کو انسانوں کے لیے موجب زینت قرار دیا گیا ہے۔ لباس تمدنی زندگی کی ایک اہم ترین ضرورت ہے اور اس کو شان وشوکت، نفاست اور وقار کے اظہار کا ذریعہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔ مشاہیر عالم نے ہمیشہ وہ لباس زیب تن کیا جو اُن کی سرزمین پر آباد افراد کی روایت اور ثقافت سے ہم آہنگی رکھتا ہو مگر بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ جب کسی رہنما یا پیشوا نے خود کو عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا آئینہ دار بنالیا تو عوام نے اپنے رہنما کی عقیدت میں خود بھی وہی لباس اختیار کرلیا جو اُن کے رہنما سے مخصوص تھا۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن ماضی قریب کی

تاریخ میں اس کی ایک جزوی مثال قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت ہے۔ جن کے لباس میں شامل 'ٹوپی تحریک پاکستان کے دوران مسلم تشخص کی علامت بن گئی تھی'۔ لباس کے حوالے سے قائداعظم کی نفاست پسندی اور خوش پوشا کی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح دسمبر ۱۸۷۶ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر اُس وقت نہ صرف بمبئی پریزیڈنسی کا حصہ تھا بلکہ ساحلی شہر ہونے کی بنا پر تجارتی مرکز بھی تھا۔ لہٰذا یہاں نہ صرف مختلف اقوام کے افراد آباد تھے بلکہ تجارتی مقاصد کے لیے اندرون و بیرونِ ہند سے بھی لوگ آتے رہتے تھے۔ انگریزوں کی بھی ایک بڑی تعداد یہاں آباد تھی۔ چنانچہ یہاں کی مقامی آبادی کے وہ افراد جو تجارت سے وابستہ تھے انگریزوں سے آشنا ہونے کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی لباس سے بھی کسی حد تک مانوس ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں کراچی کے ایک حصہ میں 'اینگلو انڈینز' کی بھی ایک بڑی تعداد مقیم تھی جن کی زبان اور لباس تقریباً وہی تھا جو انگریزوں کا تھا اس لیے خصوصاً تجارت پیشہ اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے لباس میں 'کوٹ پتلون' شامل تھا۔ البتہ 'سلطنت عثمانیہ' سے مسلمانانِ ہند کی مذہبی ہم آہنگی کی بنا پر مسلمانوں کے لباس میں 'ترکی ٹوپی' بھی شامل ہوا کرتی تھی جسے وہ ہر قسم کے لباس کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ قائداعظم کے والد جناح پونجا چونکہ تجارت پیشہ تھے اور انگریزوں سے قریبی رابطہ میں رہتے تھے اس لیے وہ نہ صرف انگریزی زبان سے آشنا تھے بلکہ اُن کا لباس بھی کوٹ پتلون اور ٹائی پر مشتمل تھا۔ کراچی کے اس ماحول میں قائداعظم بھی نہ صرف بچپن سے ہی اس لباس سے آشنا تھے بلکہ اپنے زمانہ طالب علمی میں یہی لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں محمد علی جناح انگلینڈ چلے گئے جہاں اُن کو بزنس ایڈمنسٹریشن کی تربیت حاصل کرنا تھی۔ لیکن انہوں نے 'لنکنز ان' میں داخلہ لے لیا اور بیرسٹری کی تعلیم

حاصل کی۔ لندن میں قیام کے دوران اُن کو 'کوٹ پتلون اور ٹائی' کا مستقل استعمال کرنا پڑا جس کی بنا پر اس لباس کی تہذیبی اور ثقافتی روایت سے بھی وہ آشنا ہو گئے۔ ۱۸۹۶ء میں لندن سے واپس آ کر محمد علی جناح نے بمبئی میں سکونت اختیار کی اور بطور پیشہ وکالت کا آغاز کیا۔ بمبئی میں پارسیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی آبادی نہ صرف بااثر اور متمول تھی بلکہ انگریزوں سے اپنے قریبی روابط کی بنا پر انگریزی ثقافت کو اختیار کرنا زیادہ معیوب تصور نہیں کرتی تھی۔ بحیثیت وکیل محمد علی جناح کا واسطہ بمبئی کی آبادی کے اسی طبقہ سے تھا اس لیے اُن کو لندن سے ہندوستان واپس آ کر لباس کے انتخاب کا سلسلہ میں کسی تردد کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہ اپنی عدالتی وسماجی ضرورتوں کے پیش نظر کوٹ پتلون، ٹائی اور فلیٹ ہیٹ ہی استعمال کرتے رہے نیتجتاً جب ۱۹۰۶ء میں وہ اپنی سیاسی زندگی میں داخل ہوئے تو یہ لباس آہستہ آہستہ اُن کی شخصیت سے بڑی حد تک مشروط ہو گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی لباس کے سلسلہ میں نفاست پسندی اور جامہ زیبی ایسی مشہور ہو گئی کہ لارڈ چیمسفورڈ اور لارڈ ہارڈنگ جیسے ہندوستان کے وائسرائے بھی اُن کی خوش لباسی سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے متعدد بار اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہندوستان میں انہوں نے جناح کی طرح نفاست پسند اور جامہ زیب کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا۔ لارڈ ریڈنگ کی اہلیہ نے تو ایک خط میں جناح کے بارے میں اپنی والدہ کو لکھا کہ "بمبئی کے جواں سال وکیل جناح کو عموماً خوش لباسی اور جامہ زیبی میں ہندوستان کا لائیڈ جارج تصور کیا جاتا ہے۔"

۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستگی کے بعد بھی محمد علی جناح انگریزی لباس استعمال کرتے رہے۔ ویسے بھی یہ لباس اُس زمانے میں جدید تعلیم اور روشن خیالی کی علامت کے طور پر ظاہر ہوا تھا اس لیے تقریباً تمام مسلمان رہنما بلا تکلف یہی لباس استعمال کرتے تھے جیسا کہ اُس دور کی تصاویر سے عیاں ہے۔ سرسید احمد خان، نواب محسن الملک، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیسے رہنماؤں نے بھی اس

لباس کو استعمال کیا۔ البتہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے مذہبی غلبہ اور تحریک خدام کعبہ وتحریک خلافت سے وابستگی کی بنا پر بعد کے برسوں میں اس لباس کو ترک کردیا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر نصف اور بیسویں صدی کے اوائل میں عام طور پر وکالت اور اردو صحافت سے تعلق رکھنے والے افراد کے ناموں کے ساتھ 'مولانا' اور 'مولوی' کا لفظ استعمال ہوتا تھا جیسا کہ نواب وقارالملک کے نام کے ساتھ مولوی مشتاق حسین اور محمد علی جوہر اور ظفر علی خان کے نام کے ساتھ 'مولانا' استعمال ہوتا رہا جبکہ یہ تینوں افراد اپنے پیشہ یا علمی پس منظر کے لحاظ سے 'مولانا' یا 'مولوی' کی مروجہ تعریف پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں مسلم سیاست کا ارتقا چونکہ مذہبی وملّی حوالوں سے ہوا تھا اس لیے عام طور پر یہ تصور کیا جاتا تھا کہ جو شخص مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے گا وہ 'مولوی' یا 'مولانا' ہوگا اسی عمومی تاثر کے تحت محمد علی جناح کو بھی جن کو عام طور پر 'مسٹر' یا 'آنریبل' کہا جاتا تھا متعدد بار مولانا لکھا گیا۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکریٹری سید شمس الحسن نے اپنی کتاب *Plain Mr. Jinnah* میں درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۶ء میں پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس بیک وقت ایک ہی مقام یعنی لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ پروگرام کے مطابق ان دونوں جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس بھی ہونا تھا جس کی صدارت محمد علی جناح کو کرنا تھی۔ چنانچہ جب محمد علی جناح اس اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی سے کانپور پہنچے تاکہ وہاں سے خصوصی ٹرین کے ذریعہ لکھنؤ جاسکیں تو کانپور کے اسٹیشن پر مسلمانوں کا ایک ہجوم محمد علی جناح کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے اور اس اجلاس کی تشہیر کے لیے مسلم لیگ کے آفس نے جو پوسٹر شائع کیے تھے اُن میں محمد

علی جناح کے نام کے آگے 'مولانا' کا خطاب استعمال کیا گیا تھا جبکہ قائداعظم ہلکے بادامی رنگ کا نہایت نفیس سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ جس میں وہ 'مولانا' کے بجائے یورپ کے لارڈ نظر آرہے تھے۔ دوران استقبال کانپور کے اسٹیشن پر یہ بات مسلم لیگ کے تقریباً تمام رہنماؤں نے محسوس کی چنانچہ مسلم لیگ کے ایک رہنما سید وزیر حسن نے قائداعظم کو تجویز پیش کی کہ وہ شیروانی پہن کر اجلاس میں شرکت کریں تاکہ پوسٹر میں لکھے ہوئے خطاب 'مولانا' کی لاج رہ جائے۔ قائداعظم چونکہ صاف گواور اصولی انسان تھے لہٰذا انہوں نے کوئی ایسا لباس زیب تن کرنے سے انکار کردیا جس کے روایتی آداب سے وہ واقف نہیں تھے۔ قائداعظم کے انکار سے سب ہی شش و پنج میں پڑ گئے لہٰذا فوری طور پر یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ سوٹ کے ساتھ ٹوپی زیب سر کرکے اجلاس میں شریک ہوں۔ قائداعظم نے اس تجویز پر رضامندی ظاہر کی چنانچہ فوری طور پر کانپور کے مچھلی بازار کی ایک دکان سے ایک درجن سے زائد مختلف قسم کی ٹوپیاں لائی گئیں اور ان میں سے ایک ٹوپی جو 'ترکی ٹوپی' تھی قائداعظم نے منتخب کرکے سر پر لگالی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ محمد علی جناح نے کسی عوامی اجتماع میں ایک ایسی ٹوپی پہن کر شرکت کی جو اُس زمانہ میں مسلم تشخص کی علامت تصور کی جاتی تھی۔

صوبہ سندھ کے نامور مسلم لیگی رہنما محمد ایوب کھوڑو نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں مجھے پہلی مرتبہ محمد علی جناح سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، جب وہ پیر صبغت اللہ شاہ پگارا کے مقدمہ میں خصوصی مجسٹریٹ کی عدالت واقع سکھر میں بطور وکیل صفائی پیش ہونے کے لیے آئے تھے۔ اس دوران اُن کا قیام سرکٹ ہاؤس، سکھر میں تھا۔ مقدمہ کی کارروائی سے جب وہ فارغ ہوئے تو سر عبداللہ ہارون نے جو کراچی سے سکھر آگئے تھے خیرپور ہاؤس میں جناح کے اعزاز میں ایک ظہرانہ ترتیب دیا جس میں سکھر کے معزز شہریوں کی ایک

بڑی تعداد بھی مدعو تھی۔ اس ظہرانہ میں محمد علی جناح بہت جاذب نظر سیاہ اچکن، چوڑی دار سفید پائجامہ اور 'پمپ شوز' جس کا اُس زمانہ میں بہت رواج تھا پہن کر شریک ہوئے تھے۔

۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کی از سرِ نو صدارت قبول کرنے کے بعد ایک عرصہ تک قائداعظم عموماً اچکن کے ساتھ چوڑی دار پائجامہ ہی استعمال کرتے تھے شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ کاٹھیاواڑ خصوصاً جوناگڑھ میں اس طرز کے پائجامے اچکن کے ساتھ پہنے جاتے تھے اور یہ لباس ایک اعتبار سے قائداعظم کا آبائی لباس تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں بھی قائداعظم نے اسی لباس میں شرکت کی تھی۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی نے لکھا ہے کہ اس اجلاس میں شرکت کے لیے قائداعظم جب لکھنؤ پہنچے تو آپ کا قیام راجہ صاحب محمود آباد کی کوٹھی 'محمود آباد ہاؤس' میں تھا۔ پہلے دن کے اجلاس سے ایک گھنٹہ قبل نواب محمد اسماعیل خان بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ حسب معمول بالکل بے عیب لباس میں تھے اور ایک سیاہ سموری ٹوپی زیب سر کیے ہوئے تھے۔ قائداعظم نواب صاحب کی اس ٹوپی کی طرف متوجہ ہوئے اور نواب صاحب سے فرمایا ''کیا آپ اسے تھوڑی دیر کے لیے مجھے دے سکتے ہیں۔'' نواب صاحب نے ٹوپی اتار کر قائداعظم کو دیتے ہوئے کہا کہ اسے زیب سر کر کے دیکھیے۔ قائداعظم نے اسے پہن لیا اور جب سب افراد نے تعریف کی تو ساتھ کے کمرے میں چلے گئے تاکہ آئینہ میں دیکھ کر اس کی موزونیت کا اندازہ لگا سکیں۔ جب دو منٹ بعد قائداعظم برآمدے میں واپس آئے تو سب کی خواہش پر انہوں نے یہی ٹوپی پہن کر اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی نے لکھا کہ ''اجلاس میں قائداعظم کو ٹوپی اور اچکن میں دیکھ کر عوام کے چہرے کھل اُٹھے اور انہوں نے ایسے فلک شگاف نعرے بلند کیے جن کی گونج آج بھی مجھے سنائی دیتی ہے۔'' بقول اصفہانی ''اجلاس ختم ہونے سے پہلے ہی شہر کے بہت سے نوجوانوں اور معمر افراد نے

اسی قسم کی ٹوپیاں پہننا شروع کر دیں۔ کلاہ سازوں نے بھی اس مقبولیت سے فائدہ اٹھایا اور بڑی تعداد میں اسی ڈیزائن کی ٹوپیاں بنانا شروع کر دیں۔ یہی ٹوپی بعد میں 'جناح کیپ' کے نام سے پوری دنیا میں مقبول ہوئی اور آج بھی پاکستان کے قومی لباس کا حصہ ہے۔

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید کا بیان ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح ۱۹۳۶ء کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علموں سے بہت زیادہ مانوس ہو گئے تھے اور اکثر علی گڑھ جاتے رہتے تھے۔ ابتداً آپ نے علی گڑھ کاٹ شیروانی پہنی اور یہ شیروانیاں علی گڑھ کے ہی ایک درزی کے پاس سے سل کر آتی تھیں۔ وہ انگریزی لباس میں ہوتے یا شیروانی میں اُن کی شخصیت ہر لباس میں پروقار اور جاذب نظر ہوتی تھی۔ آپ بیشتر ریشم کا یا سوتی لباس زیب تن کرتے تھے۔ آپ کے لباس کا ستھرا پن دراصل آپ کی باطنی صفائی کا بھی آئینہ دار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نجی اور پبلک لائف میں پاکیزگی آپ کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

مطلوب الحسن سید نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کہا کہ ''ایک صاحب نے قائداعظم کو خط میں تجویز پیش کی کہ اگر وہ ہاتھ کا کاتا ہوا اور ہاتھ کا بنا ہوا گاڑھا کپڑا اپنی پوشاک کے لیے استعمال کریں تو آپ کو عوام میں مزید مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ چونکہ اس قسم کے خطوط اردو میں ہوتے تھے اس لیے میں یہ خطوط قائداعظم کو پڑھ کر سناتا تھا۔ اس خط کو سُن کر قائداعظم نے فرمایا ''اگر عوام میں مقبولیت ڈھونگ رچا کر ہی حاصل کی جاتی ہے تو لعنت ہے ایسی مقبولیت پر۔'' بقول مطلوب الحسن سید عوام کو تو قائداعظم کی خوش پوشی، طرحداری، بانکپن، خودداری اور بے نیازی ہی حد سے زیادہ عزیز تھی۔

بیگم جہاں آرا شاہنواز نے لکھا ہے کہ قائداعظم کی شخصیت نہایت منفرد اور متاثر کن تھی وہ نہایت بے عیب لباس زیب تن کرتے تھے اور وہ جہاں موجود ہوتے

تھے اُن کے وجود سے وقار کی ایک مسحور کن خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی تھی۔ سر اکبر حیدری کی صاحبزادی اور جسٹس بدرالدین طیب جی کے صاحبزادے حاتم بھائی طیب جی کی اہلیہ سیدہ بدرالنساء بیگم نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''لباس کے بارے میں تو بڑے بڑے خوش لباسوں نے یہ کہا کہ جس سلیقہ سے قائداعظم لباس زیب تن کرتے تھے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ نہایت صاف شفاف اور بے شکن لباس پہنتے۔ اگر کبھی سوٹ کے بجائے combination پہنتے تو اُس کا بھی انتخاب نہایت احتیاط اور سلیقے سے کرتے تھے۔'' غرض ہر اعتبار و معیار سے قائداعظم ایک انتہائی خوش لباس آدمی تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے بحیثیت گورنر جنرل اے ڈی سی، گروپ کیپٹن عطا ربانی نے اپنے ایک انٹرویو میں قائداعظم کی جامہ زیبی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ قائداعظم صبح سے شام تک ایک ہی سوٹ میں رہتے تھے۔ وہی سوٹ پہن کر دفتر جاتے اور جب گھر لوٹتے تو اسی سوٹ کو پہنے پہنے تھوڑا بہت آرام بھی کر لیتے تھے لیکن مجال ہے کہ سوٹ کی کریز میں کوئی فرق آئے۔ یہ سب اُن کی نفاست پسندی اور احتیاط کا نتیجہ ہوتا تھا۔ وہ ہر لباس میں خوشنما اور دیدہ زیب لگتے تھے۔ ایک دن آپ کے لیے ٹاٹ کی طرح کا سفید کپڑا خریدا گیا جو دیکھنے میں بالکل معمولی لگتا تھا۔ ہم لوگوں نے سوچا اتنی بڑی شخصیت اور یہ کپڑا۔ مگر جب پہلی مرتبہ اس کپڑے کا سوٹ قائداعظم نے پہنا تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کپڑا کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔

ایک انگریز صحافی اور *An Indian Summer* نامی کتاب کے مصنف جیمز کیمرون (James Cameron) نے قائداعظم محمد علی جناح کی نفاست پسندی کا ایک ذاتی مشاہدہ اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ۱۹۴۵ء میں محمد علی جناح کا انٹرویو کرنے گیا۔ انٹرویو کے لیے مقام قائداعظم کے مطالعہ کا کمرہ طے ہوا تھا۔ جناح نہایت شاندار سوٹ میں ملبوس تھے۔ سوٹ کی سلائی کے ایک ایک ٹانکے سے نفاست عیاں تھی۔ استری اس انداز سے ہوئی تھی کہ سوٹ کی ہر کریز تلوار کی طرح دھار لیے

ہوئے تھی۔ اعلیٰ قسم کے لینن کے سوٹ میں اُن کی آہنی شخصیت بڑی متاثر کن لگ رہی تھی۔ گفتگو کے آغاز کو ابھی شاید آدھا گھنٹہ ہوا تھا کہ اچانک قائداعظم خاموش ہو گئے اور اُن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں معذرت چاہی اور اُٹھ کر اندر گھر میں چلے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید اُن کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ میں ابھی گومگوں کی صورت حال میں تھا کہ وہ مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور پھر خود کلامی کے سے انداز میں معذرت کرتے ہوئے میرے مقابل بیٹھ گئے۔ انہوں نے میز پر رکھے ہوئے اپنے نوٹس اٹھائے اور پھر کہنے لگے، ''میں معذرت خواہ ہوں اس تعطل کے لیے۔ میرے ملازم نے بیوقوفوں کی طرح میری قمیض کی آستینوں میں غلط 'کف لنکس' لگا دیے تھے۔ بہر حال کوئی بات نہیں اب درست ہو گئے ہیں۔''

پروفیسر شریف المجاہد نے لکھا ہے کہ ''۱۹۳۷ء کے بعد جناح نے مسلم لیگ کے اجلاسوں، کانفرنسوں اور عوامی اجتماعات میں اچکن اور تنگ پائجامہ میں شرکت کرنا شروع کر دی تھی لیکن ۱۹۴۳ء کے بعد پنجاب میں خضر حیات کے اعلانِ بغاوت سے انہوں نے اپنی تمام تر توجہ پنجاب اور سرحد کی طرف مبذول کر دی۔ اسی دور میں انہوں نے نیچی شیروانی اور پنجابی شلوار کا استعمال شروع کیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہ ان صوبوں کے عوام سے باعتبار لباس بھی مماثلت اور قربت اختیار کر سکیں۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے بھی آپ نے آزادی کی تقریبات میں شیروانی، شلوار اور جناح کیپ پہن کر ہی شرکت کی۔ یہ لباس نہ صرف اُن پر سجتا تھا بلکہ عوام الناس بھی اسی لباس میں قائداعظم کے دیدار کے خواہاں رہتے تھے۔''

قائداعظم پیپرز میں ایک خط ایسا بھی موجود ہے جس میں قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے لباس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ بانکی پور، پٹنہ

کے ایک شخص سمیع احمد کے خط کے جواب میں قائداعظم نے سری نگر، کشمیر سے ۲۹ مئی ۱۹۴۴ء کو لکھا کہ ”آپ نے لباس کا جو سوال اٹھایا ہے وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ خصوصاً موجودہ حالات میں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ ہندوستان میں ایک لباس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے ہاں بھی۔ بلاشبہ لباس اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں آپ اس کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔“

عینی شہادتوں اور واقعات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کسی ایسے لباس کو زیب تن کرنا پسند نہیں کرتے تھے جس کے ثقافتی وسماجی آداب سے وہ پوری طرح واقف نہیں ہوتے تھے۔ مزید برآں وہ کسی مخصوص لباس کے بھی قائل نہیں تھے۔ اُن کے نزدیک نفاست زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ہر وہ لباس اُن کی نگاہ میں قابلِ قدر تھا جو فرد کے شخصی وقار کے اظہار اور شخصیت کے نکھار میں نہ صرف معاون ثابت ہو بلکہ وقت اور موقع سے مطابقت اور مناسبت رکھتا ہو۔

قائداعظم ،ہیکٹر بولیتھو اور شریف المجاہد

مغرب کے تناظر میں تاریخ نویسی اور سوانح نگاری مشرق اور خصوصاً جنوبی مشرقی ایشیا میں ایک منفرد اور مختلف منہاج و اُصول اور اظہار و بیان رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر مستند تاریخی مواد، تاریخ وار تفصیلات اور دستاویزی ذخائر کی درجہ بندی کی عدم موجودگی میں میسر مواد کی مدد سے موضوعاتی حتیٰ کہ تاثراتی اندازِ تحریر اختیار کرلیا جاتا ہے۔ جہاں تک سوانح عمری کا تعلق ہے اُس میں اصولی طور پر کسی بھی شخصیت کا باریک بینی سے تجزیہ اور اُس سے متعلق حقائق کو دریافت کیا جاتا ہے یعنی اُس شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ مثلاً قریبی دوستوں، رفقا، تجربات، کارہائے نمایاں، کامیابیاں اور ناکامیاں وغیرہ۔ یہ بے کیف تاریخ بشمول تاریخ وار سلسلۂ واقعات غیر ذاتی حقائق مثلاً پیدائش، تعلیم، ملازمت اور وفات کا گوشوارہ نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں معروف افسانوی طرزِ بیاں اور اسلوب ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود سوانح عمری کو بلاشبہ قابل مطالعہ ادب پارہ بہرحال ہونا چاہیے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) کے بارے میں لکھی جانے والی چند سوانح عمریوں کی بھی شاید یہی صورت حال ہے۔ درحقیقت ان سوانح عمریوں اور دیگر ایسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جناح کی زندگی میں شروع ہوگیا تھا۔ ایسی ہی ایک سوانح عمری جس کو ’دکن ٹائمز‘ مدارس کے ایڈیٹر اے اے رؤف نے تحریر کیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ ایک سرسری اور نامکمل سوانح عمری تھی

مگراس کے باوجوداس کتاب کودووجوہات کی بناپرنمایاں پذیرائی اورمقبولیت حاصل ہوئی۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ کتاب اُس وقت شائع ہوئی جب تحریکِ پاکستان اپنے عروج پرتھی اورلحہ بہ لحہ برصغیر کےطول وعرض میں مقبول ہورہی تھی۔ لہٰذاایسے دور میں عوام اپنے عظیم رہنماقائداعظم محمدعلی جناح کےحوالے سے سوانحی تفصیلات جاننے کے آرزومند تھے۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب کے مصنف نے جناح کی دوسری شادی کے حوالے سے ایک ایسی بے بنیادبات درج کردی تھی جوجناح کی شخصیت اورمقبولیت کو گہناسکتی تھی یاحدفِ تنقید بناسکتی تھی۔ چونکہ قائداعظم اپنی نجی زندگی کےحوالے سے حددرجہ حساس اورمحتاط تھے لہٰذاانہوں نے جہاں اس بے بنیاداندراج کافوری طورپر سخت نوٹس لیااورمصنف کے نام ایک خط میں نہ صرف مذکورہ اندارج کی تردید کی وہاں نہایت فراست اورنکتہ رسی کےساتھ اپنے خط میں وہ رہنمااصول بھی تجویز کیے جن کوسوانح نگاروں کوایک متوازن اورغیرمتعصب سوانح عمری لکھنے کے لیے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ قائداعظم نے اے اے رؤف کولکھا ''یہ ایک مصنف کے فرائض منصبی میں شامل ہے کہ وہ کسی شخص کی زندگی سے متعلق اتفاقی حقائق کوپیشگی تصدیق کے بغیر مشتہرنہ کرے۔ میں آپ سے التماس کرتاہوں کہ ہرایسی بات جومیری نجی زندگی سے متعلق ہےاورجس کے بارے میں آپ پُریقین نہیں ہیں اپنی کتاب بے خارج کردیں۔''

اے اے رؤف کی کتاب کے بعد ایک اور کتاب ۱۹۴۵ء میں معروف و مقبول ہوئی جسے قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید نے *Mohammad Ali Jinnah: A Political Study* کےعنوان سے تحریر کیاتھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۵۳ءتک یہ کتاب قائداعظم کی زندگی کے بارے میں واحدمستندکتاب تصور کی جاتی رہی اورآج بھی ایک بنیادی تحقیقی ماخذکی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا شاید ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ کتاب مطلوب الحسن سید نے خود

قائداعظم کے ایما پر تحریر کی تھی۔ قائداعظم کی ۱۹۴۸ء میں وفات کے بعد قائداعظم کی حیات و خدمات پر ایک مفصل اور جامع سوانح عمری کی ضرورت و اہمیت زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی چنانچہ اُس وقت کے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے ایک برطانوی نژاد مصنف ہنری ہیکٹر بولیتھو کو دعوت دی کہ وہ قائداعظم کی سوانح عمری لکھیں۔ بقول معروف مورخ پروفیسر شریف المجاہد ''بولیتھو ایک ناول نگار، تاریخ داں اور سوانح نگار تھا۔ اُس نے سترہ برس کی عمر میں اخبار نویس کی حیثیت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا اور اکیس سال کی عمر میں پرنس آف ویلز (بعدازاں ایڈورڈ ہشتم) کے ساتھ Antipades کا سفر اختیار کیا۔ چوبیس برس کی عمر میں برطانیہ منتقل ہو گیا اور پچیس برس کی عمر میں اُس کا پہلا ناول شائع ہوا۔ جون ۱۹۵۱ء میں جب اُس نے جناح کی سوانح عمری پر کام شروع کیا اُس وقت تک وہ تاریخ، سوانح عمری، سفرنامے، افسانوی ادب کے حوالے سے ۴۶ کتابیں لکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے خطوط کے بھی تین مجموعے مدون کیے تھے۔ لہٰذا اُس نے تحریر و تحقیق کے اعتبار سے ایک وقیع اور ہمہ جہت پس منظر کے ساتھ جناح کی سوانح لکھنے کے کام کا آغاز کیا اور باون سال گزرنے کے باوجود جناح پر اُس کا کام ابھی تک زندہ ہے۔''

اس تحقیقی منصوبے پر عمل درآمد کے دوران ہیکٹر بولیتھو بعض وجوہات کی بنا پر چند بہت اہم دستاویزی ذخائر مثلاً *Jinnah Papers* وغیرہ تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ جناح پیپرز قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل میں تھے اور بقول شریف المجاہد ''بولیتھو کے تحقیقی منصوبہ کی طرف سے محترمہ فاطمہ جناح کا ناقابل توجیہہ معاندانہ رویہ مزید برآں ہندوستان کے تاریخی پس منظر خصوصاً برطانوی اقتدار (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۴۷ء) کی تفصیلات سے اپنی کم واقفیت نے بولیتھو کو مجبور کیا کہ وہ دیگر ذرائع کی جانب رجوع کرے۔'' ظاہر ہے کہ جب اُس کو مکمل تعاون و حمایت اور خودمختاری (جس کا ایک سبب کرنل مجید ملک تھے) نہیں ملی تو اُس کی تحریر کردہ سوانح

عمری سے یہ تمام محدودات عیاں ہوگئیں۔ اس حوالے سے یعنی پیش نظر عہد کے تاریخی، سیاسی اور ثقافتی پس منظر پر عبور حاصل کرنے کے لیے بولیتھو نے ہندوستان اور پاکستان کے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا اور اُن افراد اور سرکاری کارپردازوں سے ملاقاتیں کیں جو یا تو ذاتی طور پر جناح سے واقف تھے یا جو جناح سے اُس دور میں قریب رہے جب وہ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کی خاطر بے تکان جدوجہد کر رہے تھے۔ جون ۱۹۵۱ء سے مئی ۱۹۵۳ء تک بولیتھو اس قسم کی متعدد شخصیات کے تاثرات اور انٹرویوز یکجا کرنے میں کامیاب ہوگیا اُس نے ان تاثرات وانٹرویوز اور دیگر معلومات کو جزوی طور پر اپنی سوانح عمری کا حصہ بنا کر ۱۹۵۴ء کے اواخر میں لندن سے اپنی کتاب *Jinnah: Creator of Pakistan* شائع کر دی۔

بولیتھو اپنی کتاب کی تالیف کے دوران پاکستان کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر کرنل مجید ملک سے رابطہ میں رہا، جنہوں نے اکثر و بیشتر بولیتھو کی اس خودمختاری پر قدغن عائد کی جس کو بولیتھو نے اپنا حق تصور کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود چونکہ یہ قائداعظم کی پہلی مکمل سوانح عمری تھی اس لیے نہ صرف یہ کثرت سے زیر مطالعہ آئی بلکہ اس کو بے پناہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ دیگر باتوں کے علاوہ جس خصوصیت نے اس کتاب کو نہایت مقبول اور معروف کیا وہ یہ حقیقت تھی کہ یہ کتاب ایک مغربی اور غیر ملکی مصنف نے مشرق کے ایک ایسے رہنما کے بارے میں لکھی تھی جو اپنے مغربی طرزِ زندگی کے باوجود بلاشرکت غیرے جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں کے قائداعظم کے منصب پر فائز تھے۔

اس کتاب کی تصنیف کے دوران بولیتھو کو متعدد ان دیکھی مشکلات، رکاوٹوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس نے یہ واقعات اگرچہ اپنی کتاب میں شامل نہیں کیے لیکن ان کو اپنی نجی ڈائری میں درج کرتا رہا۔ مزید یہ کہ اپنی ذاتی ڈائری کے علاوہ نہ

صرف اپنی کتاب کے اصل مسودہ کو محفوظ رکھا بلکہ اُس گفتگو اور مراسلت کو بھی محفوظ رکھا جو اُس نے کرنل مجید ملک اور دیگر افراد سے کی تھی۔ بقول شریف المجاہد ''بولیتھو نے جناح کی سوانح عمری سے متعلق تمام پیپرز ۶۰۔۱۹۵۹ء کے دوران سینٹ پال (مِنی سوٹا، امریکہ) کے ایک تاجر Charles Leslie Ames کے سپرد کر دیئے۔ بعدازاں چارلس نے اپنے پاس موجود جنوبی ایشیا سے متعلق تمام کاغذات بشمول بولیتھو پیپرز کے یونیورسٹی آف مِنی سوٹا، سینٹ پال کو عطیہ کر دیئے جہاں جنوبی ایشیا کے حوالے سے ایمس لائبریری قائم ہے۔''

بولیتھو کے کاغذات کا سب سے اہم حصہ اُس کا غیر تلخیص شدہ اور غیر تطہیر شدہ اصل مسودہ، اُس کی ڈائری کے ۱۹۵۱ء سے مئی ۱۹۵۳ء تک کے عرصہ پر مشتمل اندراجات اور کتاب سے متعلق کچھ خطوط ہیں۔ جو آج بھی مِنی سوٹا کی لائبریری کا حصہ ہیں۔ ہیکٹر بولیتھو کے مذکورہ پیپرز یا مسودات بلاشبہ نہ صرف تحریکِ پاکستان کے طالب علموں کے لیے بلکہ ساتھ ہی ساتھ پاکستان کی جدوجہد کے دوران جناح کو پیش آنے والے نامعلوم اور غیر بازیافت شدہ پہلوؤں کے حوالے سے بھی نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ قائداعظم اکادمی کے سابق بانی ڈائریکٹر اور معروف مورخ پروفیسر شریف المجاہد نے ہیکٹر بولیتھو کی ذاتی ڈائری، معاصر پاکستانی اور ہندوستانی ہم منصب افراد سے اُس کی مراسلت، کتاب کی اشاعت کے بعد اخبارات میں شائع ہونے والے تبصروں کو مدون کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب اُن غیر مطبوعہ حقائق و واقعات کی بازیافت ہے جو کسی بنا پر ہیکٹر بولیتھو کی کتاب کا حصہ نہیں بن سکے تھے۔ یہی نہیں یہ کتاب اُن واقعات وحقائق کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ جن کو ہیکٹر بولیتھو اپنی کتاب کا حصہ نہیں بنا سکا تھا۔

پروفیسر شریف المجاہد نے اپنی تدوین کے آغاز پر ایک نہایت مبسوط تحقیقی پیش لفظ تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے اپنی تدوین کے اوصاف اور محدودات کو نہایت

مشاقی اور محنت سے یکجا کیا ہے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں ''ایک طویل تلاش و جستجو، رسائی کے لیے جدوجہد، کثیر وقت، متعدد سفر اور مالی اخراجات کے نتیجہ میں میری اُس ذخیرہ تک رسائی ممکن ہو سکی جہاں جناح سے متعلق ہیکٹر بولیتھو کے کاغذات محفوظ تھے۔'' پروفیسر شریف المجاہد نے ۱۹۸۴ء میں بولیتھو کی ڈائری اور دیگر کاغذات بازیافت کر لیے تھے لیکن اُن کو جس بات نے موجودہ تحقیق کو تاخیر سے پیش کرنے پر مجبور کیا اُنھوں نے اُس کے اسباب و وجوہات کو پیش نظر کتاب کے پیش لفظ میں بڑی وضاحت سے درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میں نے صورت حال کے معمول پر آنے تک اس مسودہ کی اشاعت کو یوں موخر کیا کہ کچھ مدت قبل میری کتاب *Quaid-I-Azam Jinnah: Studies in Interpretation* (۱۹۸۱ء) کے خلاف ایک مہم کو ہوا دی گئی تھی جس کی بنا پر صاحبانِ اقتدار کو مداخلت کرنا پڑی لیکن میں اس طوفان کے بیٹھ جانے کا انتظار کر سکتا تھا۔ بہر حال اس انتظار کا ایک مثبت نتیجہ برآمد ہوا کہ میری کتاب کے بارے میں یہ شک وشبہ کہ وہ حکومت کے ایما پر لکھی گئی ہے، ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

فضا کے سازگار ہو جانے کے بعد پروفیسر شریف المجاہد نے بولیتھو کے غیر مطبوعہ پیپرز کی جو ۵۴ سال سے التوا میں تھے اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔ بقول شریف المجاہد ''بولیتھو کے کاغذات میں دھماکہ خیز مواد موجود تھا اور میں کسی مزید تکلیف دہ صدمہ سے گزرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب فضا بھی نہایت سازگار ہو گئی تھی اور قوم بھی وقت کے ساتھ ذہنی طور پر اس قدر بالیدہ ہو گئی تھی کہ وہ جناح پر بھی تنقید برداشت کر سکتی تھی۔ اس صورت حال نے میرے اندر حوصلہ پیدا کیا کہ میں اس تحقیق کو مکمل کروں۔ مجھے

یقین ہے کہ یہ کتاب بیک وقت جناح اور پاکستان کے حوالے سے تاریخی نویسی میں ایک نمایاں اضافہ ثابت ہوگی۔"

پروفیسر شریف المجاہد کی یہ کتاب ہیکٹر بولیتھو کی اصل اور غیر مطبوعہ دستاویزات کے مدد سے یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ہیکٹر بولیتھو کو جناح کی سوانح عمری کو مکمل کرنے میں کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ محترمہ فاطمہ جناح نے اُس سے عدم تعاون کا رویہ اختیار کیا۔ شریف المجاہد کی کتاب کا "پیش لفظ" بلاشبہ تحقیق کے اعلیٰ معیار کا نمونہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف کچھ حقائق کو بازیافت کر کے اُن کی اصل صورت حال کو واضح کیا ہے بلکہ ان حقائق کو بڑی حد تک معتبر بنا دیا ہے۔ مزید یہ کہ پروفیسر شریف المجاہد نے ہیکٹر بولیتھو کی ذہنی نفسیات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> اسے خوش قسمتی کہیے کہ حکومتِ پاکستان نے بولیتھو سے جو معاہدہ کیا تھا اُس میں جبری قطع و برید بھی شامل تھا بصورت دیگر بولیتھو کی ہندوستان کی تاریخ اور سیاست سے لاعلمی، پاکستانی معاشرے، ثقافت، رسم و رواج اور طریقہ برتاؤ کے بارے میں تحقیر آمیز رویہ کے پیش نظر ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کس نوعیت کی سوانح عمری تحریر کرتا۔

بلاشبہ ہیکٹر بولیتھو کی ڈائری، دستاویزات اور اندراجات عام قاری، جناح کے سوانح نگاروں اور اسکالرز کے لیے بڑے انمول ہیں۔ مزید یہ کہ ان سے نہ صرف جناح کی شخصیت اور سیاست کے نئے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں بلکہ ان سے بولیتھو کے ذہنی رویہ، طور طریقوں اور تعصّبات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر شریف المجاہد نے اپنے پیش لفظ میں اپنی کتاب کی معروضی موضوعیت کا بھی احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ موجودہ "پیش لفظ" میں دو اہم پہلوؤں کی دریافت پر توجہ مرکوز کی گئی

ہے۔ اوّل یہ کہ جناح کی شخصیت کی ایسی تصویر کشی جو بولیتھو کے کیے گئے انٹرویوز سے ظاہر ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف بیک وقت اُن غلط حقائق اور انٹرویو دینے والے افراد کی کم علمی کی بھی موجودہ کتاب یا کہیں اور درج معلومات کے حوالے سے ٹھوس شواہد کی بنیاد پر نشاندہی کی گئی ہے۔ بہرحال داخلی شواہد بذاتِ خود اُس وقت تک تاریخی حقائق کی شکل اختیار نہیں کرتے جب تک کہ بیرونی شواہد کی بنیاد پر اُن کی صحت اور جواز کی شہادت فراہم نہ کر دی جائے۔ دوئم یہ کہ بولیتھو نے برصغیر کے چھ ماہ کے سفر کے دوران جن مقامات کا دورہ کیا اور مختلف مواقع پر اُسے جن افراد سے ملاقات کا موقع ملا اور جو کہانیاں اُس نے سنی تھیں اُن کے حوالے سے بولیتھو کے تفہیمی رویہ اور ذاتی عناد و تعصبات کی بھی پیش لفظ میں نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر شریف المجاہد نے اپنے تجزیاتی پیش لفظ میں نہایت مہارت کے ساتھ جناح کے اُس خاکہ کو اجمالاً بیان کیا ہے جو ہیکٹر بولیتھو نے اپنی کتاب *Jinnah: Creator of Pakistan* میں درج کیا ہے۔ بقول پروفیسر شریف المجاہد ''موجودہ مطالعہ میں جناح کی خوبیوں اور کمزوریوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ تفصیلات محققین اور اہلِ علم کے لیے نہ صرف بحیثیت انسان جناح کا تجزیہ کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی بلکہ جناح کی سیاست اور فکری میلانات کے بعض سنگین اور پیچیدہ پہلوؤں کی بھی وضاحت کریں گی۔ اُمید ہے کہ اس طرح کی کوشش ایک وکیل، ایک قانون دان، ایک سیاستدان اور مملکتِ پاکستان کے بانی کی حیثیت سے جناح کی شخصیت کو صحیح اور متوازن طور پر اُجاگر کرے گی۔

ایک سچے اور محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے پروفیسر شریف المجاہد نے مناسب طور پر جناح کے مقصد اور تصور یعنی ترقی پذیر پاکستان کی بھی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جناح بذاتِ خود یہ چاہتے تھے کہ پاکستانیوں کے لیے اُن کا سب سے اہم تحفہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان کے خیالات کو سماجی عمل میں سمونے کے

بجائے ان کی ناقابل شکست کامیابیوں کا معمول کے مطابق یا رسمی طور پر زبانی اقرار کریں یا وہ پاکستان کو ایک جدید، ترقی یافتہ، مستقبل آشنا، فلاحی، جمہوری اور اسلامی مملکت دیکھنے کے خواہش مند تھے۔"

جیسا کہ پروفیسر شریف المجاہد نے لکھا ہے کہ انہوں نے ہیکٹر بولیتھو کے شخصی طرزِ عمل کی جو کہ اُس کی ڈائری اور اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کسی حد تک نفسیاتی تشخیص کی ہے اور پھر معروضی طور پر پاکستانی معاشرے اور ثقافت کے بارے میں اس کے تعصّبات اور کھلے ہوئے عناد کا تعین کیا ہے۔

پروفیسر شریف المجاہد لکھتے ہیں کہ "بولیتھو کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود پسند، متکبر اور ازخود دیانت دار اور عادل ثابت کرتا ہے۔ اُس کی آراء ہمیشہ واضح اور بڑی حد تک نہ صرف زیادہ بے لاگ بلکہ راست بازی سے ماورا اور عقل وفہم سے عاری ہوتی ہیں۔ درحقیقت ان آراء کا زیادہ تر حصہ بے اعتدالی کی حدود کو چھوتا ہے۔ بولیتھو کا میلان طبع بڑا حیرت انگیز اور واضح ہے۔۔۔ جس میں نسل پرستی اور مضبوط نوآبادیاتی نظام کے مابعد اثرات چٹخارہ کی حد تک موجود ہیں۔"

ایک بین الاقوامی اعزاز کے حامل ماہر محقق کی حیثیت سے پروفیسر شریف المجاہد نے افراد اور ان مقامات کے حوالے سے جن کا بولیتھو نے دورہ کیا یا جن افراد سے اُس نے ملاقات کی اور بولیتھو کے تبصروں اور خیالات پر موضوعات کے تحت بھی گفتگو کی ہے۔ ان موضوعات میں سے چند یہ ہیں:

...... پاکستانی عوام اور جناح
...... پاکستانی اور بھارتی عوام کی سنائی ہوئی کہانیاں
...... فاطمہ جناح کے بارے میں
...... خواجہ ناظم الدین کے بارے میں

بولیتھو اور اُس کی محدودات کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر شریف المجاہد نے

بولیتھو کی ڈائری اور اندراجات کے نتیجہ میں جناح کے حوالے سے مطالعہ میں جو قابل ذکر اضافہ ہوا ہے اُس کو بھی فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> بولیتھو کا سب سے زیادہ اہم اضافہ اور کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے بانیٔ پاکستان کے حوالے سے ایک نسل کے پاس یادداشتوں کی صورت میں جو قیمتی خزانہ موجود تھا اُسے محفوظ کر دیا۔ اگر چہ اُس نے اُن افراد کے جو جناح سے مختلف حیثیتوں اور مختلف سطحوں پر ذاتی طور پر واقف تھے جناح کے انتقال کے چار یا پانچ سال کے اندر ہی انٹرویوز کر لیے تھے لیکن اس کے باوجود یادداشتوں پر مبنی ایک بڑا خزانہ ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گیا۔ ہیکٹر بولیتھو کا یہ کارنامہ اُس کی تحریر کردہ سوانح سے زیادہ اہم اور زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر بولیتھو کی کتاب زندہ رہے یا نہ رہے اُس کی ڈائری اور اندراجات جب تک پاکستان قائم ہے، زندہ رہیں گے۔

ہیکٹر بولیتھو کے بے ترتیب کاغذات کو منطقی انداز میں ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر کے پروفیسر شریف المجاہد نے ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ درحقیقت اگر وہ اپنی تحقیقی صلاحیتوں اور ٹھوس علمی تجربہ کو بولیتھو کے غیر مطبوعہ کاغذات کے مندرجات کی وضاحت میں استعمال نہ کرتے تو مستقبل کے اسکالرز، طالب علم اور جناح کی سوانح عمری پر کام کرنے والے بانیٔ پاکستان کے گرد بکھرے ہوئے حقائق کا کلیتاً تجزیہ کرنے کے اہل نہیں ہو سکتے تھے۔ پروفیسر شریف المجاہد نے پیش نظر کتاب کے ابواب کو نہایت مہارت کے ساتھ مرتب و تقسیم کیا ہے جس سے مورخین اور سوانح نگاروں کو بڑی حد تک سہولت حاصل ہو گی۔ تاریخی پس منظر سے مزین پیش لفظ کے

بعد پروفیسر شریف المجاہد نے ابواب کو اس طرح مرتب کیا ہے۔

۱) ڈائری اور اندراجات، نومبر ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۳ء

۲) ہیکٹر بولیتھو اور کرنل مجید ملک کی خط و کتابت

۳) ہیکٹر بولیتھو کی متفرق خط و کتابت

۴) معاصر تبصرے

۵) کتاب *Jinnah: Creator of Pakistan* کے قلم زد شدہ حصے

۶) یومِ پاکستان کے بارے میں ہیکٹر بولیتھو کی شکایات

ہیکٹر بولیتھو نے ہندوستان اور پاکستان کے سفر کے دوران جن شخصیات سے ملاقاتیں کیں اور جن کے تاثرات اُس کی ڈائری اور یادداشتوں میں درج ہیں اُن میں لندن میں پاکستان ہائی کمشنر آفس کے پریس اتاشی سلمان علی، جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری (۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۴ء) کے ایچ خورشید، جناح کے خاندان کے افراد، محترمہ فاطمہ جناح، ہز ہائی نس آغا خان، عبدالقیوم خان، گورنر آف سندھ دین محمد، پیر پگارا، خواجہ ناظم الدین وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوستان میں اُس نے جن افراد سے ملاقات کی اُن میں دیگر کے علاوہ اٹارنی جنرل موتی لال سیتلواڈ، بمبئی کے چیف منسٹر مرار جی ڈیسائی، لیڈی پیٹٹ اور نیولی واڈیا شامل تھے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ ہیکٹر بولیتھو کی کتاب کی اشاعت کے تیس سال بعد ۱۹۸۴ء میں ایک امریکی پروفیسر اسٹینلے والپرٹ نے جناح کی ایک اور سوانح عمری *(Jinnah of Pakistan)* تحریر کی لیکن وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح پاکستان کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی پس منظر سے کلی طور پر ناواقف تھا۔ باوجود اس کے محتاط طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کسی بھی غیر ملکی یا اجنبی سوانح نگار کے تقابلے میں پاکستانی مورخین زیادہ

بہتر انداز میں محمد علی جناح کی ایک جامع اور مستند سوانح عمری لکھ سکتے ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں یا اس سے کچھ زائد عرصے میں پاکستانی مورخین اور محققین نے جناح کی حیات و خدمات پر کچھ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انہی کتابوں میں ایک کتاب *Quaid-I-Azam Jinnah: Studies in Interpretation* بھی ہے جو پروفیسر شریف المجاہد کی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ متعین اور مروجہ معنی میں سوانح عمری کے ضمن میں نہیں آتی لیکن بہر اعتبار یہ کتاب قائداعظم کے حوالے سے ایک ایسی نمایاں، تجزیاتی اور توضیحی تشریح ہے جو اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے نہایت مفید اور بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مرحلہ پر انتہائی تاسف کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابھی تک کسی بھی پاکستانی مصنف نے جناح کی کوئی ایسی مستند اور جامع سوانح عمری تحریر نہیں کی ہے جس کو بین الاقوامی طور پر پیش کیا جاسکے۔ یقیناً یہ ایک ایسا خلا ہے جس کو بہر صورت پُر کیا جانا چاہیے۔ بلاشبہ پروفیسر شریف المجاہد نے اپنی پیش نظر تدوین *In Quest of Jinnah* میں جناح کی سوانح عمری کے حوالے سے موجود خلا کو پُر کرنے کے لیے نہ صرف پاکستانی سوانح نگاروں کے لیے راستہ ہموار کیا ہے بلکہ قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے سے ضروری اور ناگزیر تفصیلات کو بھی یکجا کر دیا ہے۔

قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن پلان

تحریک پاکستان کے حوالے سے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو بھی تقریباً وہی اہمیت حاصل ہے جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اسلامیان ہند نے اپنے محبوب قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک علیٰحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اور ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اس مطالبہ کو سرکاری سطح پر تسلیم کرلیا گیا۔ ان دونوں تاریخوں کے درمیان تقریباً سات سال دو ماہ اور دس دن کا عرصہ پھیلا ہوا ہے، اور اس عرصہ میں تحریک پاکستان کی وہ تاریخ اور جدوجہد پھیلی ہوئی ہے جس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ اس جدوجہد کی داستان طویل بھی ہے اور دلخراش بھی۔ اس داستان میں جہاں عزم وارادے کی پختگی کے قابلِ رشک واقعات ہیں وہاں وفاداری بشرطِ استواری کی ولولہ خیز حکایتیں بھی موجود ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف غیروں کے ستم ہیں تو دوسری طرف اپنوں کی بے وفائیاں بھی ہیں۔ یہی وہ جدوجہد تھی جس کے نتیجہ میں بالآخر ایک تصور کو معروضی شکل میسر آئی اور ایک منتشر افرادی وعددی قوت ایک مستحکم قوم کا روپ دھار گئی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء اگر اس جدوجہد کا نقطہ آغاز تھا تو ۳ جون ۱۹۴۷ء اسی جدوجہد کا نقطۂ عروج تھا۔

ہندوستان کے مسئلہ کا آئینی حل تلاش کرنے کے سلسلے میں سرکاری سطح پر جو کوششیں کی گئیں اگرچہ ان میں کیبنٹ مشن پلان کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اس لحاظ سے ماؤنٹ بیٹن پلان زیادہ قابل ذکر ہے کہ اس پلان کے تحت ہندوستان کو

واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے مطالبہٗ پاکستان کی عملی حیثیت کی توثیق کی گئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو بادشاہِ انگلستان کا قریبی عزیز اور جواہر لال نہرو کا قریبی دوست تھا ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو بحیثیت وائسرائے ہندوستان پہنچا۔ اُس کو ہندوستان کی سیاسی صورتحال سے نہ صرف کماحقہ آگاہی حاصل تھی بلکہ وہ ہندوستان اس ارادے سے ہی آیا تھا کہ وہ ہندوستان کو حتیٰ المقدور متحد رکھنے کی کوشش کرے گا۔ جیسا کہ بعد میں خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے ایک انٹرویو میں اقرار کیا کہ "میں متحدہ ہندوستان پر پختہ یقین رکھتا تھا۔۔۔اور میرا خیال تھا کہ میں ہندوستان کو متحد رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وائسرائے کے عہدے پر متمکن ہونے تک ماؤنٹ بیٹن پاکستان کے قیام کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد سب سے پہلے جواہر لال نہرو سے ملاقات کی اور اس ملاقات کے تقریباً بارہ دن بعد یعنی ۵/اپریل ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح سے مذاکرات کیے۔ ابتداً ماؤنٹ بیٹن "کیبنٹ مشن پلان" کے تحت ایک متحدہ حکومت کے لئے کوشش کرتا رہا لیکن کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے ساتھ گفت وشنید کے پہلے دو ہفتوں میں ہی اُسے یقین ہو گیا کہ کیبنٹ مشن پلان پر اصرار جاری رکھنا بالکل بے سود ہے، اور اس یقین نے اُس کی رہنمائی کسی متبادل پلان کی جانب کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی رہنماؤں سے مذاکرات کے دوران ہی ایک متبادل منصوبہ تیار کر لیا۔ چوہدری محمد علی نے اپنی کتاب *The Emergence of Pakistan* میں کہا ہے کہ ۲۶/اپریل کو ماؤنٹ بیٹن نے اپنے چیف آف اسٹاف لارڈ اسمے اور جارج ایبل کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں اپنے ساتھ مذکورہ منصوبہ کا ابتدائی مسودہ لے کر جانا تھا تا کہ حکومت برطانیہ اور متعلقہ حکام کے ساتھ اس منصوبہ کی ہر شق پر مفصل غور وخوض کیا جا سکے۔ اس منصوبے کے تحت "جزیرہ نمائے

ہند کو دو آزاد اور خود مختار مملکتوں میں تقسیم کیا جانا تھا" ایک ہندو اکثریت والی مملکت جسے "انڈیا" کا نام دیا جانا تھا اور دوسری مسلم اکثریت والی مملکت جسے "پاکستان" کے نام سے موسوم ہونا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے حوالے سے دو عشروں کے دوران شائع ہونے والی "لیرے کولنز اور ڈومانکیو لاپیئر" اور لطیف احمد شیروانی کی کتابوں کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن پیپرز اور اُس دور کی دیگر دستاویزات کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم سے بچانے کے لئے ماؤنٹ بیٹن اور کانگریس کے درمیان بے حد ربط وتعاون موجود تھا اور انہوں نے آخری لمحہ تک اس ضمن میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ وہ قیام پاکستان کے شدید ترین مخالف تھے لیکن بلاشبہ یہ قائد اعظم کی مہارت، کارکشائی اور غیر معمولی سیاسی بصیرت کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے تمام مخالف قوتوں کو بالآخر مطالبۂ پاکستان کو حق بجانب تسلیم کرنے پر مجبور کردیا۔ خصوصاً ماؤنٹ بیٹن کو قائداعظم محمد علی جناح سے مذاکرات میں شکست اُٹھانی پڑی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن نے انتقامی جذبے سے کام لیتے ہوئے یہ طے کرلیا کہ اگر اُسے تقسیمِ ہند پر مجبور ہونا پڑا تو وہ بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کردے گا۔ اُس کا خیال تھا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے نتیجے میں ان صوبوں کے مسلمانوں پر سے نہ صرف قائداعظم کا اثر ورسوخ ختم ہوجائے گا بلکہ ایک ایسا پاکستان معرض وجود میں آئے گا جو ناقابلِ عمل ہوگا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اس تقسیم کی شدید مخالفت کی وہ "کرم خوردہ" یا "کٹا پھٹا" پاکستان قبول کرنے پر ہرگز رضامند نہیں تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں نہایت سخت بیانات بھی جاری کیے لیکن اس کے باوجود تقسیمِ ہند کے منصوبے کو تسلیم کرنے پر وہ آمادہ وتیار تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ بالآخر ماؤنٹ بیٹن یا حکومت برطانیہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے کہ انصاف اور معقولیت کا تقاضا ہے کہ مذکورہ دونوں صوبوں کو تقسیم نہ کیا جائے اور یہ مکمل طور پر پاکستان کا حصہ قرار پائیں۔ مگر اُن کو

اپنی ان کوششوں میں صرف احتجاج کی حد تک کامیابی ہوئی کیونکہ ایک مرحلہ پر برطانوی حکومت نے بھی ان صوبوں میں تقسیم کے سوال پر ریفرنڈم کا انعقاد کرانے کی قائداعظم کی تجویز کو نہایت ہٹ دھرمی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ یہی نہیں اس ضمن میں اُن کو دھمکیاں بھی دی گئیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ نے اس منصوبہ کو منظور نہیں کیا تو آپ اُس پاکستان سے بھی محروم ہو جائیں گے جس کے لئے آپ برسوں سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان حالات میں قائداعظم کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ مشروط طور پر اس منصوبے کو منظور کر لیں، انہوں نے ۲ رجون ۱۹۴۷ء کی شام کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور واضح طور پر اُس سے کہہ دیا کہ ''میں ذاتی طور پر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں مسلم لیگ کی کونسل سے اس منصوبے کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' تقسیمِ ہند کے اس سنگین ترین مرحلہ میں قائداعظم کی خود اعتمادی اور اپنے مؤقف کو آخر وقت تک تسلیم کرانے کے لئے جدوجہد پر ماؤنٹ بیٹن نے اپنے خطوط اور رپورٹس میں حیرت کا اظہار کیا۔

حتیٰ کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو، سردار بلدیو سنگھ اور قائداعظم محمد علی جناح نے آل انڈیا ریڈیو سے اس منصوبے کی منظوری کا اعلان کیا تو قائداعظم واحد رہنما تھے جنہوں نے تاسف کے ساتھ اس منصوبے کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ انہوں نے اپنی نشری تقریر میں کہا کہ:

> یہ امر واضح ہے کہ یہ منصوبہ چند اہم امور میں ہمارے نقطۂ نظر سے ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں اور نہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم مطمئن ہیں اور نہ یہ کہ منصوبے میں بعض امور کو جس طرح طے کیا گیا ہے اُن سے ہم متفق ہیں۔ اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ آیا اس منصوبے کو جو ہز میجسٹی کی گورنمنٹ نے ہم کو پیش

کیا ہے مصالحت کے طور پر قبول کیا جائے یا اسے تصفیہ قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں حتمی فیصلہ کرنے کی مجاز صرف آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل ہے جس کا اجلاس ۹ رجون کو منعقد ہوگا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اگرچہ اپنی اس تقریر میں منصوبے کے مندرجات پر اعتماد کا جزوی طور پر اظہار کیا تھا لیکن اس مرحلہ پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی کہ ''پاکستان'' کے قیام کا مطالبہ حتمی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے اور یہی وہ بات تھی جس نے ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو احساسِ کامرانی سے سرشار کردیا تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر کے آخر میں ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ بلند کیا جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک ولولۂ تازہ میسر آیا مگر ہندوؤں میں شدید غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا تصور ہی نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا ایک ایسے موڑ پر جب حالات اپنی حتمی تقدیر کی طرف جارہے تھے شاید ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوؤں نے محمد علی جناح اور منظر پر موجود کانگریسی رہنماؤں کی حکمتِ عملی کا تقابلی جائزہ لینا شروع کردیا۔ اس مرحلے پر وہ نہ صرف کانگریسی قیادت کی طرف سے بددل ہوئے بلکہ وہ محمد علی جناح کی اعلیٰ سیاسی صفات اور مسلمانوں کے قومی مقاصد سے اُن کی وفاداری کا واضح اعتراف کرنے لگے۔

ملٹری اکاؤنٹس کے ایک اعلیٰ افسر اور صاحبِ طرز شاعر محب اللہ عارفی نے اپنے ایک مضمون میں قائداعظم کی اس تقریر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''قائداعظم کی یہ تقریر دہلی میں مَیں نے اپنے چند دفتری رفیقوں کے ساتھ سنی تھی۔ تقسیمِ ہند کا فیصلہ سن کر ایک صاحب جو کانگریسی ہندو تھے غصہ سے کانپنے لگے اور بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کو گالیاں دینے لگے۔ ان صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلے ہوئے ایک فقرے کا مفہوم کچھ یوں تھا ''کاش جناح ہندوؤں میں پیدا ہوا ہوتا۔''

تقسیمِ ہند کے آخری مرحلہ اور پاکستان کے قیام کے اصولی فیصلے کے اعلان کے بعد

اس نوع کے تجزیے متحدہ ہندوستان کی سیاسی فضاؤں میں عموماً سنائی دیتے تھے۔ انہی تجزیوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اگر کانگریس میں ایک جناح ہوتا اور مسلم لیگ میں سو گاندھی اور نہرو ہوتے تو ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوتا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے جناح کی تقریر کو حتمی کامیابی کے طور پر قبول کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر اور قائداعظم کو ہزاروں کو تعداد میں خطوط اور ٹیلیگرام ارسال کیے اور قیامِ پاکستان کے فیصلے پر جہاں خوشی کا اظہار کیا وہاں لیگی رہنماؤں کو اپنی مکمل حمایت کا یقین بھی دلایا۔

۳ر جون پلان کے ذریعہ جو عرف عام میں ''ماؤنٹ بیٹن پلان'' کے نام سے معروف ہے پاکستان حاصل کرنا اور بالخصوص اُن قوتوں سے مناظرے اور مذاکرات کے بعد پاکستان حاصل کرنا جو اُس وقت مسلمانوں کے علیٰحدہ وطن کے مطالبے کے خلاف آہنی دیوار بنی ہوئی تھیں بلاشبہ قائداعظم کی ایک بہت بڑی اور عظیم الشان کامیابی تھی۔ ایک ایسی تاریخ ساز کامیابی جس پر ہر محبِ وطن پاکستانی ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔

قائداعظم کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ

ہندوستان میں ایک علیحدہ مسلم وطن کے حصول کی جدوجہد کا آغاز اگرچہ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) سے ہی ہوگیا تھا لیکن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں منظور کی جانے والی علیحدہ وطن کے قیام کی قرارداد کے نتیجے میں اسے واضح خطوط میسر آئے۔ قائداعظم محمد علی جناح جو عرصہ دراز سے مسلمانانِ ہند کے رہنما کا فریضہ انجام دے رہے تھے اور ۱۹۳۸ء میں مسلمانوں کے قائداعظم کے منصب پر فائز ہو چکے تھے دراصل اس قرارداد کے روحِ رواں تھے اور انہی کی قیادت میں اس قرارداد کی روشنی میں وہ عظیم جدوجہد شروع ہوئی جسے تاریخ میں تحریکِ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تحریک تقریباً ۷ سال ۴ ماہ اور ۲۰ دن جاری رہی۔ اس تحریک کا آغاز نہایت نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں ہوا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس تحریک کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے اور مسلمانانِ ہند اس تحریک کی کامیابی کے لیے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد و منظم ہو گئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہونے والی قرارداد کے بعد جسے بعد میں قراردادِ پاکستان کہا گیا، مارچ ۱۹۴۲ء میں ایک سرکاری وفد نے جو ''کرپس مشن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اپنی تجاویز پیش کیں۔ یہ تجاویز ہندوستان کی آئینی اصلاحات کے ضمن میں اس بنا پر بڑی اہمیت کی حامل ہیں کہ ان تجاویز میں پہلی مرتبہ سرکاری سطح پر تقسیمِ ہند کے اصول کو تسلیم کیا گیا تھا۔ کرپس تجاویز کے بعد عمومی طور پر یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہندوستان کے آئینی مسائل کا حل صرف تقسیم میں مضمر ہے۔ انہی تجاویز

کے بعد آئندہ پانچ سال کے دوران مطالبۂ پاکستان ناگزیر ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کی ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے منظوری دے کر قیامِ پاکستان کی توثیق کر دی۔

کرپس تجاویز اور ماؤنٹ بیٹن پلان کی درمیانی مدت تقریباً پانچ سال ہے اور یہ پانچ سال ہندوستان کی تاریخ کے نہایت اہم، پیچیدہ اور سنگین سال تھے۔ ایک طرف برطانیہ اپنے اقتدار کو سمیٹنے کی فکر میں تھا اور دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کی تقسیم پر رضامند نہیں تھی جبکہ مسلم لیگ کسی قیمت پر بھی مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسی صورتِ حال میں مارچ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے نئے وائسرائے کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر بڑے خدشات کا پیش خیمہ تھا کیونکہ کانگریس کی قیادت سے اُن کے قریبی مراسم ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ مورخین اور مبصرین نے اسی بنا پر اس دورانیہ کو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے پیچیدہ اور فیصلہ کن دورانیہ قرار دیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک اس دورانیہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ ان لکھنے والوں میں برطانیہ، امریکہ، بھارت اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے مورخین شامل ہیں اور ہر شخص نے اس دورانیہ میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی توضیح و تشریح اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق کی ہے جس کی بنا پر حقائق کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ آج بھی ان تحریروں سے نتائج اخذ کرنے میں دشواری اور تذبذب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاید اس کی ایک واضح وجہ یہ بھی رہی کہ اس دور سے متعلق سرکاری دستاویزات سربمہر تھیں لٰہذا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک اس دورانیہ پر تحقیق کرنے والوں کو اپنے موقف کی وضاحت کے لیے ثانوی ماخذ پر انحصار کرنا پڑا۔ تاہم ۱۹۷۰ء کے بعد جب سرکاری دستاویزات منظرِ عام پر آنے لگیں تو مذکورہ بالا عرصہ میں تحریر کی جانے والی کتابوں کے بعض مندرجات نہ صرف ترمیم و توثیق طلب ہو گئے بلکہ بعض مورخین اور

کذب بیانیوں کا پردہ بھی چاک ہوگیا۔اس کے باوجود چند کتابیں اب بھی ایسی ہیں جو اپنے کچھ مشتبہ مندرجات کے باوجود اساسی حیثیت رکھتی ہیں اور آج بھی جبکہ بیشتر سرکاری دستاویزات سامنے آ چکی ہیں، ان کتابوں کے مندرجات پر انحصار کرنے کی ضرورت اپنی جگہ موجود ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران اس موضوع پر جو اہم کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱) ایلن کیمبل جانسن، *Mission With Mountbatten* (لندن: ۱۹۵۱ء)
۲) ای ڈبلیو آر لمبے، *The Transfer of Power in India (1945-7)* (لندن: ۱۹۵۴ء)
۳) وی پی مینن، *Transfer of Power in India* (کلکتہ: ۱۹۵۷ء)
۴) ابوالکلام آزاد، *India Wins Freedom* (کلکتہ: ۱۹۵۹ء)
۵) لیونارڈ موسلے، *The Last Days of The British Raj* (لندن: ۱۹۶۱ء)
۶) چوہدری محمد علی، *The Emergence of Pakistan* (نیویارک: ۱۹۶۷ء)
۷) لطیف احمد شیروانی، *Pakistan Resolution to Pakistan (1940-1947)* (کراچی: ۱۹۶۹ء)
۸) ایچ وی ہڈسن، *The Great Divide: Britain-India-Pakistan* (لندن: ۱۹۶۹ء)

۱۹۶۱ء میں لیونارڈ موسلے نے اپنی کتاب *The Last Days of The British Raj* کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ ''ہندوستان میں انتقالِ اقتدار سے متعلق سرکاری دستاویزات ۱۹۹۹ء تک سرکاری طور پر کھولی جائیں گی۔اس لیے مجھے

یقین ہے کہ پیش نظر کتاب اس عبوری مدت میں اُن حالات و واقعات پر روشنی ڈالتی رہے گی جو ہنوز مبہم ہیں۔'' لیونارڈ موسلے کی اِس تحریر کے بعد مورخین اور تاریخ کے طالب علموں کو ہندوستان میں انتقالِ اقتدار کے بارے میں برطانوی موقف اور ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی کارگزاریوں کو ماننے کے لیے مقررہ مدت تک انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ ۱۹۶۷ء میں برطانوی وزیراعظم ہیرالڈ ولسن نے اپنی حکومت کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ ہندوستان میں انتقالِ اقتدار سے متعلق تمام دستاویزات جلد شائع کردی جائیں گی اور دستاویزات کی اشاعت کے اس کام پر ایک غیر جانبدار مورخ کو مامور کیا جائے گا جس کو ان دستاویزات کے انتخاب، تدوین اور اشاعت کا مکمل اور آزادانہ اختیار ہوگا۔ ہیرالڈ ولسن کے اس اعلان کے تحت انتقالِ اقتدار سے متعلق دستاویزات کا یہ سلسلہ ممتاز مورخ پروفیسر نکولس مانسرگ کی ادارت میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۳ء تک *Transfer of Power 1942-47* کے عنوان سے بارہ جلدوں میں شائع ہوا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اِن جلدوں میں کرپس مشن کی ہندوستان آمد سے لے کر ۱۰ راگست ۱۹۴۷ء تک کی دستاویزات شامل ہیں۔ خصوصاً دسویں جلد سے بارہویں جلد تک میں ماؤنٹ بیٹن کے دور سے متعلق دستاویزات شامل ہیں اور یہی دور ہندوستان کی آزادی، قیامِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار کے ضمن میں آخری اور حتمی دور ہے۔ اِس اعتبار سے ان دستاویزات کے مطالعہ کے بغیر کوئی تحریر انتقالِ اقتدار اور قیامِ پاکستان کے ضمن میں معتبر اور واضح قرار نہیں پاسکتی۔

انتقالِ اقتدار کی مذکورہ بالا دستاویزات کی اشاعت کے دوران اور اُس کے بعد اکثر مورخین نے اِن دستاویزات کو بنیاد بنا کر اپنی تحقیقات مکمل کی ہیں اور اس دورانیہ سے متعلق متعدد نئے انکشافات و تجزیے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان انکشافات و تجزیوں میں بھی اگرچہ محقق کا اپنا زاویۂ نگاہ موجود ہے لیکن دستاویز کے حوالے اس زاویۂ نگاہ کو بیک قلم منسوخ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک

کے دو عشروں کے دوران ان دستاویزات سے استفادہ کی بنیاد پر جو اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱) پینڈرل مون، *Wavell: The Viceray Journal* (نیویارک: ۱۹۷۳ء)

۲) لیرے کولنز اینڈ ڈومینکو لاپیر، *Freedom At Midnight* (نیویارک: ۱۹۷۵ء)

۳) لیرے کولنز اینڈ دومینکو لاپیر، *Mountbatten and the Partition of India* (نئی دہلی: ۱۹۸۲ء)

۴) سید ہاشم رضا، *Mountbatten & Pakistan* (کراچی: ۱۹۸۴ء)

۵) فلپ زیگر، *Mountbatten: The Official Biography* (لندن: ۱۹۸۵ء)

۶) عائشہ جلال، *The Sole Spokesman* (کراچی: ۱۹۸۵ء)

۷) لطیف احمد شیروانی، *The Partition of India and Mountbatten* (کراچی: ۱۹۸۶ء)

۸) ایچ ایم سیروائی، *Partition of India: Legend and Reality* (بمبئی: ۱۹۸۹ء)

مذکورہ بالا کتب کے مطالعہ سے نہ صرف بے پناہ نئی معلومات سامنے آئی ہیں بلکہ یہ حقیقت بھی طے پا گئی ہے کہ انتقالِ اقتدار اور قیامِ پاکستان کے ضمن میں کوئی کتاب یا تجزیہ اب اُس وقت تک وقیع یا معتبر قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء کے دورانیہ سے متعلق دستاویزات سے بھرپور استفادہ نہ کیا جائے۔ مذکورہ بالا کتب کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کا آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانیہ کے شاہی خاندان کا فرد اور کانگریسی رہنما جواہر

لال نہرو کا قریبی دوست تھا۔ وہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان پہنچا اور بہت تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ تحریکِ پاکستان کے ایک صحافی سید حسن ریاض نے اپنی کتاب 'پاکستان ناگزیر تھا' میں لکھا ہے کہ ''کوئی اور وائسرائے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہندوستان آیا ہو یا نہیں لیکن ماؤنٹ بیٹن ہر طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے اور انہوں نے اہتمام و تکلف کے ساتھ اپنے اوپر گھبراہٹ اور جلدی کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔''

درحقیقت ماؤنٹ بیٹن کو بحیثیت وائسرائے نامزدگی سے قبل ہی ہندوستان کی سیاسی صورتحال سے نہ صرف کماحقہ آگاہی حاصل تھی بلکہ وہ ہندوستان اِس ارادے کے ساتھ ہی آیا کہ وہ ہندوستان کو حتی المقدور متحد رکھنے کی کوشش کرے گا۔ لطیف احمد شیروانی کی کتاب میں دستاویزات کی روشنی میں جو حقائق درج کیے گئے ہیں اُن سے نہ صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے درمیان ہندوستان میں انتقالِ اقتدار کے بارے میں گٹھ جوڑ کی وضاحت ہوتی ہے بلکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اُس مخاصمانہ رویہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو اُس نے روزِ اوّل سے قائداعظم محمد علی جناح کی جانب سے اختیار کر رکھا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے ایک انٹرویو میں جو اُس نے لیرے کولنز کو دیا تھا اِس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ''میں متحدہ ہندوستان پر پختہ یقین رکھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ میں ہندوستان کو متحد رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔'' لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وائسرائے کے عہدہ پر متمکن ہونے تک مطالبہ پاکستان یعنی تقسیم ہند کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے عہدے پر متمکن ہونے کے بعد سب سے پہلے جواہر لال نہرو سے ملاقات کی اور اِس ملاقات کے تقریباً بارہ دن بعد یعنی ۵ را پریل ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح سے مذاکرات کیے۔ لطیف احمد شیروانی کی تحقیق کے مطابق ابتداً ماؤنٹ بیٹن ''کیبنٹ مشن پلان'' کے تحت ہندوستان میں ایک متحدہ حکومت کے قیام کے لیے کوشش کرتا رہا لیکن آل انڈیا

مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں کے ساتھ گفت وشنید کے پہلے دو ہفتوں میں ہی اُسے یقین ہو گیا کہ "کیبنٹ مشن پلان" کے نفاذ پر اصرار جاری رکھنا بالکل بے سود ہے اور اسی یقین نے کسی دوسرے متبادل منصوبہ کی جانب اُس کی رہنمائی کی۔ بقول لطیف احمد شیروانی:

> دراصل ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی رہنماؤں سے مذاکرات کے دوران میں ہی ایک متبادل منصوبہ تیار کر لیا تھا۔" ماؤنٹ بیٹن پیپرز سے یہ بات ثابت ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کا جھکاؤ چونکہ کانگریس کی طرف تھا اس لیے وہ ہر مرحلہ پر کانگریسی رہنماؤں سے صلاح ومشورے کرتا رہا۔ ایک بھارتی محقق ایچ ایم سیروائی نے لکھا ہے کہ "جب ایک مرتبہ ماؤنٹ بیٹن نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کیبنٹ مشن پلان ناکارہ ہو گیا ہے تو یہ ضروری ہو گیا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کا متبادل منصوبہ تیار کیا جائے۔

بحیثیت وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دور کی سرکاری دستاویزات بھی اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے وضع کردہ تقسیمِ ہند کے منصوبہ کی تیاری کے دوران یہ ظاہر کرتا رہا کہ اُس کی حیثیت ایک غیر جانبدار کی سی ہے لیکن اُس نے اپنے منصوبہ سے متعلق تمام دستاویزات دوستانہ جذبات سے مغلوب ہو کر جواہر لال نہرو کو دکھا دی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُس نے نہرو کی اس ضمن میں تجاویز کو قبول کیا اور محمد علی جناح کو بتائے بغیر اور اُن کا ردعمل معلوم کیے بغیر ان تجاویز کی روشنی میں اپنے پلان میں ترمیم واضافے کیے۔ بہر حال اب یہ حقیقت روزروشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ تقسیمِ ہند کے سلسلے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہر مرحلہ پر جانبداری کا ثبوت دیا اور دانستہ یہ کوشش کی کہ اُس کے منصوبہ کے زیادہ سے زیادہ فوائد کانگریس کو پہنچیں۔

چوہدری محمد علی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ

بیٹن نے اپنے چیف آف اسٹاف لارڈ اسمے اور جارج ایبل کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا تا کہ مذکورہ منصوبے کے ابتدائی مسودہ کی ہر شق پر حکومت برطانیہ اور متعلقہ حکام سے صلاح و مشورہ کیا جاسکے۔ اِس منصوبہ کے تحت جزیرہ نمائے ہند کو دو آزاد اور خود مختار مملکتوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ ایک ہندو اکثریت والی مملکت 'انڈیا' اور دوسری مسلم اکثریت والی مملکت 'پاکستان'۔ دستاویزات کی روشنی میں تحریر کی جانے والی کتب سے اِس قدیم الزام کی بھی توثیق ہوجاتی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن قیامِ پاکستان کا شدید مخالف تھا اور اُس نے آخری لمحہ تک اس سمت میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ اِن دستاویزات کے مندرجات سے یہ بات بھی مزید تقویت پاتی ہے کہ بلاشبہ یہ قائداعظم کی غیر معمولی سیاسی بصیرت کا کرشمہ تھا کہ آپ نے تمام مخالف قوتوں کو بالآخر مطالبۂ پاکستان کو حق بجانب تسلیم کرنے پر مجبور کردیا۔ *Transfer of Power* نامی کتاب کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں جلد میں شامل دستاویزات اور اِن کے مندرجات سے جس رہنما کی مدابرانہ صلاحیتیں سب سے زیادہ اُجاگر ہوتی ہیں وہ بھی قائداعظم تھے۔ اِن دستاویزات کی روشنی میں عالمی سطح پر مورخین اور محققین نے قائداعظم کی فراست اور قیادت کا فراخدانہ اعتراف کیا اور واضح طور پر لکھا کہ اس دور میں صرف قائداعظم محمد علی جناح واحد رہنما تھے جنہوں نے بغیر کسی دباؤ کے اپنا موقف پیش کیا اور کسی مرحلہ پر بھی کسی سیاسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے۔ جیسا کہ اسٹینلے والپرٹ اور ایچ ایم سیروائی نے لکھا ہے کہ قائداعظم کے ہاتھوں تحریکِ پاکستان کے آخری مرحلہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو قائداعظم سے مذاکرات میں شدید ہزیمت اٹھانا پڑی اور اُس کے اکثر فیصلے چڑچڑاہٹ کے زد میں آگئے۔ دستاویزات کی روشنی میں تجزیہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی ہزیمت کے نتیجہ میں ماؤنٹ بیٹن نے یہ طے کرلیا تھا کہ اگر اُسے تقسیمِ ہند پر مجبور ہونا پڑا تو وہ بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کردے گا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس طرح ان صوبوں کے مسلمانوں پر سے نہ صرف قائداعظم کا

اثر ورسوخ ختم ہو جائے گا بلکہ ایک ایسا پاکستان معرضِ وجود میں آئے گا جو ناقابلِ عمل ہوگا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے اس مذموم لائحہ عمل سے کانگریسی رہنماؤں کو بھی آگاہ کر دیا تھا جس کی بنا پر کانگریسی رہنما پاکستان کے معرضِ وجود میں آ جانے کے بعد بھی ایک عرصہ تک اسے ناقابلِ عمل قرار دیتے رہے۔ سید ہاشم رضا کی مرتبہ کتاب سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن پلان کے تحت تقسیم کی اس نوعیت کی شدید مخالفت کی۔ وہ 'کرم خوردہ' یا 'کٹا پھٹا' پاکستان قبول کرنے پر ہرگز تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں نہایت سخت بیانات بھی جاری کیے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ بالآخر ماؤنٹ بیٹن یا حکومتِ برطانیہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ انصاف و معقولیت کے تقاضے کے پیش نظر مذکورہ دونوں صوبوں کو تقسیم نہ کیا جائے بلکہ دونوں صوبوں کو مکمل طور پر پاکستان کا حصہ قرار دیا جائے مگر قائداعظم کو اپنی ان کوششوں میں صرف احتجاج کی حد تک کامیابی ہوئی کیونکہ ایک مرحلہ پر حکومتِ برطانیہ نے بھی ان دونوں صوبوں میں تقسیم کے سوال پر ریفرنڈم کرانے کی قائداعظم کی تجویز کو نہایت ہٹ دھرمی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ ان حالات میں قائداعظم کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ وہ مشروط طور پر اس منصوبہ کو منظور کر لیں۔

تقسیمِ ہند کی دستاویزات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے مشترکہ گورنر جنرل کی پیشکش کو ٹھکرا کر قائداعظم نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا تھا کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کانگریس نواز ذہنیت بہت واضح طور پر سامنے آ چکی تھی اور اُس کی مزید کسی بات پر اعتماد و انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پروفیسر شریف المجاہد نے سید ہاشم رضا کی مرتبہ کتاب میں مشترکہ گورنر جنرل کے مسئلہ پر ایک علیحدہ باب میں سیر حاصل بحث کی ہے اور تقسیمِ ہند کی دستاویزات سے ہی قائداعظم کے اس دانشمندانہ فیصلہ کی وضاحت کی ہے۔ غرض ۳ جون ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے آل انڈیا ریڈیو سے اس منظوری کا اعلان تاسف کے ساتھ کیا لیکن تقریر کے آخر میں انہوں نے 'پاکستان

زندہ باد' کا نعرہ بلند کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انہوں نے جنگ جیت لی ہے۔اس نعرے کی گونج ہندوستان کے طول وعرض میں سنائی دی گئی کانگریسی رہنماؤں کے ارادے پاش پاش ہو گئے اور ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی کامیابی کو تمام دنیا میں احترام و عقیدت کے ساتھ دیکھا گیا۔

قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل: تقاریر کے آئینے میں

تحریکِ پاکستان کی عظیم ترین جدوجہد میں کامیابی کے بعد پاکستان کا حصول جہاں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگریز قیادت اور اعلیٰ سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا وہاں اُس بے مثال قومی یک جہتی کا بھی مظہر تھا جس کی تعلیم قائداعظم اپنی قوم کو مسلسل دیا کرتے تھے۔ آپ نے بار بار مسلمانوں سے فرمایا کہ ''ہماری نجات ہمارے مکمل اتحاد، باہمی اتفاق اور نظم وضبط میں ہے۔ ہم امن عالم کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی تمام اقوام کے لیے بہت دوستانہ ہوگی۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی منظم قوم کے درست فیصلے کی مزاحمت نہیں کرسکتی ہے۔''

۱۷ راگست ۱۹۴۷ء کو آپ نے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس کی افتتاحی تقریب پر قوم کے نام اپنے ایک پیغام میں فرمایا ''ہم پُرامن رہنا چاہتے ہیں اور اپنے قریبی ہمسایوں اور ساری دنیا سے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم کسی کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم اقوامِ متحدہ کے منشور کے حامی ہیں اور امنِ عالم اور عالمی خوشحالی کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔''

۳۰ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''کوئی قوم ابتلا اور ایثار کے بغیر آزادی حاصل نہیں کرسکتی۔ ہم شدید دشواریوں اور ناگفتہ بہ مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہم خوف اور اذیت کے تاریک ایام سے گزرے ہیں لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتحاد،

حوصلے، خوداعتمادی اور اللہ کی تائید سے کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔"

قائداعظم ہر مشکل مرحلے پر اپنی قوم کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ اُن کے اندر عزم اور یکجہتی کی روح پھونکتے رہے کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ ہم جس قدر عظیم قربانیاں دیں گے اسی قدر بہتر عمل اور کردار کا مظاہرہ کریں گے۔ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے ایک پیغام میں فرمایا "آپ سب کے لیے میرا پیغام اُمید، حوصلے اور اعتماد کا پیغام ہے۔ آیئے! ہم باقاعدہ اور منظم طریقے سے اپنے تمام وسائل مجتمع کریں اور درپیش سنگین مسائل کا ایسے عزم اور نظم وضبط سے مقابلہ کریں جو ایک عظیم قوم کا سرمایہ ہوتا ہے۔"

۳۰؍اکتوبر ۱۹۴۷ء ہی کو ریڈیو پاکستان لاہور سے قائداعظم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا "ایک متحد قوم کو جس کے پاس ایک عظیم تہذیب اور تاریخ ہے کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کام، کام اور کام کریں۔ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اپنا نصب العین یعنی اتحاد، ایمان اور تنظیم کو فراموش نہ کیجیے۔" ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ باوجود ان خطرات کے جو ہمیں درپیش ہیں آپ سب کامل اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستان کا وقار پہلے سے زیادہ بلند رکھتے ہوئے اور اسلام کی عظیم روایات اور قومی پرچم کو بلند کیے ہوئے، ان خطرات کے درمیان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں گے۔"

بانی پاکستان محمد علی جناح کے تقریباً تمام سوانح نگار اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ پاکستان کا قیام اگرچہ برصغیر کے مسلمانوں کی اُمنگوں اور آرزوؤں کے عین مطابق اور ان کی منظم جدوجہد کا نتیجہ تھا لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب قائداعظم محمد علی جناح کی کرشمہ ساز قیادت تھی۔ پروفیسر شریف المجاہد نے لکھا ہے کہ پاکستان ایک انتھک جدوجہد کے بعد انتشار اور افراتفری کے عالم میں قائم

ہوا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی شاید ہی کسی اور قوم نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز اس قدر محدود وسائل کے ساتھ اور ایسے سنگین اور ابتر حالات میں کیا ہو۔اسے ورثے میں نہ کوئی مرکزی حکومت ملی تھی نہ اس کے پاس کوئی درالحکومت تھا، نہ کوئی انتظامی ڈھانچہ تھا، نہ منظم دفاعی فوج۔ خزانہ خالی تھا کیونکہ ہندوستان نے پاکستان کو زرمبادلہ کے بقایاجات کا وہ حصہ ادا کرنے سے انکار کردیا تھا جو پاکستان کا حق تھا۔ان تمام حالات میں پاکستان کا زندہ سلامت رہنا معجزے سے کم نہ تھا۔تاریخ کے اس انتہائی نازک مرحلے پر پاکستان کو اگر کچھ میسر تھا تو وہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت تھی۔ قائداعظم اس دور میں اُمورِ مملکت کے نگراں تھے اور پاکستان کے عوام کو آپ کی قیادت پر بے انتہا اعتماد تھا۔ یہ قائداعظم کا سیاسی تدبر تھا.کہ آپ نے پاکستانی قوم کے دلوں میں اپنے لیے موجود زبردست عقیدت ومحبت کو بروئے کارلا کران کو درپیش مشکلات او رمصائب سے نمٹنے کا حوصلہ عطا کیا۔ تباہیوں، بربادیوں اور ہولناکیوں کا نئی توانائیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ان کا رُخ تعمیر اور مثبت نتائج کی حامل سرگرمیوں کی جانب موڑ دیا۔ان کو نظم وضبط برقرار رکھنے اور امن وامان کو مستحکم کرنے کی تلقین کی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ایک بیان میں پاکستانی قوم سے فرمایا ”ہمیں جو کچھ حاصل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو مجتمع کریں اور اپنی آئندہ نسلوں کے کردار کی تعمیر کریں۔فوری اور اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو سائنسی اور فنی تعلیم دیں تاکہ اپنی اقتصادی زندگی تشکیل کرسکیں، ہمیں اس بات کا اہتمام کرنا ہوگا کہ ہمارے لوگ سائنس، تجارت، کاروبار اور بالخصوص صنعت وحرفت قائم کرنے کی طرف دھیان دیں لیکن یہ نہ بھولیے کہ ہمیں دنیا کا مقابلہ کرنا ہے جو نہایت تیزی سے اس سمت میں جارہی ہے۔“ آیئے ہم غور کریں کہ ہم نے اپنے قائد کے تدبر کی روشنی میں کتنا سفر طے کیا ہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے اردن کے سفیر محمد پاشا الشورائیکی متعینہ پاکستان کی اسنادِ سفارت قبول کرتے ہوئے فرمایا ''ہمارے نزدیک اسلام ہماری زندگی اور بقا کا منبع ہے اس کی وجہ سے ہماری ثقافت اور ماضی کی روایات عالم عرب سے منسلک ہیں''۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلوی عوام کے نام اپنے ایک نشری پیغام میں فرمایا تھا ''ہم اپنے ہمسایوں کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم صلح اور آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تا کہ عالمی اُمور میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔''

۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو آپ نے پاکستان کے فوجی افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''اس مشینی دور میں جب انسان کی کج روذہانت ہر روز تباہی کے نت نئے آلات ایجاد کر رہی ہے آپ کو وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ ہماری اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں کہ ہم خود بھی امن وسکون سے زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی امن وسکون کی فضا میں زندہ رہنے کا حق دیں۔''

۲۶ فروری ۱۹۴۸ء کو پاکستان میں متعین امریکہ کے پہلے سفیر پاؤل ایلنگ کی اسنادِ سفارت قبول کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا ''ہمیں نازک صورتِ حال کا سامنا ہے، تاہم ہمیں اس اَمر میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم آزاد اور امن پسند قوم کی حیثیت سے زندہ رہتے ہوئے مشترک مقاصد اور عزم کی وجہ سے ان مشکلات پر کامیابی کے ساتھ قابو پالیں گے۔''

قائداعظم محمد علی جناح ایک امن پسند رہنما تھے۔ لہٰذا عالمی امن آپ کو ہمیشہ عزیز رہا۔ اُن کی شخصیت ہمارے قومی استقلال کا بہترین مظہر تھی اور اس قومی استقلال کے زیرِ اثر جو تعمیری کام پاکستان میں ہوا ہے وہ دراصل قوم کی جانب سے اپنے قائد کی شخصیت کو ایک بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ گویا پاکستان کی خدمت قائداعظم کی قیادت و شخصیت کے اعتراف کے مترادف ہے۔ یعنی پاکستان اور

قائداعظم رہتی دنیا تک ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی میں وہ حکمتِ عملی اور خطوط متعین کر دیے تھے جو پاکستان کی بقا، سلامتی اور خوشحالی کی ضمانت دیتے ہیں آپ نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ''پاکستان کے عوام کو خوشحالی اور فارغ البال بنانے کے لیے مغرب کے اقتصادی نظام کے نظری اور عملی طریقِ کار کو اختیار کرنا ہمارے لیے بے سود ہوگا، ہمیں چاہیے کہ ہم ایک نئی راہِ عمل اختیار کریں اور دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کریں جو انسانی اخوت اور سماجی انصاف کے صحیح اسلامی نظریات پر مبنی ہو۔ اس طرح نہ صرف ہم اپنی وہ ذمہ داری بھی پوری کر سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتی ہے بلکہ عالمِ انسانیت کو امن کا وہ پیغام بھی دے سکیں گے جو عالمِ انسانیت کو تباہی سے بچا سکتا ہے اور اس کی خوشحالی اور ترقی کا موجب بھی ہوسکتا ہے۔''

تحریکِ پاکستان کے دوران آپ نے لاہور کے اسلامیہ کالج برائے خواتین کی طالبات اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''مسلم معاشرے میں بہت سی برائیاں اور غیر اسلامی رسوم وعقائد باہر سے دَر آئے ہیں اور یہ مسلمان تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی ایسے خطوط پر تربیت کریں کہ بچے اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔'' قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کے ایک قائد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا بلکہ آپ بحسن وخوبی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بھی جانتے تھے۔ آپ کا ایمان تھا، جیسا کہ آپ نے ۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں ایک تقریر کے دوران فرمایا ''کسی قوم کو بیدار کرنا ایک بڑی عظمت ہے اور اس قوم کو منظم کرنا اُس سے بھی بڑی عظمت ہے اور اپنی قوم کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دینا سب سے بڑی عظمت ہے۔''

پاکستان کے قیام کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو اپنے ایک

۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے اردن کے سفیر محمد پاشا الشورائیکی متعینہ پاکستان کی اسنادِ سفارت قبول کرتے ہوئے فرمایا ''ہمارے نزدیک اسلام ہماری زندگی اور بقا کا منبع ہے اس کی وجہ سے ہماری ثقافت اور ماضی کی روایات عالم عرب سے منسلک ہیں''۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلوی عوام کے نام اپنے ایک نشری پیغام میں فرمایا تھا ''ہم اپنے ہمسایوں کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم صلح اور آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تا کہ عالمی اُمور میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔''

۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو آپ نے پاکستان کے فوجی افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''اس مشینی دور میں جب انسان کی کج روذہانت ہر روز تباہی کے نت نئے آلات ایجاد کر رہی ہے آپ کو وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ ہماری اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں کہ ہم خود بھی امن وسکون سے زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی امن وسکون کی فضا میں زندہ رہنے کا حق دیں۔''

۲۶ فروری ۱۹۴۸ء کو پاکستان میں متعین امریکہ کے پہلے سفیر پاؤل ایلنگ کی اسنادِ سفارت قبول کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا ''ہمیں نازک صورتِ حال کا سامنا ہے، تاہم ہمیں اس اَمر میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم آزاد اور امن پسند قوم کی حیثیت سے زندہ رہتے ہوئے مشترک مقاصد اور عزم کی وجہ سے ان مشکلات پر کامیابی کے ساتھ قابو پالیں گے۔''

قائداعظم محمد علی جناح ایک امن پسند رہنما تھے۔ لہٰذا عالمی امن آپ کو ہمیشہ عزیز رہا۔ اُن کی شخصیت ہمارے قومی استقلال کا بہترین مظہر تھی اور اس قومی استقلال کے زیرِ اثر جو تعمیری کام پاکستان میں ہوا ہے وہ دراصل قوم کی جانب سے اپنے قائد کی شخصیت کو ایک بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ گویا پاکستان کی خدمت قائداعظم کی قیادت و شخصیت کے اعتراف کے مترادف ہے۔ یعنی پاکستان اور

قائداعظم رہتی دنیا تک ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی میں وہ حکمتِ عملی اور خطوط متعین کر دیے تھے جو پاکستان کی بقا، سلامتی اور خوشحالی کی ضمانت دیتے ہیں آپ نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ''پاکستان کے عوام کو خوشحالی اور فارغ البال بنانے کے لیے مغرب کے اقتصادی نظام کے نظری اور عملی طریقِ کار کو اختیار کرنا ہمارے لیے بے سود ہوگا، ہمیں چاہیے کہ ہم ایک نئی راہِ عمل اختیار کریں اور دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کریں جو انسانی اخوت اور سماجی انصاف کے صحیح اسلامی نظریات پر مبنی ہو۔ اس طرح نہ صرف ہم اپنی وہ ذمہ داری بھی پوری کر سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتی ہے بلکہ عالمِ انسانیت کو امن کا وہ پیغام بھی دے سکیں گے جو عالمِ انسانیت کو تباہی سے بچا سکتا ہے اور اس کی خوشحالی اور ترقی کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔''

تحریکِ پاکستان کے دوران آپ نے لاہور کے اسلامیہ کالج برائے خواتین کی طالبات اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''مسلم معاشرے میں بہت سی برائیاں اور غیر اسلامی رسوم و عقائد باہر سے دَر آئے ہیں اور یہ مسلمان تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی ایسے خطوط پر تربیت کریں کہ بچے اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔'' قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کے ایک قائد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا بلکہ آپ بحسن و خوبی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بھی جانتے تھے۔ آپ کا ایمان تھا، جیسا کہ آپ نے ۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں ایک تقریر کے دوران فرمایا ''کسی قوم کو بیدار کرنا ایک بڑی عظمت ہے اور اس قوم کو منظم کرنا اُس سے بھی بڑی عظمت ہے اور اپنی قوم کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دینا سب سے بڑی عظمت ہے۔''

پاکستان کے قیام کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو اپنے ایک

پیغام میں ایک سال کے دوران پاکستان کی مختلف حوالوں سے ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے فرمایا ''کسی مملکت کی تاریخ میں ایک سال کا عرصہ اس کے کارناموں کا جائزہ لینے اور اس کے مستقبل کا اندازہ لگانے کے لیے بہت مختصر ہے لیکن جس طرح ہم نے زبردست مشکلات پر قابو پایا ہے اور گزشتہ بارہ ماہ میں جو ٹھوس ترقی کی ہے اس کی بنا پر ہم یہ اُمید کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ہمارا مستقبل شاندار ہوگا۔'' قائداعظم محمد علی جناح کو ہم سے رخصت ہوئے اب ۷۱ سال کا عرصہ بیت گیا ہے اس عرصے میں ہم نے پاکستان کو مستحکم اور خوشحال پاکستان بنانے کے لیے بحیثیت قوم کیا کردار ادا کیا۔ کیونکہ یہی سوال ہم کو مستقبل میں پاکستان کے استحکام اور خوشحالی کے لیے مستعد اور متحرک رکھنے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم کے اعلان کے بعد ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس اعلان کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والی دونوں مملکتوں یعنی بھارت اور پاکستان کا اُن کو مشترکہ گورنر جنرل بنانے کا اعلان کیا جائے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس تجویز کی آل انڈیا مسلم لیگ نے نہ صرف شدید مخالفت کی بلکہ ۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری نوابزادہ لیاقت علی خان نے ایک خط کے ذریعہ وائسرائے کو مطلع کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے بعض وجوہات کی بنا پر محمد علی جناح کو مجوزہ مملکت پاکستان کا گورنر جنرل بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی خط میں لیاقت علی خان نے برطانیہ کی ہز مجسٹی حکومت سے محمد علی جناح کی نامزدگی کی منظوری کا بھی اعلان کرنے کی درخواست کی تھی جس کے نتیجے میں ۱۰ر جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے محمد علی جناح کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قبول کرنے کا اعلان کردیا۔

یہ حقیقت اب تاریخی اور تحقیقی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن

مارچ ۱۹۴۷ء میں اپنی وائسرائے کی حیثیت سے تقرری کے بعد سے ہی نہ صرف ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھا اور وہ ہر قیمت پر ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کے کانگریسی رہنماؤں خصوصاً جواہر لال نہرو سے قریبی مراسم تھے لہٰذا مسلم لیگ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کردے جو پاکستان کے قیام کے اصول سے ہی در پردہ متفق نہیں تھا۔ محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کرنے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ماؤنٹ بیٹن مسلم لیگ کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا لیکن مسلم لیگ اپنے فیصلے پر اٹل رہی جبکہ کانگریس نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اُسے بھارت کا پہلا گورنر جنرل نامزد کردیا۔ بقول پروفیسر شریف المجاہد ''مسلمانوں کے نکتۂ نظر سے محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانے کی سفارش کو سمجھنے کے لیے یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں محمد علی جناح اپنی زندگی کے ایک انتہائی منفرد اور اعلیٰ مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ مسلم عوام کے ساتھ اُن کے رشتے اتنی گہرائیوں اور استحکام کے ساتھ قائم ہو چکے تھے کہ شاید ہی یہ کبھی کسی عوامی رہنما اور عوام کے درمیان قائم ہوئے ہوں۔ چنانچہ جب پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے محمد علی جناح کے تقرر کا اعلان ہوا تو ہندوستان کے مسلمان حلقوں میں بے پایاں مسرت اور احساسِ فتح کی لہر دوڑ گئی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب اُن کے لیے 'معمارِ پاکستان' اور پاکستان کے لیے 'جناح کا پاکستان' کی اصطلاح وضع ہوئی۔''

قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے تقریباً ایک سال ۲۷ دن گورنر جنرل رہے۔ اس مختصر سے عرصہ میں انہوں نے نہ صرف اپنی قوم کو عزم وحوصلے کا درس دیا بلکہ اپنی صحت کی پرواہ کیے بغیر صرف پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور استحکام کے لیے اپنے دن رات وقف کردیے۔ پاکستان اپنی ہنگامہ خیز پیدائش کے بعد ہی پیش آنے والے تباہ کن اقتصادی بحران، محدود وسائل، غیر منظم دفاعی فوج، نقل مکانی کرنے والے

مسلمانوں کے سرحدوں کے پار قتل عام، آٹھ لاکھ سے زائد مہاجرین کی پاکستان آمد، تجربے کار سرکاری عملہ کی کمی اور دیگر مصائب و مشکلات میں محض اس لیے سلامت رہا کہ اُس دور میں قائداعظم محمد علی جناح بحیثیت گورنر جنرل اُمورِ مملکت کے نگراں تھے۔ تاریخ کے اس انتہائی نازک مرحلے پر پاکستان کو اُن جیسے ہی کرشمہ ساز رہنما کی ضرورت تھی اور انہوں نے یہ ضرورت نہایت حسن و خوبی اور بے مثال تدبر سے پوری کی۔۔۔قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال پر 'لندن ٹائمز' نے بہت درست لکھا تھا کہ ''جناح اُن لوگوں کے لیے، اُس قوم کے لیے جو اُن کی رہنمائی میں یہاں تک آئی تھی، قائداعظم سے بھی بڑھ کر، سربراہِ مملکت سے بھی زیادہ سربلند اور اُس اسلامی مملکت کے جس کی بنیاد خود انہوں نے رکھی تھی معمار سے بھی کچھ زیادہ ہی حیثیت رکھتے تھے۔''

بانی پاکستان محمد علی جناح نے نہایت بھرپور سیاسی زندگی گزار کر ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی رحلت نہ صرف پاکستان اور عالم اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا بلکہ پوری دنیا کے لیے رنج و اندوہ کا باعث تھی۔ آپ کے انتقال پر جو تعزیتی پیغامات موصول ہوئے ان میں قائداعظم کی جامع الصفات شخصیت، قائدانہ صلاحیتوں اور غیر متزلزل عزم و استقامت کا بھی واضح طور پر اعتراف موجود ہے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء کے اخبارات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں نے قائداعظم کے انتقال پر نہ صرف سوگ منایا بلکہ غائبانہ نمازِ جنازہ بھی ادا کی۔ کراچی میں آپ کی نمازِ جنازہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے رہنما اور ممتاز عالم دین علامہ شبیر احمد عثمانی نے فرمایا ''وہ اورنگزیب عالمگیر کے بعد دوسرے عظیم مسلمان تھے۔'' پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے دستِ راست نواب زادہ لیاقت علی خان نے ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام ایک نشری پیغام میں کہا ''اللہ تعالیٰ نے قائداعظم کو ایک ایسے وقت میں ہمارے درمیان سے اُٹھالیا

کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے رہنما اور ممتاز عالم دین علامہ شبیر احمد عثمانی نے فرمایا ''وہ اورنگزیب عالمگیر کے بعد دوسرے عظیم مسلمان تھے۔'' پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور قائداعظم کے دستِ راست نواب زادہ لیاقت علی خان نے ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام ایک نشری پیغام میں کہا ''اللہ تعالیٰ نے قائداعظم کو ایک ایسے وقت میں ہمارے درمیان سے اُٹھالیا ہے جبکہ ہمیں ابھی اپنی قومی بقا کے دشوار ترین مراحل میں آپ کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔ ہم کو اس موقع پر اللہ کے سامنے عہد کرنا چاہیے کہ ہم غیر متزلزل عزم کے ساتھ اس عظیم مقصد سے وابستہ ہو جائیں جس کے لیے قائداعظم نے حصولِ پاکستان کے بعد خود کو وقف کر دیا تھا اور وہ عظیم مقصد یہ ہے کہ ہم نومولود مملکت پاکستان کو ایک عظیم اور طاقتور ملک بنائیں گے جس کے معمار بلاشبہ قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ بانئ پاکستان محمد علی جناح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے احسن طریقہ یہی ہے کہ ہم آپ کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان کو ویسا ہی بنانے کی کوشش کریں جیسا کہ اسے قائداعظم بنانا چاہتے تھے۔''

قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے ایک نشری پیغام میں فرمایا ''خدا کو منظور نہ تھا کہ قائداعظم پاکستان کی خدمت کے لیے ایک سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہتے۔ پھر بھی اس قلیل عرصے میں آپ نے پاکستان کی بنیادیں کافی مضبوطی کے ساتھ رکھ دی ہیں جن کو آسانی سے ہلایا نہیں جاسکتا۔ اس موقع پر میں آپ کو قائداعظم کے آخری پیغام کے چند الفاظ یاد دلاؤں گی۔ آپ نے عوام سے فرمایا ''خدا نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے، آپ کے وسائل لامحدود ہیں، آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھ دی گئیں، اب اس کی تعمیر آپ کی ذمہ داری ہے۔ یہ آپ کا کام ہے کہ جس قدر جلد اور جس قدر بہتر ہو سکے آپ اس کی تعمیر کریں۔ بس آگے بڑھیے! خدا

آپ کا حامی ومددگار رہے۔'' قائداعظم کا پیغام بالکل واضح ہے، بس عمل کی ضرورت ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ پاکستان کو معاشی اور صنعتی لحاظ سے مضبوط اور ترقی یافتہ بنائیں تاکہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکے۔''

قائداعظم اور اردو بحیثیت قومی زبان

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح پاکستان میں اردو کو بحیثیت قومی زبان رائج کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے۔ کیونکہ تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی انہوں نے اردو کے قومی زبان کی حیثیت سے نفاذ پر ہمیشہ زور دیا تھا۔ یہ موضوع اپنے اندر تاریخی طور پر بڑی وسعت رکھتا ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے تاریخی پس منظر میں بحیثیت زبان اردو کا جائزہ لیا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ اردو دشمنی نے کس طرح متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کے لیے ذہن سازی کی۔ اردو زبان کی اہمیت کیا ہے اور اس زبان کا قومی زبان کے طور پر نفاذ کیوں ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ہی کی ایک تقریر کے اقتباس سے ملتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ''کوئی بھی قوم ایک قومی زبان کے بغیر ملکی سالمیت اور فکری یکجہتی تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی۔''

زبان کسی قوم کے افتخار کا نشان ہوتی ہے۔ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ کسی قوم کی تہذیبی شناخت اور اس کے تشخص کی ترجمان ہوتی ہے۔ کسی بھی قوم کی زبان کا علمی وادبی سرمایہ اس قوم کی ثقافتی، تہذیبی اور ملی امنگوں اور کامیابیوں کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے قومی زبان سے انحراف اور گریز کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ قومی زبان قومی شعور اور فکر وتخیل کی امین ہوتی ہے اور کوئی قوم اپنے آباؤ اجداد کی

روشنیِ طبع سے صرفِ نظر کر کے خودآ گاہی کا مرحلہ طے نہیں کر سکتی۔ اردو صرف تاریخی سرمایہ نہیں بلکہ ایک جدید ترین ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس میں لچک اور وسعت موجود ہے۔ گزشتہ چار سو سال میں اس زبان نے مقامی اور بدیسی زبانوں کے الفاظ اپنے معنوں، مزاج اور لہجے میں ڈھال کر قبول اور اپنے اندر ضم کیے ہیں، گویا یہ زبان کائنات کی طرح مسلسل پھیلاؤ کی طرف گامزن ہے۔ اس میں جدید علوم وفنون کے مکمل ابلاغ کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس لیے اردو کو بحیثیت قومی زبان کے قبول کرنا ہماری قومی ضرورت ہے۔ آزاد اور خودمختار قوموں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قومی زبان کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔

زبان اظہار کا سب سے اعلیٰ اور موثر ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی تراش خراش کے ساتھ ساتھ اسے قومی وجود کا حصہ بنانے کے لیے حالات سازگار کیے جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس حوالے سے کوئی مسلسل اور مربوط جدوجہد نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان اپنے فطری تقاضوں کے مطابق لسانی اور اظہاری سطح پر ترقی کرتی رہی لیکن ہمیشہ سرکاری سرپرستی سے محروم رہی، جس کے نتیجے میں یہ سوال پیدا ہوتا رہا کہ پاکستان کی قومی زبان کو قومی سطح پر کب نافذ کیا جائے گا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہم بھی کب تک یہ دعویٰ کر سکیں گے کہ ہماری بھی ایک قومی زبان ہے۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ پاکستان کی عوامی زبان اردو ہے اور وہی زبان قومی زبان کے رتبہ پر فائز ہو سکتی ہے جو عوامی زبان ہو۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل بھی اور بعد میں بھی جو علمی وادبی تخلیقات قومی سطح پر مقبول ومتعارف ہوئی ہیں وہ نہ صرف اردو میں ہیں بلکہ ان کے بیشتر تخلیق کار وہ افراد ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی اردو کو ایک مخصوص طبقہ کی زبان قرار دینا یا ایک مخصوص طبقہ کا اس زبان پر اپنی اجارہ داری کا اعلان خام خیالی نہیں تو اور کیا ہے۔ اردو پاکستان کے اتحاد، سالمیت اور یکجہتی

کی ضمانت ہے اور قومی تشخص کے احیاء کے لیے بحیثیت قومی زبان اردو کا عملی نفاذ بہت ضروری ہے کیونکہ یہ زبان ہماری ملی تاریخ کی ایک قابلِ فخر میراث ہے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی یہ خواہش نہیں بلکہ فیصلہ تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔ قائداعظم محمد علی جناح کن منزلوں سے گزر کر اس فیصلے تک پہنچے تھے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم قائداعظم کی سیاسی زندگی کے مختلف ادوار کا ایک سرسری جائزہ لیں۔ لیکن اس مرحلے پر میں ایک تاریخی حقیقت واضح کرتا چلوں کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوؤں اور انگریزوں میں فکری اور سیاسی گٹھ جوڑ ہو گیا تھا اور دونوں قوتیں اردو زبان کو اس لیے ناپسند کرتی تھیں کہ اس کا رسم الخط عربی اور فارسی سے ملتا جلتا تھا اور یہ دونوں زبانیں اسلامی ثقافت کی نمائندہ ترین زبانیں تھیں۔ خصوصاً ہندو تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ایسی تمام اقدار و علامات کو ختم کر دینا چاہتے تھے جو اُن کو دورِ غلامی کی یاد دلاتی ہوں یا اسلام کی نمائندہ ہوں اور اردو بھی ان کے نزدیک ایک ایسی ہی علامت تھی۔ بہر حال قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور ولادت، حصولِ تعلیم اور مستقبل کی تلاش سے متعلق ہے۔ دوسرا دور جو ۱۸۹۶ء سے شروع ہوتا ہے پیشہ ورانہ جدوجہد پر مبنی ہے۔ یہ دور ۱۹۰۶ء میں اس وقت ختم ہوتا ہے جب وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کرتے ہیں اور دس سال کے مختصر عرصہ میں ''ہندو مسلم اتحاد کے سفیر'' کی حیثیت میں ہندوستان کے طول و عرض میں معروف ہو جاتے ہیں۔ اسی دور میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی رکنیت قبول کی جو اس دور میں خالصتاً مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۲ء تک وہ ہر سطح پر سیاسی جدوجہد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن Non-Cooperation Movement کے دوران موہن داس کرم چند گاندھی کی سیاسی روش سے اختلاف کرتے ہوئے خود کو سمیٹ لیتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۳ء تک وہ ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ ہندوستان کی

آزادی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنی جدوجہد کو جاری رکھتے ہوئے ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لیے منعقد ہونے والی گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہو جاتے ہیں اور جلد ہی مسلم مطالبات کی جانب سے انڈین نیشنل کانگریس کے مندوبین کی مخاصمانہ روش کو دیکھتے ہوئے لندن میں مستقل سکونت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ میں ان تمام ادوار کو قائداعظم کی سیاسی شخصیت کا ایک ایسا تشکیلی دور قرار دیتا ہوں جو ان کو ایک بڑے مقصد کی طرف لے جا رہا تھا اور یہ بڑا مقصد تھا مسلمانانِ ہند کے ملی شعور کو بیدار کر کے ان کو برصغیر میں ایک علیحدہ مسلم وطن کے قیام کے لیے آمادہ و تیار کرنا۔

قائداعظم اپنی خود عائد کردہ جلاوطنی ترک کر کے ۱۹۳۴ء میں لندن سے ہندوستان واپس آتے ہیں اور ازسرِ نو آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت قبول کر کے اس سیاسی جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ نہ صرف مسلمانانِ ہند کے قائداعظم کے منصب پر فائز ہوئے بلکہ یہ جدوجہد مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی منظوری اور اگست ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان پر منتج ہوئی۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم نے ایک سال اور ۲۷ دن خدمات انجام دیں۔ اس دورانیہ میں انہوں نے پاکستان کے استحکام اور سلامتی کے حوالے سے دوررس فیصلے کیے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران آل انڈیا مسلم لیگ نے ان کی قیادت میں عوام سے جو وعدے کیے تھے ان کو پورا کرنے کی طرف اپنی توجہ صرف کر دی۔

اُصولی طور پر ہندو مسلم اختلافات کا آغاز ہی زبان کے مسئلہ پر ہوا۔ ۱۸۶۷ء میں جب ہندوؤں نے شمال مغربی صوبے (یوپی) میں اردو کے بجائے ہندی کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرانے کے لیے زور باندھا تو سب سے پہلے سرسید احمد خان نے بنارس کے برطانوی کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے اس خیال کا اظہار کیا کہ ''اب برصغیر میں ہندو اور مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ رہنا ناگزیر ہے۔'' سرسید کے اسی خیال

نے دو قومی نظریے کی بنیاد ڈالی۔ اردو زبان کے خلاف ہندوؤں اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں یو پی کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے بجائے ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط رائج کرنے کے بارے میں اپریل ۱۹۰۰ء میں یو پی کے گورنر سر انٹونی میکڈانلڈ نے ایک قرارداد کو منظور کر کے ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ گورنر کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا لہٰذا سر سید کے ساتھی نواب محسن الملک نے 'اردو ڈیفنس کونسل' قائم کر کے گورنر کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں ۱۹۰۱ء میں مسلمانوں کی اوّلین سیاسی جماعت 'محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن' کا قیام عمل میں آیا۔ یہ جماعت ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کی باقاعدہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام تک کام کرتی رہی۔ اس منظر نامے سے صاف ظاہر ہے کہ دیگر سیاسی و اقتصادی حق تلفیوں کے علاوہ اردو کے دفاع کی جدوجہد نے بھی برصغیر کے مسلمانوں کے اندر سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی اردو زبان کے دفاع اور فروغ کے لیے اپنے اجلاسوں میں قراردادیں منظور کیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی مادری زبان اگرچہ اردو نہیں تھی لیکن برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کے تناظر میں وہ اردو کی اہمیت اور ضرورت سے پوری طرح واقف تھے، لہٰذا وہ اپنی آخری سانس تک اردو زبان کے دفاع اور نفاذ کے لیے کوشاں رہے۔

اپنی زندگی کے آخری دور میں یعنی ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۸ء تک وہ مسلسل اردو کی وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد انہوں نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ''پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی کیونکہ اردو ہی برصغیر کی واحد زبان ہے جس میں نہ صرف مذہب، ثقافت اور ادب کے حوالے سے مسلمانانِ برصغیر کا عظیم علمی سرمایہ محفوظ ہے بلکہ یہ رابطہ کی زبان بھی ہے، اس لیے ضروری ہوگا کہ اسے پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت دی جائے۔''

قائداعظم کی مادری زبان گجراتی تھی جبکہ انگریزی زبان انہوں نے حصولِ تعلیم کے دوران سیکھی تھی اور پھر انگریزی ان کی شخصیت میں اس قدر رچ بس گئی کہ وہ گجراتی کو تقریباً بھول گئے۔ ہمیں تاریخ میں کوئی ایسی مثال میسر نہیں کہ قائداعظم نے کبھی گجراتی میں گفتگو یا تقریر کی ہو لیکن ان کی نجی اور سیاسی زندگی میں متعدد ایسے مواقع موجود ہیں جب انہوں نے اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کی جو بہرحال ان کی مادری زبان نہیں تھی۔

بحوالۂ تاریخ قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹/اپریل ۱۹۳۵ء کو ایک اخباری بیان میں کہا کہ ''اگر ہم اردو زبان کے تحفظ کے لیے سینہ سپر نہیں ہوں گے تو ہندی کو بطور قومی زبان ہم پر مسلط کر دیا جائے گا۔'' اسی بیان میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''کانگریس کے جھوٹے پروپیگنڈے کے ازالے کے لیے ہم کو انگریزی اور اردو میں مسلم اخبارات جاری کرنا ہوں گے کیونکہ اس طرح ہم مسلمانوں کو بروقت سیاسی، اقتصادی اور سماجی تبدیلیوں سے باخبر رکھ سکیں گے۔'' آل انڈیا مسلم لیگ نے جون ۱۹۳۶ء میں آنے والے انتخابات کے لیے پارلیمنٹری بورڈ کا جو منشور جاری کیا تھا اس میں بھی یہ اُصول وضع کیا تھا کہ پارلیمنٹری بورڈ اردو زبان اور رسم الخط کے فروغ اور تحفظ کے لیے کام کرے گا۔

۱۹۳۶ء میں بمبئی کے ایک جلسہ میں انہوں نے دورانِ تقریر اردو میں چند جملے ادا کیے لیکن اکتوبر ۱۹۳۷ء میں سٹی مسلم لیگ بجنور یو پی کے ایک جلسہ میں جس کی صدارت تحریکِ خلافت کے رہنما مولانا شوکت علی کر رہے تھے انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز اردو میں کیا اور پھر انگریزی میں گفتگو جاری رکھی۔ اسی جلسہ میں قائداعظم نے یہ بھی کہا کہ اسلام اور اردو مسلمانوں کے اتحاد کے بنیادی عناصر ہیں۔

۱۹/ستمبر ۱۹۳۷ء کو شملہ میں ایک عوامی استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ اگر میں اپنی زندگی میں اپنی قوم کو مضبوط، آزاد اور محب وطن بنا

دیتا ہوں تو میں یہ سمجھوں گا کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہے لیکن ہمارے ملک کی آزادی کا قطعی یہ مقصد نہیں کہ اکثریت کے لیے ایسی آزادی جو جبر و ظلم پر مبنی ہو۔ اس استقبالیہ میں سر سکندر حیات خان، سر عبداللہ ہارون، مولانا شوکت علی اور سر سلطان احمد بھی موجود تھے جنہوں نے جناح کی قیادت پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔ شملہ ہی میں مولانا ظفر علی خان نے جناح سے ملاقات کی اور اپنی جماعت 'اتحاد ملت پارٹی' کو مسلم لیگ میں ضم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہندو مسلم مفاہمت کے حوالے سے جواہر لال نہرو سے مذاکرات کے دوران قائداعظم نے ۱۷/ مارچ ۱۹۳۸ء کو جواہر لال نہرو کے نام ایک خط میں ہندو مسلم مفاہمت کے لیے جو چودہ نکات بیان کیے تھے اس میں بھی انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ ''مسلمان اردو کو ہندوستان کی قومی زبان دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان کو نہ محدود کیا جائے اور نہ کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے۔''

جنوری ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کلکتہ کے ایک جلسے میں کانگریسی ذہنیت کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر ہم کو برصغیر میں اپنے وجود کی پائیدار ضمانت درکار ہے تو ہم کو اردو کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔'' اسی سال ۱۹۳۸ء میں صوبہ بہار کے شہر 'گیا' میں ایک پُرہجوم اجتماع سے انگریزی میں خطاب کرنے کے بعد کہا کہ میں اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بھی آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں آپ سے آپ کی زبان میں بھی بات کروں۔ اس تقریر میں بھی انہوں نے کہا کہ اردو اور اسلام ہم کو متحد و منظم کر سکتے ہیں۔

۱۶/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ۲۵ ویں سالانہ اجلاس لکھنؤ کی دوسری نشست میں راجا امیر احمد خان آف محمود آباد نے اردو کے حوالے سے ایک قرارداد پیش کی۔ اس اجلاس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح کر رہے تھے۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''جیسا کہ اردو زبان دراصل ایک ہندوستانی زبان ہے اور

ہندو مسلم ثقافت کے باہمی تعامل وارتباط کا نتیجہ ہے اور ملک کی کثیر آبادی اس کو بولتی ہے۔ یہ متحدہ قومیت کے ارتقا میں معاون ہے۔ اس کو ہندی سے تبدیل کرنے کی کوشش اردو کی ساختیاتی بنیادوں کو بُری طرح متاثر کرے گی بلکہ ہندو اور مسلمان طبقات کے درمیان رفاقت کے فروغ میں بھی رکاوٹ ڈالے گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے اردو بولنے والے عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی سطح پر اور ہر شعبۂ حیات میں اپنی زبان کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہر اس علاقہ میں ہر ممکن جدوجہد کریں جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے۔ اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو کی تدریس کے انتظامات کیے جائیں اور تمام سرکاری محکموں، عدالتوں، مجلس قانون ساز، ریلوے اور محکمہ ڈاک میں اردو کے استعمال کے انتظامات کیے جائیں۔ اس بات کی کوشش کی جائے کہ اردو کو ہندوستان کی ہمہ گیر اور آفاقی زبان بنادیا جائے۔'' اجلاس میں اس قرارداد کی تائید مولانا کریم الرضا خان (یوپی)، حسن ریاض (یوپی)، غلام حسن (سی پی برار) اور ایس ایم حسن خان (بمبئی) نے کی اور متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کرلی گئی۔

قائداعظم محمد علی جناح اپنی اردو کو تانگے والے کی اردو اور کبھی کبھی بمبئی والے کی اردو کہا کرتے تھے۔ قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید کا بیان ہے کہ جب میں ۱۹۴۰ء میں ان کا پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوا تو انہوں نے مجھ سے ردو میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''تم لکھنؤ والا ہے، اس لیے ہم تم سے اردو بولا لیکن کام تم انگلش میں کرے گا۔'' جولائی ۱۹۳۸ء میں دہلی پراونشل مسلم لیگ کے جلسے سے انہوں نے نہایت ٹھہر ٹھہر کر تقریباً پندرہ منٹ تک اردو میں خطاب کیا۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ صوبائی لیگ کانفرنس میں انہوں نے کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے مسلم

دشمن اقدامات کی مخالفت کی اور فرمایا ''اردو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی مادری زبان اور ہندوستان میں رابطے کی زبان ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت ہمارا قومی فرض ہے۔ ہم اردو کے خلاف اقدامات کو اسلام، مسلم ثقافت اور ادب کے خلاف اقدامات تصور کرتے ہیں۔''

۱۷ر مارچ ۱۹۳۹ء کو قائداعظم علی گڑھ سے واپسی پر بریلی پہنچے تو نہ صرف ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا بلکہ رات کو ایک جلسے میں انہوں نے اردو میں خطاب بھی کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''انگریز کیا چاہتا ہے۔ ہندو کیا چاہتے ہیں۔ انگریز چاہتا ہے کہ ہندو اور مسلمان لڑتے رہیں اور وہ حکومت کرتا رہے۔ ہندو چاہتا ہے کہ انگریز کے زیر سایہ ہماری حکومت مسلمانوں پر قائم رہے اور وہ مسلمانوں پر حکومت کرتا رہے اور ہم مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہم نہ انگریز کے غلام رہیں اور نہ ہندوؤں کے بلکہ ہندوستان میں ایک آزاد قوم کی طرح اپنا وجود قائم رکھیں۔''

۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے قائداعظم نے اردو میں ایک مختصر تقریر کی اور کانگریس کی سیاست کو دھوکہ دہی کی سیاست قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ کانگریس کے دام ہمرنگ زمین سے ہوشیار رہیں کیونکہ وہ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف کام کر رہی ہے۔ ۳ر اپریل ۱۹۴۲ء کو الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے بھی قائداعظم نے اردو میں خطاب کیا اور کہا کہ ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں ایک ہی نعرہ گونج رہا ہے اور وہ نعرہ ہے 'پاکستان زندہ باد'۔ دسمبر ۱۹۴۳ء کو کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ۔ کے سالانہ اجلاس میں جب نواب بہادر یار جنگ نے قائداعظم کی تقریر کا نہایت پُرجوش انداز میں اردو ترجمہ پیش کیا تو قائداعظم نے برجستہ کہا کہ آج مسلم لیگ کو اس کی زبان

مل گئی ہے۔

قائداعظم کسی بھی زبان کی افادیت اور اہمیت سے پورے طور پر واقف تھے وہ جانتے تھے کہ زبان قوموں کی تعمیر و ترقی اور سلامتی و استحکام میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اردو کے تحفظ پر زور دیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں گاندھی جناح مذاکرات کے موقع پر بھی انہوں نے دوقومی نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ دیگر عناصر کے علاوہ ہماری زبان اور ادب بھی ہندوؤں سے مختلف ہے۔ مئی ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم نیوز پیپرز ایسوسی ایشن کے کنونشن سے دہلی میں خطاب کرتے ہوئے ماضی میں مسلم پریس کی کمزور صورتِ حال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو ہماری قومی زبان کا درجہ لینے جارہی ہے، ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو صحافت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔

۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو لندن مسلم لیگ کے زیراہتمام 'پاکستان ڈنر' کے موقع پر ایک پیغام میں اردو کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس موقع پر ڈنر میں موجود کیمبرج یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر اور معروف مستشرق آبری نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔ انہوں نے اس اُمید کا اظہار بھی کیا کہ پاکستان سے تخلیق کیے جانے والے اردو ادب کا شمار دنیا کے عظیم ادب میں ہوگا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۸ر اگست کو کراچی میں عید کی نماز کے اجتماع سے قائداعظم نے اردو میں مختصر خطاب کیا اور تمام مسلمانوں کو عید کی مبارکباد پیش کی۔ ۵ فروری کو سبی بلوچستان میں ایک بلوچ صحافی کے سوال کا جواب اردو میں دیتے ہوئے کہا کہ 'بازاری افواہوں پر یقین مت کیجیے۔' ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں فوجی پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ اسی تقریر میں

آپ نے یہ بھی کہا کہ میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان کوئی اور زبان نہیں بلکہ اردو ہوگی۔ جو شخص بھی اس سلسلہ میں گمراہ کرے گا وہ یقینا پاکستان کا دوست نہیں ہوسکتا۔ کوئی بھی قوم ایک قومی زبان کے بغیر ملکی سالمیت اور یکجہتی کو فروغ نہیں دے سکتی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے نئے سکوں کا اجرا کیا گیا جن پر اردو اور انگریزی میں 'حکومتِ پاکستان' کے الفاظ کندہ تھے۔ ان الفاظ سے ہی یہ شہادت میسر آتی ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔

۲۴ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ بین الصوبائی رابطہ کے لیے اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔ اردو اسلامی روایات اور ثقافت کی نمائندہ زبان ہے اور اسلامی ممالک کی زبانوں سے نہ صرف قریب ترین ہے بلکہ پاکستان کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انڈیا میں نہ صرف اردو کو دیس نکالا دیا جارہا ہے بلکہ سرکاری خط و کتابت کے لیے بھی اردو رسم الخط کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔

میں یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ 'اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔' یہ قائداعظم کی دیرینہ خواہش ضرور تھی لیکن اس بات کا فیصلہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کو اپنے ایک اجلاس میں کیا تھا جس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح کر رہے تھے۔ اس لیے جب ڈھاکہ میں قائداعظم نے اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان کہا تو وہ اپنا فیصلہ نہیں سنا رہے تھے بلکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے فیصلے کا اعلان کر رہے تھے۔

''اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔'' اس فیصلہ کے نفاذ میں تاخیر ضرور

ہوئی مگر اس فیصلے کی قانونی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اگر ہم پاکستان سے پوری دیانت کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے ہیں تو ہم کو اس فیصلے کو تسلیم کرنا چاہیے اور ایسا ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ہم اپنے سیاسی وجود سے ہر قسم کے علاقائی تعصبات کو اکھاڑ کر پھینک دیں کیونکہ اسی صورت میں ہم پاکستان کی سلامتی کے لیے اپنا جائز کردار بھی ادا کر سکتے ہیں اور قائداعظم کی رُوح کے سامنے سرخرو بھی ہو سکتے ہیں۔

قائداعظم کی علالت اور رحلت

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کو ۷۱ سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی نہ صرف عوام بلکہ بعض تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی عموماً ایسے خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے جن کی بنا پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم محمد علی جناح کی علالت اور بحالی صحت کی جانب ریاستی سطح پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی جس کی بنا پر ان کی صحت گرتی چلی گئی اور بالآخر ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو وہ انتقال کر گئے۔ یہ خدشات جہاں بظاہر افواہ طرازیوں کی پیداوار ہیں وہاں اس حقیقت کا بھی بین ثبوت ہیں کہ پاکستان کے عوام کو اپنے قائد سے شدید انسیت اور محبت ہے جس کے نتیجہ میں وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ایک ملک کا بانی اور برصغیر کے مسلمانوں کا بلاشرکت غیرے قائداعظم چند ماہ کی علالت کے بعد اُن سے جدا ہو گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ ہے کہ قائداعظم نے اپنی علالت اور صحت کی صورت حال کو نہ صرف مخفی رکھا بلکہ اپنی عوامی اور قومی مصروفیت کو علالت کی بنا پر معطل نہیں ہونے دیا۔ ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ہمارے ملک کے عوام کا تاریخی شعور اول تو ہے نہیں اور اگر ہے تو وہ مکتوبی نہیں ہے۔ یعنی اُن کی رسائی کبھی ان تاریخی حقائق تک ہوئی ہی نہیں جو قائداعظم کی علالت کے حوالے سے کتابوں اور دستاویزات میں روپوش ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مذکورہ حقائق کو سامنے لایا جائے تاکہ افواہ طرازیوں اور خدشات کا سلسلہ بند ہو سکے۔ میں نے اپنے پیشِ نظر مضمون

میں انہی معروضی حقائق کا سرسری جائزہ لینے کی ایک کوشش کی ہے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ۷۲ سال کی عمر پائی اور ۱۱رستمبر ۱۹۴۸ءکو وہ رحلت کر گئے۔قیامِ پاکستان کے بعد وہ تقریباً ایک سال ۲۷ دن حیات رہے۔قائداعظم کے سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ قائداعظم ۱۹۳۴ء سے وقفہ وقفہ کے ساتھ علیل رہنے لگے تھے۔اس وقت ان کی عمر تقریباً ۵۸ سال تھی گویا ۵۸ سال سے لے کر ۷۲ سال تک یعنی چودہ سال ان پر مختلف عوارض کے طویل اور مختصر حملے ہوتے رہے لیکن انہوں نے ہمیشہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے خود کو بحال رکھا جو ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی صورت میں سامنے آنے والی تھی۔ریکارڈ پر ۱۱رمئی ۱۹۳۴ء کا قائداعظم محمد علی جناح کا ایک ایسا خط پنجاب کے رہنما سر فضلِ حسین کے نام موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپریل ۱۹۳۴ء میں شدید علیل ہو گئے تھے۔ انہوں نے سر فضلِ حسین کو لکھا کہ اب تسلی بخش حد تک میری صحت بہتر ہے اور اُمید کرتا ہوں کہ ۲۴ مئی تک بحری جہاز کے ذریعہ لندن روانگی کے قابل ہو جاؤں گا۔

قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح ۱۹۲۹ء میں ان کے گھر مستقل قیام کے لیے آ گئی تھیں۔لہٰذا قائداعظم کی زندگی کے آخری انیس سال کے دوران جو قائداعظم کی زندگی کے ہر اعتبار سے بہت زیادہ مصروف، تھکا دینے والے اور صحت کے حوالے سے پریشان کن سال تھے، محترمہ فاطمہ جناح مسلسل قائداعظم کے ساتھ رہیں۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب *My Brother* میں اگرچہ قائداعظم کی بیماری کی نوعیت کے حوالے سے کوئی واضح بات نہیں لکھی ہے لیکن کتاب کے پہلے باب کے مندرجات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قائداعظم کی صحت ان کی زندگی کے آخری دو عشروں کے دوران اس لائق نہیں رہی تھی کہ وہ کسی مسلسل اعصابی دباؤ اور جسمانی مشقت سے گزر سکیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکریٹری سید شمس الحسن نے اپنی کتاب *Plain*

Mr. Jinnah میں قائداعظم کی چند ڈاکٹروں سے خط وکتابت ہی درج نہیں کی ہے بلکہ ایک قدیم رفیق کی حیثیت سے ان کی صحت کے حوالے سے لکھا ہے۔ ''قائداعظم جس طرح دیگر اُمور میں احتیاط پسند تھے اس طرح وہ اپنی صحت کی طرف سے محتاط نہیں تھے۔ دہلی کی سردیاں ان کو موافق نہیں تھیں اور وہ اکثر شدید نوعیت کے نزلے و زکام کا شکار ہو جاتے۔ اپنی خراب صحت کے باوجود وہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرتے، مباحث میں حصہ لیتے اور اپنا بیشتر وقت اور قوت سیاسی سرگرمیوں کے لیے وقف رکھتے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو نے ان کی صحت پر مضر اثرات مرتب کیے اور تقریباً ان کی صحت تباہ ہو گئی۔'' سید شمس الحسن نے پونا میں واقع نیچر کیور کلینک اینڈ سینی ٹوریم کے ڈاکٹر ڈی کے مہتا سے قائداعظم کی جو خط وکتابت دی ہے اس میں ڈاکٹر مہتا کے نام قائداعظم کا ایک خط ایسا بھی ہے جس میں قائداعظم نے لکھا ہے

''جہاں تک میرے آپ کے کلینک پر آنے کا سوال ہے وہ سردست میرے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ کب آؤں گا۔''

محترمہ فاطمہ جناح لکھتی ہیں کہ ''کام، کام اور زیادہ سے زیادہ کام۔ بس یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ ان کی خرابی صحت سے گھبرا کر اور خوف زدہ ہو کر جب کبھی میں نے ان سے اتنی زیادہ دیر تک کام نہ کرنے اور کچھ عرصہ کے لیے اپنے مسلسل طوفانی دوروں کو ترک کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے یہی جواب دیا کیا تم نے کبھی کسی جرنیل کو اس وقت رخصت پر جاتے دیکھا ہے جب اُس کی فوج میدانِ جنگ میں اپنی بقا کے لیے مصروف پیکار ہو۔'' محترمہ فاطمہ جناح مزید لکھتی ہیں کہ ایسے موقعوں پر میں منطق اور دلائل کو چھوڑ کر جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہتی ''لیکن آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے اس لیے آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔'' وہ خوابناک لہجے میں کہتے ''یہ ایک فرد کی صحت کا معاملہ نہیں، مجھے تو ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی زندگی کی فکر ہے۔ جانتی ہو اس وقت کیا چیز داؤ پر لگی ہوئی ہے۔''

قائداعظم کو جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے اپنی زندگی کے آخری دو عشروں میں اپنی صحت کی طرف سے زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے بنگال کے رہنما مرزا ابوالحسن اصفہانی کے نام بنگال کے دورہ سے قبل ۱۲/اپریل ۱۹۴۳ء کو ایک خط میں لکھا ''جہاں تک میرے استقبال کا سوال ہے براہِ مہربانی یہ خیال رکھیے گا کہ نظم و ضبط برقرار رہے اور میں مناسب وقت پر گھر واپس پہنچ جاؤں۔ کیونکہ یہ طویل جلوس، جس میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں، انسان کے اعصاب اور جسمانی قوت برداشت کو انتہا سے زیادہ تھکا دیتے ہیں۔ خیال رکھیے کہ میں دن میں بارہ بجے تک گھر پہنچ جاؤں اور ہر قیمت پر دوپہر کو کچھ آرام کر سکوں۔ میں نے اپنے علی گڑھ، میرٹھ اور دوسری جگہوں کے دوروں میں بہت تکلیف اٹھائی جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میری طبیعت خراب تھی بلکہ وہ بدنظمی اور حد سے زیادہ بوجھ تھا جو مجھے برداشت کرنا پڑا۔'' قائداعظم کے امریکی سوانح نگار اسٹینلے والپرٹ کے تجزیہ کے مطابق ان کی تندرستی ان کی سیاسی قوت کے لیے ناگزیر تھی۔ معمولی سا شک بھی کہ ان کے پھیپھڑوں پر ایسے داغ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے، ان کے طلسماتی تاثر کو تباہ کر سکتا تھا۔

قائداعظم کے اندر قوت برداشت ضرورت سے زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے یہ سب کچھ مسکراتے ہوئے برداشت کیا اور سیاسی مقصد کی طرف سے کوئی غفلت نہ برتی اور نہ ہی اپنی بیماری کو جس سے وہ خود بخوبی واقف تھے، کبھی اپنے اعصاب پر طاری کیا۔ البتہ اپنی صحت کی جانب سے ایک اندرونی اضطراب ان کی سوچ کو مسلسل اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا اور یہ اندرونی اضطراب ہی تھا جس کے زیر اثر انہوں نے ۳۰ مئی ۱۹۳۹ء کو اپنی آخری اور تفصیلی وصیت پر دستخط کیے۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد قائداعظم کی مصروفیات میں مزید اضافہ ہو گیا جو یقیناً ان کی صحت کے لیے شدید مضر تھا لیکن وہ برابر اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں پیش قدمی کرتے رہے۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداً

انہوں نے اپنے مناسب اور باقاعدہ علاج معالجے کی جانب بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں کے لیے قائداعظم کی صحت ہمیشہ تشویش کا باعث رہی جیسا کہ بعض رہنماؤں کے خطوط سے واضح ہے۔ انہوں نے ۱۰ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں اپنے معالج ڈاکٹر جال پٹیل کو مطلع کیا ”میں اب بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ اگرچہ کراچی میں حد سے زیادہ مصروفیت رہی ہے۔ میں چند دن کے لیے کوئٹہ کے لیے روانہ ہو رہا ہوں اور آپ کی ہدایات پر عمل کرتا رہوں گا اور مجھے اُمید ہے کہ وہاں پر جلد صحت یاب ہو جاؤں گا۔“

قائداعظم مطالبۂ پاکستان کی منظوری اور مسلمانوں کو ایک موقف پر متحد کرنے کی جدوجہد میں ایک صحت مند اور مستعد انسان کی طرح صبح سے رات گئے تک خود مصروف رکھتے تھے اور اس بنا پر تھک بھی جاتے تھے لیکن وہ اس بات کا کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کی صحت خراب ہے۔ قائداعظم کی ۱۹۴۰ء میں شدید علالت کے بعد مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں ان کی شرکت کا تذکرہ کرتے ہوئے محترمہ فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ میں اسمبلی ہال کی گیلری میں بیٹھی تھی اور میری نظریں انہی پر جمی ہوئی تھیں، پھر میں نے انہیں تقریر کے لیے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت میرے دل کو عجیب اندیشوں اور سوالات نے گھیر لیا۔ میں نے سوچا، اگر انہوں نے اپنی تمام قوت کو مجتمع کر بھی لیا تو وہ چند منٹ سے زیادہ نہیں بول پائیں گے مگر انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ایسی گونج دار آواز سے کیا جس سے نہ ان کی تھکن کا پتہ چلتا تھا نہ بیماری کا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک بولتے رہے۔ اس روز جب ہم اپنی کار میں اسمبلی سے گھر واپس روانہ ہو رہے تھے تو ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں جیسے قطعی سکت نہ تھی۔ وہ بمشکل سگریٹ تھامے ہوئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ تھکان کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔

ایک تجزیہ کے مطابق قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد قائداعظم کی علالت میں خاصا اضافہ ہو گیا مگر عموماً انہوں نے نہ اپنی بیماری کو کبھی موضوع گفتگو بننے دیا اور نہ ہی کسی پر اپنی اصل بیماری ظاہر کی۔ قائداعظم شاید اس بات سے مکمل طور پر آگاہ تھے کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر ان کی بیماری کا کوئی واضح انکشاف ان کی جدوجہد کو کسی المیہ سے دوچار کر سکتا ہے۔ جون ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر جال پٹیل نے ان کے پھیپھڑوں کے ایکسرے دیکھنے کے بعد واضح طور پر ان کو بتا دیا تھا کہ وہ ٹی بی کے مرض کی زد میں ہیں اور ان کی زندگی بہت مختصر رہ گئی ہے۔ ایسی صورت میں آرام اور مستقل علاج ہی ان کی صحت کو بحال رکھ سکتا ہے۔ *Freedom At Midnight* کے مصنفین نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر پٹیل کے مشورہ پر جناح نے کہا کہ ''میں سینی ٹوریم کے بستر پر مرنا نہیں چاہتا۔ سوائے قبر کے مجھے کوئی اس مقصد سے ہٹا نہیں سکتا جو میں نے خود اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمانوں کی علیحدہ وطن کے حصول کے لیے رہنمائی۔'' قائداعظم نے اگرچہ ڈاکٹر پٹیل کے مشورہ پر اپنی مصروفیات میں کمی کر دی تھی لیکن اپنی بیماری کی نوعیت کو ہمیشہ مخفی رکھا۔ ہندوستان کے آخری دو وائسرائے لارڈ ویول اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رپورٹوں اور ڈائریوں سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ قائداعظم کی بیماری کی نوعیت یا اس بات سے واقف نہ تھے کہ وہ موت کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں حتیٰ کہ محترمہ فاطمہ جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خان کو بھی قائداعظم کے انتقال سے چھ ماہ قبل ان کی بیماری کی نوعیت کا علم ہوا۔ قائداعظم کی صاحبزادی دینا جناح نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کو بھی اپنے والد کے انتقال کے بعد پتہ چلا کہ ان کے والد کو ٹی بی جیسا مہلک مرض لاحق تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح اس بات کا مکمل احساس رکھتے تھے کہ ان کے مخالفین کو جن میں ہندو رہنما اور برطانوی عمال دونوں شریک تھے، اگر یہ پتہ چل گیا کہ ان کی

زندگی بہت مختصر رہ گئی ہے تو ان کا پورا سیاسی زاویہ نگاہ تبدیل ہوجائے گا اور وہ برصغیر کی آزادی کو اگر معطل نہ کرسکے تو آگے ضرور دھکیل دیں گے۔ دوسری بات جوان کی تشویش کا باعث تھی وہ یہ کہ جن منتشر افراد کے گروہ کو انہوں نے ایک قوم کا قالب دیا ہے وہ قوم اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہوجائے گی اور حصولِ پاکستان ناممکن ہوجائے گا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ میں ان کو آرام کا مشورہ دیتی تو وہ مجھ سے کہتے ''میں اپنی جسمانی طاقت اور توانائی کے ذخیرے کو اس وقت تک استعمال کرتا رہوں گا جب تک مجھ میں عوام کی خدمت کے لیے توانائی کا آخری قطرہ موجود ہے اور جب وہ آخری قطرہ بھی صرف ہوجائے گا تو میرا کام اختتام کو پہنچے گا۔ کیونکہ زندگی ہی نہ ہوگی۔''

کسی نے سچ کہا ہے کہ پاکستان انتشار، افراتفری کے عالم اور ابتر حالات میں قائم ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی شاید ہی کسی اور قوم نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز اس قدر محدود وسائل کے ساتھ اور ایسے سنگین حالات میں کیا ہو۔ جن کا روزِ اوّل سے پاکستان کو سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام حالات میں بھی پاکستان کا سلامت رہنا ایک معجزے سے کم نہ تھا اور یہ معجزہ صرف ایک فردِ واحد کے دست کرشمہ ساز کا نتیجہ تھا اور وہ تھے قائداعظم محمد علی جناح۔ تاریخ کے اس انتہائی نازک مرحلہ پر پاکستان کو ان کی طرح کے کرشمہ ساز شخص کی ضرورت تھی اور اس شخص نے اپنی صحت اور زندگی کو داؤ پر لگا کر اس ضرورت کو نہایت حسن وخوبی سے پورا کیا۔

قائداعظم محمد علی جناح ۲۵ مئی ۱۹۴۸ء کو آرام کی غرض سے کوئٹہ روانہ ہوئے لیکن وہاں پر بھی آپ کی سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات جاری رہیں۔ امریکہ میں متعین پاکستان کے سفیر اور تحریکِ پاکستان کے رہنما مرزا ابوالحسن اصفہانی کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے آپ نے لکھا ''آپ میری طرف سے متردد نہ ہوں۔ مجھے کچھ معمول سے زیادہ کام کرنا پڑا اور اُس کا تاوان دینا پڑا لیکن میں آپ کو اطمینان

دلاتا ہوں کہ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔کوئٹہ میں آرام کرنے سے مجھے کسی قدر فائدہ ہوا ہے۔'' یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو قائداعظم اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کے لیے کراچی تشریف لائے۔اس موقع پر وہ بہت دبلے اور بیمار نظر آرہے تھے۔اُن کی صحت مسلسل بگڑتی چلی جارہی تھی مگر وہ برابر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو آپ دوبارہ کوئٹہ روانہ ہوگئے اور کوئٹہ سے آپ کو زیارت منتقل کردیا گیا جو کوئٹہ کے مقابلے میں نسبتاً سرد اور پُرفضا وادی تھی۔

زیارت ریزیڈنسی بلوچستان کے کمپڑولر (آڈٹ آفیسر) عبدالحمید کا بیان ہے کہ جب آخری مرتبہ قائداعظم زیارت سے کوئٹہ روانہ ہورہے تھے تو انہیں اسٹریچر پر نیچے لایا گیا۔روانگی کے وقت قائداعظم نے حکم دیا کہ اسٹریچر پر لے جاتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کوئی مجھے اس حالت میں نہ دیکھے۔جب قائداعظم کو کار میں بٹھایا جانے لگا تو فرمایا کہ ''مجھے کار میں اس طرح بٹھاؤ کہ میں اپنے عوام کو دیکھ سکوں۔'' آپ زیارت سے جب بذریعہ کار روانہ ہوئے تو اپنا داہنا ہاتھ ہلا کر سڑکوں پر دونوں جانب موجود عوام کو خداحافظ کہہ رہے تھے۔

زیارت میں قیام کے دوران قائداعظم کا بلڈ پریشر خاصا گر گیا تھا اور پیروں پر ورم آ گیا تھا۔قائداعظم کے معالج کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش نے اپنی کتاب ''قائداعظم کے آخری ایام'' میں لکھا ہے کہ ''پانچ ہفتہ کی تسلی بخش صحت کے بعد ۳ ستمبر کو آپ کی حرارت میں اضافہ ہوگیا۔حرارت کا اچانک یوں بڑھ جانا تشویشناک تھا چنانچہ ہم نے بڑی احتیاط سے اُن کا معائنہ کیا لیکن پھر بھی بخار بڑھنے کا سبب دریافت نہ ہوسکا۔'' ۹ ستمبر کو کرنل الٰہی بخش نے معائنہ کے بعد محترمہ فاطمہ جناح سے قائداعظم کی زندگی کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا مگر محترمہ فاطمہ جناح نے امید کا دامن نہیں چھوڑا اور برابر طبیعت کی بحالی کی منتظر رہیں۔ ۱۰ ستمبر کو ڈاکٹروں کے مشورہ پر محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم کو کراچی لے جانے پر آمادگی ظاہر کردی چنانچہ ۱۱ ستمبر کو آپ کا طیارہ سوا چار

بجے ماری پور کے ہوائی اڈہ پر اُترا۔ قائداعظم کو ایک اسٹریچر پر لٹا کر بذریعہ ایمبولینس گورنر جنرل ہاؤس پہنچایا گیا۔ رات تقریباً نو بجے آپ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ جب ڈاکٹرز گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو قائداعظم پر بے ہوشی طاری تھی۔ نبض کی رفتار بھی غیر مسلسل تھی۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد انجکشن لگایا مگر رات دس بج کر ۲۵ منٹ پر قائداعظم کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

قائداعظم نے اپنی زندگی کا آخری خط ایک صحافی اور *Verdict on India* نامی کتاب کے مصنف بیورلے نکلس کو ۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو لکھا جس میں آپ نے فرمایا ''آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرے ساتھ کوئی تشویشناک معاملہ نہیں ہے۔'' بیورلے نکولس کا بیان ہے اس خط میں قائداعظم کے دستخط حسب سابق جمے ہوئے نہیں تھے البتہ واضح تھے۔

یہاں ایک بات کہنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کی کوئٹہ سے کراچی آمد کو خفیہ رکھا گیا جس کی بنا پر کسی کو علم ہی نہیں تھا کہ ماری پور کے ہوائی اڈے پر ایمبولینس کس کے لیے منگوائی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں قائداعظم کے لیے کسی قسم کے خصوصی انتظامات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ماری پور ہوائی اڈے سے گورنر جنرل ہاؤس تک روانگی کے سفر میں ایمبولینس کی خرابی کے واقعے پر مختلف سوانح نگاروں نے اظہار خیال کیا ہے لیکن اس کے باوجود ایک مخصوص طبقہ اس خرابی کو کسی ریاستی غیر ذمہ داری کا شاخسانہ تصور کرتا ہے۔ بلاشبہ اس خرابی کی بنا پر آخری وقت میں قائداعظم کو ایک ناقابلِ بیان اذیت سے دوچار ہونا پڑا جیسا کہ ہیکٹر بولیتھو نے اپنی کتاب کے آخری باب میں درج کیا ہے۔ اگرچہ ہیکٹر بولیتھو کے بیان میں کچھ افسانویت بھی موجود ہے جس کی بنا پر اصل حقائق شک وشبہ کی زد میں آ گئے ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح جو اس واقعہ کی چشم دید گواہ ہیں انہوں نے بھی اپنی کتاب *My Brother* میں اس واقعے کی تفصیلات پر سیر حاصل

گفتگو نہیں کی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے ایسا کیوں کیا یہ ایک الگ بحث ہے جو سوالات کی صورت میں اکثر مضمون نگار اٹھاتے رہے ہیں لیکن کوئی واضح ثبوت ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔

متحدہ پاکستان کے حامی بنگالی رہنما محمود علی نے جو بنگلہ دیش کے قیام کے بعد آخر دم تک پاکستان میں ہی مقیم رہے۔ ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۴ء کو اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ 'ڈان' کراچی میں اس واقعے کی تفصیلات درج کی ہیں مگر انہوں نے بھی واقعے پر جذبات انگیز گفتگو زیادہ کی ہے اور واقعے کی اصل نوعیت پر اظہارِ خیال کم کیا ہے جس سے اس شبہ کو مزید تقویت پہنچی ہے کہ قائداعظم کے لیے ماری پور کے ہوائی اڈے پر ایک ناکارہ ایمبولینس کسی سازش کے تحت بھیجی گئی تھی۔ بدقسمتی سے اس المیے کی تمام تر ذمہ داری پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کی حکومت کے سر منڈھ دی گئی ہے کہ اُن کی حکومت نے قائداعظم کو لینے کے لیے عمداً ایک ناکارہ ایمبولینس ماری پور کے ہوائی اڈے پر بھیجی تھی جبکہ حقائق کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کے پہلے ڈپٹی کمشنر، معروف اسکالر اور قائداعظم کے رفیق کار سید ہاشم رضا نے جو اُس لمحہ انتظامی اُمور کے نگراں تھے ایک ملاقات میں راقم الحروف کو بتایا تھا کہ جو لوگ نوابزادہ لیاقت علی خان پر اس ضمن میں الزام عائد کرتے ہیں وہ ایسا لیاقت دشمنی میں کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بس یہی ایک الزام نوابزادہ لیاقت علی خان کے اُس کردار کو مسخ کرسکتا ہے جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانانِ ہند کو متحد کرنے اور مطالبۂ پاکستان کو مقبول بنانے کے لیے قائداعظم کی قیادت میں سرانجام دیا تھا۔ سید ہاشم رضا کا کہنا تھا کہ اگرچہ اس بات کا قطعی علم نہیں تھا کہ ایئرپورٹ پر کون آرہا ہے اس کے باوجود ہدایات کی اہمیت کے پیش نظر جناح اسپتال کراچی میں موجود ایک بہترایمبولینس ایئرپورٹ روانہ کی گئی تھی۔ اس ضمن میں جو کچھ کہا جاتا رہا ہے یا کہا جارہا ہے اُس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کرنل سعید احمد جو اُس وقت جناح اسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے ان کے ایک مراسلے سے بھی سید ہاشم رضا کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ کرنل سعید کا یہ مراسلہ ۱۲ رمئی ۱۹۷۹ء کو روزنامہ 'ڈان' کراچی میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''میں اُس وقت جناح اسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تھا اور قائداعظم محمد علی جناح کے کراچی آنے سے پہلے یا بعد میں قائداعظم کی طبیعت کی ناسازی کی سنگینی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اسپتال کو گورنر جنرل کے ملٹری سیکریٹری کرنل جیوفرے ناؤلیس (Col. Geoffrey Knowles) کی جانب سے ایک اطلاع موصول ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ اُن کی رہائش گاہ پر ایک اہم شخصیت کے لیے جو آج سہ پہر کراچی پہنچ رہا ہے ایک ایمبولینس بھجوا دی جائے۔ اُس وقت اسپتال کے پاس دو ایمبولینس موجود تھیں جن میں سے ایک جو بہتر حالت میں تھی مناسب دیکھ بھال کے بعد حسبِ ہدایت بھجوا دی گئی۔ بدقسمتی سے ایئرپورٹ سے واپسی پر اُس میں مکینکل خرابی پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں شدید مایوس کن صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔''

گورنر جنرل کے ملٹری اے ڈی سی بریگیڈیئر نور احمد حسین نے جو کوئٹہ اور زیارت میں اس وقت ڈیوٹی پر تھے ۱۱ رستمبر ۱۹۸۱ء کو اپنے ایک مضمون مطبوعہ 'دی مسلم' میں قائداعظم کے حوالے سے اپنی یادداشتوں کو مجتمع کرتے ہوئے اس واقعے کے بارے میں لکھا ہے کہ ''۱۹۴۸ء کے کراچی میں ممکنہ طور پر بہتر حالت میں موجود ایمبولینس قائداعظم کے ذاتی طبیب اور ملٹری سیکریٹری کی نگرانی میں ایئرپورٹ روانہ کی گئی تھی۔ جہاں تک قائداعظم کی کراچی آمد پر کسی پروٹوکول کی عدم موجودگی کا سوال ہے تو قائداعظم کی کوئٹہ سے روانگی سے قبل محترمہ فاطمہ جناح نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں گورنر جنرل کے ملٹری سیکریٹری کو مطلع کردوں کہ وہ گورنر جنرل کی کراچی آمد کو قطعی خفیہ رکھیں اور گورنر کے ذاتی عملہ کے سوا کوئی سرکاری افسران ایئرپورٹ پر قائداعظم کے

استقبال کے لیے نہیں آئیں گے لہٰذا محترمہ فاطمہ جناح کے احکامات فوری طور پر ملٹری سیکریٹری کو پہنچا دیئے گئے۔ اس صورتِ حال کا تذکرہ قائداعظم کے سوانح نگار اسٹینلے والپرٹ نے بھی اپنی کتاب Jinnah of Pakistan میں کیا ہے مگر وہ بھی کوئی وضاحت نہیں پیش کر سکے ہیں۔

قائداعظم کی ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ سے کراچی آمد کو خفیہ رکھے جانے کی وجوہات کے بارے میں راقم الحروف اپنے مطالعے اور پیشِ نظر مضمون میں درج تفصیلات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ قائداعظم کی کراچی آمد کو خفیہ رکھنے کا فیصلہ خود قائداعظم کا اپنا تھا جسے محترمہ فاطمہ جناح نے دیگر متعلقہ افراد کو منتقل کیا۔ وہ جہاں اپنی طویل بیماری سے نڈھال اور ڈھانچہ ہو چکے تھے وہاں اُن کو یہ بھی احساس تھا کہ اُن کی ذات کے حوالے سے کوئی ایسی صورتِ حال قوم کے سامنے نہ آئے کہ جس سے عوام کے حوصلے پست ہو جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کی قوم جسے انہوں نے پاکستانی قوم ہونے کا تشخص دیا تھا اُن سے انتہائی درجہ کی محبت کرتی ہے لہٰذا وہ اپنی قوم کو کسی شدید افسردگی سے بھی بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی طویل ترین جدوجہد سے برصغیر کے مسلمانوں کو جو ایک منتشر ہجوم کی صورت میں تھے ایک قوم بنایا تھا لہٰذا وہ کبھی یہ پسند ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کی قوم اُن کو اسٹریچر پر دیکھے۔ وہ قوم کی نظر میں اپنی آخری تصویر ایک باہمت آدمی کی ہی رکھنا چاہتے تھے۔ ایک ایسے باہمت آدمی کی تصویر جس نے اپنی قوم اور اپنے ملک سے گہری وابستگی کی راہ میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی ہو۔

قائداعظم کے انتقال پر

عالمی رہنماؤں کے تعزیتی پیغامات

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی ۷۲ سالہ زندگی کے دوران تقریباً ۴۴ سال تک ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی، خوشحالی، سیاسی بالادستی اور آزادی کے لئے جدوجہد کی۔ اس عرصہ میں اگرچہ اُن کو بعض مراحل پر اپنے اور غیروں کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں اور ناقابلِ تسخیر سیاسی کردار نے ۱۹۳۷ء میں یہ بات طے کردی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بلاشرکت غیرے وہی قائداعظم ہیں۔ قائداعظم کی ان ہی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے جون ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے نام ایک خط میں تحریر کیا کہ ''اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے اس میں صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔'' یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر جب ہندوستان کے مسلمان اپنی بقاء اور سلامتی کی جانب سے بڑی حد تک مایوس ہو چکے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے تدبر، فراست، غیر متزلزل عزم سیاسی بصیرت اور بے مثل قائدانہ صفات سے کام لے کر مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد کر دیا اور سات سال کی مختصر مدت میں مطالبہ پاکستان کی ایسی وکالت کی کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا وہ دیرینہ خواب جو اسلامیانِ ہند گزشتہ دو صدیوں سے

دیکھتے چلے آرہے تھے۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو شرمندہ تعبیر ہوا۔ اس خواب کی تعبیر ایک فردِ واحد کی چشمِ کرشمہ ساز کا نتیجہ تھی اور وہ فردِ واحد قائداعظم محمد علی جناح تھے۔

۱۹۴۸ء بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کا آخری سال تھا۔ اگرچہ آپ نے اپنی سیاسی زندگی نہایت سرگرمی اور تندہی سے گزاری مگر آپ کی زندگی کے آخری دس سال جن میں آپ کو بڑھتی ہوئی عمر اور گرتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر مکمل آرام کی ضرورت تھی نہایت ہنگامہ خیز سال تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد نومولود ریاست کے مسائل ایسے نہ تھے جن کو قائداعظم نظر انداز کر دیتے یا دوسروں پر چھوڑ دیتے چنانچہ آپ نے ان مسائل کی جانب بھرپور توجہ دی۔ پاکستان کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کا تعین اور اس پر عملدرآمد کو یقینی بنانا، ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے وہاں کے عوام کے مسائل معلوم کرنا اور پھر ان کے تدارک کے لئے اقدامات، قومی معیشت کا فروغ واستحکام، تعلیمی نظام کو مؤثر بنانا، سرحدوں کا دفاع، آئین ساز اسمبلی، سرکاری ملازمین اور مسلح افواج کو نہ صرف اُن کے فرائض سے آگاہ کرنا بلکہ اُن کو یہ باور کرانا کہ قوم اُن سے کیا توقعات رکھتی ہے۔ ان تمام امور سے قائداعظم نے حتیٰ المقدور عہدہ برا ہونے کی بھرپور کوشش کی۔ بقول پروفیسر شریف المجاہد ''تمام حالات وواقعات کا دیانتداری سے تجزیہ کیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ نوزائیدہ قوم اپنی ہنگامہ خیز پیدائش کے فوراً بعد ہی پیش آنے والے تباہ کن اور ہولناک بحران میں بھی محض اس لئے زندہ سلامت رہی کہ اس دور میں قائداعظم امورِ مملکت کے نگراں تھے۔ پاکستان کے عوام کو اُن پر جو بے پناہ اعتماد تھا، لوگوں کے دلوں میں اُن کے لئے جو زبردست عقیدت ومحبت تھی قائداعظم نے اُسی کو بروئے کار لا کر اپنی قوم کو درپیش مشکلات ومصائب سے نمٹنے کے لئے حوصلہ عطا کیا۔ اُسے ان تباہیوں، بربادیوں اور ہولناکیوں کا نئی توانائیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا عزم عطا

کیا۔ آزادی نے عوام کے سینوں میں حب الوطنی کے جن جذبات کو بھڑکایا تھا اُن کی حدت، حرارت اور توانائی کا رخ تعمیری سرگرمیوں کی سمت موڑ دیا۔"

۱۹۴۸ء میں ۲۵ مئی کو آپ ڈاکٹروں کے مشورہ پر کوئٹہ گئے تا کہ وہاں ہر قسم کی فکر سے آزاد ہو کر مکمل آرام کر سکیں مگر کوئٹہ میں بھی مصروفیتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۹ جون کو آپ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کے لئے کراچی آئے اور پھر کام میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ کہ صحت مزید گر گئی۔ ڈاکٹروں کے مشورہ پر ۷ جولائی کو آپ دوبارہ کوئٹہ روانہ ہو گئے مگر آپ کی علالت اتنی سنگین صورت اختیار کر گئی تھی کہ ڈاکٹروں نے فوری طور پر زیارت منتقل کر دیا جو کوئٹہ کے مقابلے میں نسبتاً سرد مقام ہے۔ زیارت میں قیام کے دوران آپ کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی اور آپ اکثر و بیشتر اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح اور اپنے عملہ کے ارکان سے مختلف امور پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے جو اس وقت قائداعظم کے معالج تھے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے کہ جب میں ۱۷ر جولائی کو قائداعظم کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مسہری پر دراز تھے۔ جسم نحیف اور کمزور لیکن چہرہ باوقار اور پر جلال، آنکھوں میں بلا کی چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، وہ بہت کمزور ہو گئے تھے، رخسار کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور گال اندر کی طرف دھنس گئے تھے۔ بیماری کی وجہ سے رنگ اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک شاعر یا فلسفی کی طرح چہرے کی جھریاں ان کے گہرے مطالعہ اور تدبر کی باریکیوں کو نمایاں کر رہی تھیں۔ بیماری کے باوجود وہ روزانہ صبح شیو بنواتے اور صبح ساڑھے چھ بجے چائے پیتے، ہم نے اصرار کیا کہ اگر آپ سو رہے ہوں تو بہتر ہے کہ آپ کو نہ اٹھایا جائے کیونکہ آپ کے لئے آرام اور نیند اشد ضروری ہے۔ قائداعظم جواباً مسکرا دیے اور فرمانے لگے، "صحت کے لئے زندگی بھر کے اصول ترک نہیں کیے جا سکتے۔"

زیارت میں قائداعظم کے قیام اور بیماری کے بارے میں آپ کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب *My Brother* میں خاصی تفصیلات درج کی ہیں جو بہت اہم اور معلومات افزاء ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح اور قائداعظم کی محبت مثالی تھی۔ انہوں نے ۱۹۲۹ء میں قائداعظم کی اہلیہ محترمہ رتن بائی کے انتقال کے بعد سے قائداعظم کے گھر کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی تھی۔ وہ ہمہ وقت اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں حتیٰ کہ اُن کی سیاسی سرگرمیوں میں اس قدر دخیل تھیں کہ قائداعظم اُن سے سیاسی وانتظامی مسائل پر تبادلہ خیال بھی کیا کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم نے ایک تقریب میں محترمہ فاطمہ جناح پر اپنے مکمل اعتماد و بھروسہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ میرے لئے اُس وقت امید، ہمت اور معاونت کا ایک مستقل ذریعہ ثابت ہوئیں جب ہم ایک بڑے انقلاب سے ہمکنار ہو رہے تھے۔'' زیارت میں محترمہ فاطمہ جناح پورے انہماک سے قائداعظم کی تیمارداری میں مصروف رہیں۔

اس دوران انہوں نے کئی راتیں جاگ کر گزاریں مگر قائداعظم کی طبیعت میں کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔ قیامِ پاکستان کی پہلی سالگرہ قریب تھی۔ لیکن قائداعظم اپنی علالت کے سبب سالگرہ کی تقریبات میں شرکت سے معذور تھے۔ اس موقع پر آپ نے قوم کے نام ایک پیغام میں فرمایا۔ ''پاکستان کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی دنیا کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی یہ دنیا کی ایک عظیم ترین مسلمان ریاست ہے۔ اس کو سال بہ سال ایک نمایاں کردار ادا کرنا ہے اور ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جائیں گے ہم کو ایمانداری، مستعدی اور بے غرضی کے ساتھ پاکستان کی خدمت کرنا ہوگی۔''

زیارت میں قیام کے دوران قائداعظم کا بلڈ پریشر خاصا گر گیا تھا اور پیروں پر

ورم آ گیا تھا چنانچہ آپ کو ڈاکٹروں کے مشورے پر زیارت سے کوئٹہ منتقل کر دیا گیا۔ قائداعظم کے ایک اور معالج کرنل الٰہی بخش نے اپنی کتاب *With the Quaid-I-Azam During his Last Days* میں لکھا ہے کہ ''پانچ ہفتہ کی تسلی بخش صحت کے بعد ۳ ستمبر کو آپ کی حرارت بڑھ گئی۔ حرارت کا یوں اچانک بڑھ جانا بہت تشویش ناک تھا چنانچہ ہم نے بڑی احتیاط سے ان کا معائنہ کیا لیکن پھر بھی بخار کا سبب دریافت نہ کر سکے۔'' ۹ ستمبر کو کرنل الٰہی بخش نے معائنہ کے بعد محترمہ فاطمہ جناح سے قائداعظم کی زندگی کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا مگر محترمہ فاطمہ جناح نے امید کا دامن نہ چھوڑا اور برابر طبیعت کی بحالی کی آرزومند رہیں۔ ۱۰ ر ستمبر کو ڈاکٹروں کے مشورہ پر محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم کو کراچی لے جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ چنانچہ ۱۱ ر ستمبر کو آپ کا طیارہ سوا چار بجے ماری پور [illegible]ڈے پر اترا۔ قائداعظم کو ایک اسٹریچر پر لٹا کر بذریعہ ایمبولینس گورنر جنرل ہاؤس پہنچایا گیا۔ رات تقریباً ساڑھے نو بجے آپ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ چند منٹ کے اندر کرنل الٰہی بخش، ڈاکٹر ریاض علی شاہ اور ڈاکٹر مستری گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ اُس وقت قائداعظم پر بے ہوشی طاری تھی۔ نبض کی رفتار بھی غیر مسلسل تھی۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد انجکشن لگایا مگر حالت بگڑتی چلی گئی۔ ۱۰ ر بج کر ۲۵ منٹ پر فخرِ قوم، بطلِ جلیل، اسلامیانِ پاکستان کا ناخدا، عزم و استقلال، فراست اور ذہانت کا پیکر ہمیشہ کے لئے اللہ کی رحمت میں پہنچ گیا۔

قائداعظم کے انتقال کی خبر ذرا سی دیر میں پورے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر شخص اس عظیم سانحے اور حادثہ پر رنجیدہ اور افسردہ تھا۔ روتے ہوئے لوگوں کے گروہ اور بال نوچتی ہوئی عورتوں کا سیلاب دیوانہ وار گورنر جنرل ہاؤس کی طرف بڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں افراد گورنر جنرل ہاؤس کے اطراف جمع

ہو گئے۔ نیشنل کالج کے پروفیسر مکّرم علی خاں شیروانی نے جو قائداعظم کے انتقال کے وقت کالج کے طالب علم تھے انہوں نے ایک ملاقات میں ۱۱ر ستمبر کی رات کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ اُس رات میرے والد میر پور خاص جا رہے تھے۔ بولٹن مارکیٹ کے قریب اندرونِ سندھ جانے والی بسوں کا اڈہ واقع تھا۔ میں اُن کو چھوڑنے بس کے اڈہ پر گیا تھا مگر بس نہ آنے کی وجہ سے خاصی تاخیر ہوگئی۔ تقریباً ۱۱ ر بجے ایک شخص بس کا انتظار کرنے والے ہجوم کی طرف آیا اور بڑی غمزدہ آواز میں ہجوم کو اطلاع دی کہ قائداعظم کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ خبر ہم سب کے لئے بڑی دلدوز تھی مگر اس سے قبل کہ ہم اُس سے مزید تفصیل معلوم کرتے ہم میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس اجنبی کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا ''کیا بکتا ہے''۔ ایک لمحہ کے لئے وہ اجنبی حیران رہ گیا پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس نے طمانچہ مارنے والے کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اور اپنا دوسرا گال اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''بھائی اس پر بھی طمانچہ مارلو اور مجھے یقین دلادو کہ قائداعظم زندہ ہیں۔''

قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت نہ صرف پاکستان کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک عظیم سانحہ تھی جس کا ثبوت ان تعزیتی پیغامات سے ملتا ہے جو آپ کے انتقال پر پوری دنیا کے رہنماؤں نے جاری کیے۔ ان پیغامات میں جہاں قائداعظم کے انتقال پر دکھ اور رنج کا اظہار کیا گیا ہے وہاں دوسری طرف اُن کی جامع الصفات شخصیت، قائدانہ صلاحیتوں اور غیر متزلزل عزم اور استقامت کا بھی واضح الفاظ میں اعتراف موجود ہے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء کے اخبارات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں نے نہ صرف قائداعظم کے انتقال پر سوگ منایا بلکہ غائبانہ نمازِ جنازہ بھی ادا کی۔ کراچی میں نمازِ جنازہ کے موقع پر تقریر کرتے

ہوئے تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما علامہ شبیر احمد عثمانی نے فرمایا'' وہ اورنگزیب عالمگیر کے بعد دوسرے عظیم مسلمان تھے۔''

پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے دست راست نوابزادہ لیاقت علی خاں نے ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام اپنے نشری پیغام میں کہا۔'' اللہ تعالیٰ نے قائداعظم کو ایک ایسے وقت میں ہمارے درمیان سے اٹھالیا ہے جب کہ ہمیں ابھی اپنی قومی بقا کے دشوار ترین مراحل میں اُن کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔ ہم کو اس موقع پر اپنے اللہ کے سامنے عہد کرنا چاہیے کہ ہم غیر متزلزل عزم کے ساتھ اُس عظیم مقصد سے وابستہ ہوجائیں گے جس کے لئے قائداعظم نے حصولِ پاکستان کے بعد خود کو وقف کر دیا تھا۔ اور وہ عظیم مقصد یہ ہے کہ ہم اس نومولود مملکت کو ایک عظیم اور طاقتور ملک بنائیں گے جس کے معمار قائداعظم تھے۔ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے احسن طریقہ یہی ہے کہ ہم اُن کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان کو ویسا ہی بنانے کی کوشش کریں گے جیسا کہ قائداعظم بنانا چاہتے تھے۔''

برطانیہ کے شہنشاہ کنگ جارج نے محترمہ فاطمہ جناح کے نام ایک تعزیتی ٹیلیگرام میں کہا کہ'' مجھے اور ملکہ کو آپ کے عظیم بھائی اور پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کی خبر سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے آپ کے لئے بھی اور پاکستان کے عوام کے لئے بھی جن کے وہ عظیم رہنما تھے۔'' برطانیہ کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ قائداعظم کے انتقال سے پاکستان اپنے ایک عظیم ترین شہری سے محروم ہوگیا ہے۔ انہوں نے ایک مدت سے برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کے لئے اپنی عظیم صلاحیتوں کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ ہندوستان کی پاکستان اور بھارت کے درمیان تقسیم پر یقین رکھتے تھے اور اس

مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے انتھک اور مثالی جدو جہد کی۔ وہ ایک رہنما کی حیثیت سے نمایاں اور ممتاز تھے اور پاکستان میں اُن کے انتقال سے جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ شاید ہی پُر ہو سکے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے معروف رکن سر اسٹیفورڈ کرپس نے جن کو تحریکِ پاکستان کے دوران متعدد بار قائداعظم سے ملاقات و مذاکرات کا شرف حاصل ہوا تھا کہا کہ ''وہ بحیثیت انسان راست بازی اور دیانتداری کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ اُن کے ساتھ گفتگو کرنا متعدد وجوہات کی بنا پر دشوار ترین امر تھا۔ کیونکہ وہ اپنے مقصد اور مؤقف پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ وہ بہت نفیس اور خوش اخلاق میزبان تھے اور اپنے مؤقف کے حق میں دوسروں کو ہموار کرنا اور دوسروں کے اٹھائے ہوئے سوالات کا مدلل جواب دینے کے لئے پوری رات جاگنے کے لئے تیار رہتے تھے۔'' برطانیہ کے سابق وزیرِ ہند لارڈ پیتھک لارنس نے کہا کہ ''قائداعظم جناح کا نام ایک عظیم قوم کی تشکیل کرنے والے رہنما کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔''

امریکہ کے صدر ہیری ایس ٹرومین نے کہا کہ ''پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کے اچانک انتقال کی خبر سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ وہ نہ صرف پاکستان کے خواب کو تعبیر سے ہمکنار کرنے والے، ایک مملکت کے معمار اور دنیا کی سب سے بڑی مسلم قوم کے بابائے قوم تھے۔ مسٹر جناح کی مقصد سے وابستگی، جاں نثاری اور بے مثل قیادت کی یادیں پاکستان کے عوام اور حکومت کی آئندہ آنے والے دنوں میں ہمیشہ رہنمائی کرتی رہیں گی۔'' امریکہ کے سیکریٹری آف اسٹیٹ جارج مارشل نے کہا کہ ''قائداعظم محمد علی جناح اُن رہنماؤں میں ممتاز و نمایاں تھے جو اپنے مقصد پر، جس کے لئے انہوں نے اپنی جاں دے دی۔ غیر مشروط وابستگی اور غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف دنیا کی ایک بہت بڑی قوم کی تشکیل کی

بلکہ اس کے مشکل ترین ابتدائی مرحلہ میں دنیا کی دوسری اقوام کے ساتھ تعاون کوفروغ دے کر رہنمائی کی۔ اُن کی راست بازی، دیانتداری، خلوص اور نا قابلِ تسخیر عزم کی اُن کے سیاسی دوست اور دشمن سب ہی قدر کرتے تھے۔ اُن کی تنظیمی اور سیاسی امور میں جو مہارت تھی اُس نے ان کو نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کے عظیم مدبروں کی صف میں نمایاں اور ممتاز کر دیا تھا۔ اُن کے انتقال سے نہ صرف پاکستان کے عوام بلکہ اقوامِ عالم کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پاکستان کے عوام اور حکومت مستقبل میں اُن کے طرزِ عمل اور اصولوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ بناتے ہوئے عالمی سطح پر تعمیری کردار ادا کریں گے۔"

قائداعظم محمد علی جناح کے بعد گورنر جنرل کے عہدہ پر متمکن ہونے والے رہنما خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ "عظیم لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ قائداعظم بھی تاریخ اور پاکستان کے دوام وثبات تک زندہ رہیں گے۔ یہ بات ہمارے لئے باعثِ فخر ہے کہ قائداعظم ہماری قوم میں پیدا ہوئے اور ہم نے اُن کی بے مثل قیادت میں پاکستان حاصل کیا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لئے خود کو وقف کر دیں۔ یہی قائداعظم کے حضور ہمارا سب سے بڑا اخراجِ عقیدت ہوگا۔"

بھارت کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال سے جو عظیم نقصان پاکستان کے عوام اور پاکستان کو پہنچا ہے اس پر بھارت کے عوام، میرے رفقاء اور میری جانب سے دلی تعزیت اور ہمدردی قبول کیجئے۔ بمبئی کے وزیراعلیٰ اور قائداعظم کے دوست پی۔جی کھیر نے کہا کہ قائداعظم محمد علی جناح ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ ان کی قوتِ فیصلہ، خوداعتمادی اور بے مثال وکالت نے ان کو ایک قابلِ رشک رہنما بنا دیا تھا۔ ان کی موت ہم سب کا اجتماعی نقصان ہے۔

قائداعظم بلاشبہ ہندوستان کی جدید تاریخ کے معمار تھے۔ ایک تاریخ ساز شخصیت۔ ایک ایسی شخصیت جس کی عصرِ حاضر میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ بقول سروجنی نائیڈو ''جناح عصرِ حاضر کی سب سے سر برآوردہ اور جاذبِ نظر شخصیت تھے۔'' قائداعظم کے انتقال کو تقریباً اکہتر سال ہو چکے ہیں مگر آج بھی ان کی شخصیت اپنے سیاسی کردار کے آئینہ میں سماجی علوم کے ماہرین کے لئے ایک اہم ترین شخصیت ہے۔ ایک ایسی شخصیت جس کی تفہیم کے بغیر ہندوستان کی جدید تاریخ کا ابلاغ یقیناً ناممکن ہے۔

قائداعظم کی قیادت کا کرشمہ۔۔۔پاکستان

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح تدبّر اور فراست کا مجسمہ تھے۔آپ کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہوتا تھا۔آپ جو اقدام کرتے اُس پر پہلے اچھی طرح غور و فکر کر لیتے تھے اُس کے بعد اُسے عملی صورت دیا کرتے تھے۔تحریکِ پاکستان کے دوران متعدد مراحل پر آپ نے فیصلہ میں تاخیر کا مظاہرہ کیا جس سے جزوی طور پر مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوئی لیکن جب آپ نے اپنے فیصلہ کا اعلان کیا تو ہر شخص نے آپ کے تدبر اور فراست کی داد دی۔ خصوصاً ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے موقع پر آپ کی طویل خاموشی تشویش کا باعث تھی۔اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انگلستان سے واپسی پر جب آپ سے اخباری نمائندوں نے اس رپورٹ پر اظہارِ خیال کے لیے کہا تو آپ نے رپورٹ پر تبصرہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی مجھے اس رپورٹ کے تفصیلی مطالعہ کا وقت نہیں ملا ہے لیکن آپ نے اس موقع پر مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ پریشان نہ ہوں اور متحد رہیں کیونکہ مسائل حل ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔پھر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ کے مقام پر کل جماعتی کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے آئینی اور قانونی طور پر نہرو رپورٹ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور واضح طور پر کنونشن سے کہا کہ ''نہرو رپورٹ کو جناح کی تائید کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تائید کی ضرورت ہے۔اگر اقلیتوں کا مسئلہ آپ نے آج حل نہیں کیا تو لازماً اسے کل حل کرنا پڑے گا۔ہندو اور مسلمان اسی ملک کے باشندے ہیں۔اگر اُن کے درمیان باہمی

اختلافات ہیں بھی تو ان اختلافات کی وجہ سے دشمنی اورعداوت مول نہ لیجیے۔ اگر وہ باہم اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے سے معذور ہیں تو کم از کم اتنا تو کریں کہ دشمنوں کی مانند ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر نہیں بلکہ دوستوں کی طرح آپس میں مصافحہ کر کے جدا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی ایک بڑی آرزو ہے۔ اس اتحاد کے راستے میں کسی منطق، ناانصافی اور کسی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجیے۔'' قائداعظم کی اس دردمندانہ اپیل کے باوجود کانگریس کی ہندو قیادت نے قائداعظم کی ترامیم کو مسترد کرتے ہوئے نہرو رپورٹ کی، جس میں مسلمانوں کے آئینی حقوق کو نظرانداز کر دیا گیا تھا، منظوری دے دی۔

مسلمانوں کے مسائل اور مطالبات کے سلسلہ میں ہندو قیادت کا رویہ ہمیشہ ہٹ دھرمی اور ناانصافی پر مبنی رہا جس کی بنا پر مسلمانوں کے ہاں یہ خیال تقویت اختیار کرتا چلا گیا کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے ایک علیحدہ مسلم ریاست تشکیل دینا پڑے گی۔ کل جماعتی کنونشن سے واپسی پر قائداعظم نے اپنے ایک دوست جمشید نسروانجی سے فرمایا'' آج ہندوانڈیا اور مسلم انڈیا اس طرح جدا ہو رہے ہیں کہ وہ آئندہ کبھی باہم متحد نہیں ہوں گے۔'' قائداعظم کا یہ تجزیہ ایک پیشن گوئی ثابت ہوا اور مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلمانانِ ہند نے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ نہ صرف پیش کیا بلکہ اس مطالبہ کے حصول کے لیے من حیث القوم خود کو وقف کر دیا۔ قائداعظم نے اپنے تجربے کی روشنی میں ہمیشہ کانگریس کو ایک ہندو جماعت قرار دیا اور کانگریس بھی برابر اپنے ہندو جماعت ہونے کا ثبوت فراہم کرتی رہی۔ قائداعظم نے اسی مطالبہ کی روشنی میں جون ۱۹۴۰ء میں وائسرائے ہند سے واضح طور پر کہا کہ آئندہ جو بھی دستوری خاکہ مرتب کیا جائے

اُس میں دو خود مختار آزاد ریاستوں کا اصول شامل کیا جائے۔'' اسی اصول کی بنیاد پر قائداعظم نے مارچ ۱۹۴۶ء میں وزیراعظم برطانیہ کو ایک خط میں لکھا کہ ''ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام چاہتے ہیں اور یہی ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا واحد حل ہے۔''

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے حصولِ پاکستان کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کی مرحلہ وار سیاسی تربیت کی۔ اگر ہم آپ کی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی سیاسی زندگی کو دیکھیں تو ہمیں آپ کی تقاریر و بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہوئی نظر آئے گی کہ قائداعظم کے ذہن میں ابتدا ہی سے مسلمانوں کی آخری منزل تھی۔ ۱۹۳۴ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ازسرِ نو صدارت سنبھالنے کے بعد نہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی بلکہ مسلمانوں کو بھی مشورہ دیا کہ وہ متحد ہو جائیں اور کسی حتمی لائحہ عمل کے لیے تیار رہیں۔ فروری ۱۹۳۶ء میں آپ نے لاہور میں ایک تقریر کے دوران مسلمانوں سے کہا ''میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ سکون اور امن سے رہیں اور میری کوششوں میں مجھ سے تعاون کریں تا کہ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ آپ کی خدمت کر سکوں۔'' مارچ ۱۹۳۷ء میں صوبائی انتخابات کے موقع پر آپ نے ایک بیان میں فرمایا ''مسلمان سر دست غیر منظم اور بے یارو مددگار ہیں لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا۔ مسلم لیگ اُن کو منظم کر رہی ہے تا کہ وہ انتخابات میں کامیابی حاصل کر سکیں۔'' اپریل ۱۹۳۷ء میں آپ نے فرمایا ''ہم کانگریس سے برابری کی بنیاد پر تعاون کے لیے تیار ہیں لیکن ہم کسی کی حاکمیت اور بالادستی قبول نہیں کریں گے۔'' ۱۹۳۷ء میں ہی آپ نے فرمایا ''اس وقت پورے

ہندوستان میں مسلم یکجہتی کی ضرورت ہے۔ مسلم لیگ قومی اصولوں پر یقین رکھتی ہے اس لیے وہ اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ مسلم حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔'' فروری ۱۹۴۰ء میں آپ نے اینگلو اورینٹل کالج دہلی میں ایک تقریر کے دوران فرمایا ''جب میں یہ محسوس کروں گا کہ مسلمان جدوجہد کے لیے آمادہ ہوگئے ہیں تو پھر میں اُن کو آگے بڑھنے کا حکم دوں گا۔'' مارچ ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ کے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''کسی پر بھی انحصار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنی قوت پر انحصار کرنا ہے۔''

قائداعظم محمد علی جناح کی مسلسل حوصلہ افزائی اور سیاسی تربیت کے نتیجہ میں مسلمانوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو علیحدہ خودمختار ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کیا۔ بعد میں یہ مطالبہ 'مطالبہٗ پاکستان' کے نام سے معروف ہوا اور اس مطالبہ کے حصول کے لیے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے جدوجہد میں مصروف ہوگئے۔ ۳ نومبر ۱۹۴۰ء کو قائداعظم نے بمبئی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''مجھے اُمید ہے کہ مسلمان یہ بات ذہن نشین کرلیں گے کہ وہ اقلیت نہیں ہیں، وہ ایک قوم ہیں اور اس لحاظ سے ہمارا ایک علاقہ اور ایک علیحدہ ملک ہونا چاہیے۔'' دسمبر ۱۹۴۰ء کو بمبئی ہی میں ایک اور اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کسی بھی فرقہ یا قوم کی طاقت کا انحصار تین چیزوں پر ہوتا ہے۔ تعلیم، ترقی یافتہ تجارت اور شجاعت۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان اوصاف سے خود کو لیس کرلیں۔'' ۳ جنوری ۱۹۴۱ء کو آپ نے فرمایا ''میں نے آج تک پاکستان کے خلاف کوئی ٹھوس دلیل نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان کے قیام سے ہندوستان کی فضا اور صورت حال مزید

بہتر ہو جائے گی۔" مارچ ۱۹۴۱ء کو کانپور میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "پاکستان کا قیام بہت ضروری ہے۔ اس بات پر جس قدر اصرار کیا جائے وہ کم ہے۔" جنوری ۱۹۴۲ء میں کلکتہ میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "گزشتہ دو صدیوں کے دوران مسلمانوں نے بہت کچھ کھویا اور سختیاں برداشت کیں۔ لیکن اب کھوئی ہوئی چیزوں کو واپس لینے کا وقت آ گیا ہے۔ وقت ہمارے دعوے کی صداقت کا ثبوت دے گا۔"

تحریکِ پاکستان کی عظیم ترین جدوجہد میں کامیابی کے بعد پاکستان کا حصول جہاں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت اور اعلیٰ سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا، وہاں اُس بے مثال قومی یکجہتی کا بھی مظہر تھا جس کی تعلیم قائداعظم اپنی قوم کو مسلسل دیا کرتے تھے۔ آپ نے بار بار مسلمانوں سے فرمایا کہ ہماری نجات ہمارے مکمل اتحاد، باہمی اتفاق اور نظم وضبط میں ہے۔ ہم امن عالم کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی تمام اقوام کے لیے بہت دوستانہ ہوگی۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی منظم قوم کے درست فیصلے کی مزاحمت نہیں کرسکتی ہے۔ ۳۰/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "کوئی قوم ابتلا اور ایثار کے بغیر آزادی حاصل نہیں کرسکتی۔ ہم شدید دشواریوں اور ناگفتہ بہ مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہم خوف اور اذیت کے تاریک ایام سے گزرے ہیں لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتحاد، حوصلے، خوداعتمادی اور اللہ کی تائید سے کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔"

قائداعظم محمد علی جناح ہر مشکل مرحلہ پر اپنی قوم کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ اُن کے اندر عزم اور یکجہتی کی روح پھونکتے رہے کیونکہ آپ کا ایمان تھا کہ ہم جس قدر عظیم قربانیاں دیں گے اُسی قدر بہتر عمل اور کردار کا مظاہرہ کریں گے۔ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے اپنے ایک پیغام میں فرمایا ''آپ سب کے لیے میرا پیغام اُمید، حوصلے اور اعتماد کا پیغام ہے۔ آیئے ہم باقاعدہ اور منظم طریقے سے اپنے تمام وسائل مجتمع کریں اور درپیش سنگین مسائل کا ایسے عزم اور نظم وضبط سے مقابلہ کریں جو ایک عظیم قوم کا وطیرہ ہوتا ہے۔'' ۳۰/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہی ریڈیو پاکستان لاہور سے قائداعظم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ''ایک متحد قوم کو جس کے پاس ایک عظیم تہذیب اور تاریخ ہے کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ کام، کام اور کام کریں، آپ یقینا کامیاب ہوں گے۔ اپنا نصب العین یعنی اتحاد، ایمان اور تنظیم کبھی فراموش نہ کیجیے۔'' ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا ''میں چاہتا ہوں کہ باوجود ان خطرات کے جو ہمیں درپیش ہیں، آپ سب کامل اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستان کا وقار پہلے سے زیادہ بلند رکھتے ہوئے اور اسلام کی عظیم روایات اور قومی پرچم کو بلند کیے ہوئے ان خطرات کے درمیان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں گے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی جدوجہد، آپ کا عزمِ صمیم، آپ کی دردمندی اور آپ کے تدبر وحکمت کے پیش نظر اکثر سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں نے یہ بات کہی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح بیسویں صدی کی ملتِ اسلامیہ اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام تھے۔ یہ ایک

واضح حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جب کسی قوم کی تقدیر بدلنا ہو اور اسے دیگر اقوام کے مقابلے میں سربلندی و سرفرازی کے مقام پر پہنچانا ہو تو وہ اُس قوم میں ایسے باکمال اور بلند مرتبت انسان پیدا کرتا ہے جو اپنی جرأت و ہمت، تدبر و خلوص اور اصابت رائے سے اُس کی تقدیر بدل دیتے ہیں اور وہ قوم زندہ اقوام میں ایسا مقام حاصل کرلیتی ہے جس پر دنیا رشک کرتی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی ایک ایسے ہی انسان تھے جنہوں نے مایوسی اور نااُمیدی کی فضا میں عزم و حوصلہ کا چراغ جلایا اور اپنی لیاقت و ہمت، معاملہ فہمی، استقامت اور استقلال سے ایک ایسی مملکت وجود میں لانے کا عظیم کام سرانجام دیا جو آج بھی بین الاقوامی اُمور میں اپنا ایک اہم وجود رکھتی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نزدیک پاکستان کا قیام ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ کی سمت میں اوّلین قدم تھا۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد پورے عالم اسلام کو متحد و منظم کر کے اُس کی عظمت رفتہ کو بحال کرنا چاہتے تھے جیسا کہ قائداعظم کی تقاریر، بیانات اور مختلف تحریروں سے ثابت ہے۔ آپ نے پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام اپنے پیغام میں فرمایا ''یاد رکھیے کہ قیامِ پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تاریخِ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تاریخِ عالم کی عظیم ترین مسلم مملکتوں میں اس کا شمار ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کو اپنا شاندار کردار ادا کرنا ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ ہم دیانت داری، خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرتے رہیں۔ مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے کہ وہ ہر موقع پر خود کو اسلامی تاریخ، عظمت اور روایات کا امین ثابت کرے گی۔'' آج قیام پاکستان کو ۲۷ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران ہم نے قائداعظم کی ہدایت اور خواہش

کے مطابق قومی اور بین الاقوامی اُمور میں کیا وہی کردار ادا کیا ہے جس کی قائداعظم ہم سے توقع رکھتے تھے؟ اس سوال پر ہم کو بحیثیت قوم ضرور غور کرنا چاہیے کہ اس غور وفکر میں ہماری بقا اور ترقی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

قائداعظم اور تعمیرِ ملّت

ہم پاکستانی ہیں اور ہم نے ایک طویل عرصہ تک برصغیر پاک و ہند پر حکومت کرنے کے بعد جب تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل دورِ زوال دیکھا تو ہماری فکری قیادت کے ذمہ داروں کو یہ خیال آیا کہ اس برصغیر میں مسلمانوں کی قومی حیثیت کیا ہے اور کیا اس زمین سے ان کا وہی رشتہ استوار ہو چکا ہے جو یہاں کی مقامی آبادی یعنی ہندوؤں کا ہے۔ یہ خیال ماضی میں بھی ایک گونج کی صورت میں موجود تھا اور کسی حد تک اس کے ڈانڈے اکبر کے دینِ الٰہی سے پیوست تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی اس ضمن میں خیال آرائی کی لیکن اس خیال کی ضرورت، اہمیت اور شدت قابلِ غور حد تک پہلی مرتبہ زوال آمادہ ہندوستان میں محسوس کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس خیال کی جو طوالتِ زمانہ کی بنا پر ایک سوال کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ابتداً فکری سطح پر اور بعد میں عملی طور پر اس سوال کی اس طرح توضیح وصورت گری کی گئی کہ نہ صرف دوقومی نظریہ کو واضح خطوط میسر آئے بلکہ مطالبۂ پاکستان کے لیے بھی راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔ اگر ہم قیامِ پاکستان سے قبل کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو فکری اور عملی میدان میں تین افراد واضح طور پر مسلمانوں کو ملت اور قومیت کے حوالے سے دعوتِ اصلاح اور عمل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خان، علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح۔ اس لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ان تینوں رہنماؤں کی فکر کی روشنی میں ہم ہندوستانی مسلمانوں میں ملت کے تصور کے فروغ کی اساس و بنیاد تلاش

کریں۔

جہاں تک سرسید احمد خان کا تعلق ہے وہ اگرچہ ہندوستان کی جدید تاریخ میں مسلم قومیت کے حوالے سے ایک اساسی رجحان کے نمائندہ نظر آتے ہیں لیکن وطنیت، قومیت اور ملت کے حوالے سے ان کے خیالات تفہیمی تضاد کے حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک اکائی رکھتے ہیں۔ سرسید احمد خان نے متحدہ قومیت کی نفی کی ہے اور ایک مرحلہ پر انہوں نے حکومتِ وقت سے انتخابات کے حوالے سے واضح طور پر کہا کہ ہندوستان فی نفسہ ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے افراد کثرت سے رہتے ہیں اس لیے کوئی سادہ سا سیاسی نظام ان افراد کے باہمی تعلقات میں مزید خرابی پیدا کرے گا اور بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالبات پر غالب آجائے گی۔ سرسید احمد خان کا سیاسی شعور ان کو اس بات کا یقین دلاتا تھا کہ مغربی طرز کا کوئی بھی نظام ہندو اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو مزید وسیع کردے گا۔ سرسید کا نظریہ تعلیم بھی ان کے سیاسی موقف کی تائید کرتا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک مہذب اور اخلاقِ فاضلہ کی حامل قوم بنانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ایک تقریر میں انہوں نے کہا بھی ہے کہ "میری خوشی قوم کو قوم بنانے میں ہے۔" اپنے رفیق کار نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں ہندی زبان کے نفاذ پر تبصرے کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے لکھا کہ "مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہیں ہوں گے اور اگر ہندو اس پر مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ اور مسلمان علیحدہ ہوجائیں گے۔" سرسید احمد خان کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ گویا انیسویں صدی فکری اعتبار سے سرسید کی صدی تھی۔ بیسویں صدی میں علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے افکار و نظریات عام ہوئے۔ علامہ اقبال پر ابتداً وطنیت کا غلبہ تھا لیکن وہ بہت جلد اس خیال سے متفق ہوگئے کہ ملت وطنیت سے بلند تر اور افضل تصورِ اجتماع ہے۔ اس فکری انقلاب کے بعد علامہ اقبال نے اپنے ایک خطبہ میں کہا کہ ہماری قومی زندگی کا

تصورِ اسلام سے مشروط ہے۔ باالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جونسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے وہ اسلام کو مسلمانوں سے ہے اور اس گھر میں جہاں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی، ہمارا شیرازہ بکھرا۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم 'وطنیت' میں کہا کہ ''اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔'' اقبال کے اس خیال کی تائید ایک معروف مستشرق Wilfred Cantwell Smith نے اپنی کتاب *Islam in Modern History* میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا تصورِ قومیت مذہب کی راہ سے پروان چڑھتا ہے اسی لیے بعض مسلم ممالک میں سیاسی حالات کی تبدیلی کے باوجود ملی وحدت کا شعور زندہ رہا۔ امتھ کی اس شہادت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت سلمان فارسی کا ایک جواب یاد آجاتا ہے۔ حضرت سلمان فارسی سے کسی نے آپ کا نسب دریافت کیا تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا ''سلمان ابنِ اسلام''۔ حضرت سلمان فارسی کا یہ جواب نہ صرف اسلامی تعلیمات کی رُوح کے عین مطابق ہے بلکہ اس بات کی گواہی بھی دیتا ہے کہ مسلمانوں کا تصورِ ملت اسلام سے وابستہ ہے۔ بقول اقبال:

اپنی ملت پر قیاس، اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اسلام کے اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی کوکھ سے معاشرتی اور عمرانی قوانین نے جنم لیا ہے اور یہی تصورِ ملت کی اساس ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح ابتداً متحدہ قومیت کے مبلغ تھے لیکن سیاسی جدوجہد کے دوران اُن پر یہ بات واضح ہوگئی کہ برصغیر پاک وہند میں ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کو اُن کی علیحدہ قومیت کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ ''ہندوؤں نے

اخلاقی، ثقافتی اور سیاسی شعور کے ضروری اوصاف پیدا کر لیے ہیں اور ان اوصاف نے ہندوؤں میں ایک قومی احساس کی صورت اختیار کر لی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان بھی ان ہی اوصاف کو اپنے اندر فروغ دیں۔ جب بحیثیت قوم یہ اوصاف آپ اپنے اندر پیدا کر لیں گے تو جس چیز کے حصول کا آپ ارادہ کریں گے وہ آپ کو حاصل ہو جائے گی۔''

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے مارچ ۱۹۴۰ء میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا ''ایک چیز قطعی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم اس برصغیر میں کسی طرح اقلیت نہیں ہیں۔ ہم اپنے نصب العین کے ساتھ بجائے خود ایک علیحدہ اور نمایاں قوم ہیں۔ اور یہ نصب العین اسلام ہے۔'' قائداعظم نے اپنی تقاریر میں بار بار اس بات کی وضاحت اور صراحت کی ہے کہ ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں۔

قائداعظم کے نزدیک متحدہ وطنی قومیت اور مسلم قومیت میں ایک گہرا تضاد موجود تھا اور اسی تضاد کے شدید احساس نے مسلمانوں کے اذہان میں دوقومی نظریہ کو راسخ کیا جس کے نتیجہ میں بالآخر پاکستان وجود میں آیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم نے ۱۸/اگست ۱۹۴۷ء کو عیدالفطر کے موقع پر اپنے ایک پیغام میں اللہ رب العزت سے دعا کی کہ ''اے اللہ! ہم سب کو اپنے شاندار ماضی اور تابناک تاریخ کا اہل بنا دے اور ہمیں اتنی طاقت عطا فرما کہ ہم پاکستان کو حقیقی معنی میں جملہ اقوام عالم میں ایک عظیم قوم بنا دیں۔'' اسی پیغام میں قائداعظم نے یہ بھی کہا تھا کہ ''پاکستان کے عوام سے تعمیر ملت بھی اُنہی کوششوں اور قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے جن کی حصولِ پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے لیے ہم کو ضرورت پڑی تھی۔''

آج جبکہ پاکستان کے قیام کو بہتر سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے 'تعمیرِ ملت'

کا تقاضا اب بھی تروتازہ ہے۔ اب بھی اپنے قومی وجود کی جانب سے موہوم تشکیک ہمارے خیال وفکر کو پراگندہ کرتی رہتی ہے اور اب بھی ہمیں بار بار اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ یقین دلانے کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے کہ پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور قائم رہے گا۔ بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ اپنی سرزمین سے محبت اور وفاداری ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ گویا ہم آج بھی اپنے اندر ایک بے شعوری غیر یقینی کا شکار ہیں۔ ہمارا جذبہ قومیت آج بھی تلقینوں کا محتاج ہے۔ آج بھی ہمارے دلوں میں یہ سوال شدت سے ابھرتا ہے کہ کیا یہ ملک واقعی سلامت رہ سکتا ہے یا رہے گا۔ ہماری یہ صورتِ حال نہ تو کسی وطن دشمنی کی بنا پر ہے اور نہ ہی جذبہ حب الوطنی کے فقدان کی بنا پر۔ بلکہ اس کی اصل وجہ برسر اقتدار آنے والے مفاد پرست عناصر ہیں جنھوں نے اپنے قول وعمل میں دوعملی اختیار کی۔ ملک کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کر اپنے مفاد پر نگاہ رکھی۔ قیامِ پاکستان کے مقاصد کیا تھے اور وہ محرک کیا تھا جو تحریکِ پاکستان کے دوران نصب العین کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہ جاننے کی نہ کل ہمارے پاس فرصت تھی اور نہ آج ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہمارے سینے کروڑوں تھے لیکن دل ایک تھا۔ آج سینے تو موجود ہیں لیکن ملی شعور سے معمور دل معدوم ہو گیا ہے۔ آج ہم ذوقِ عمل سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہمارے عمل کی سمت بدل گئی ہے۔ ہم نے قائداعظم محمد علی جناح کے بتائے ہوئے راستے سے منہ موڑ لیا ہے۔ اُن کی تقاریر و بیانات سے استفادہ نہیں کیا چنانچہ اپنی ملی تاریخ سے لاعلمی نے ہمیں ایک اخلاقی اور روحانی زوال سے دوچار کر دیا ہے لہٰذا اخلاقی اور روحانی انقلاب کے لیے اب ہم کو ازسرِ نو جدوجہد کرنا ہوگی کیونکہ زندگی کی تکمیل بھی اسی میں ہے اور ملت کی تعمیر بھی اسی

میں پوشیدہ ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ جن قوموں کا جغرافیہ نیا ہوتا ہے اُن کو اپنے استحکام کے لیے اپنی ملی تاریخ کو تازہ رکھنا پڑتا ہے اور یہی پیغام قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر میں نہ صرف موجود ہے بلکہ ہم کو دعوتِ غور وفکر دے رہا ہے، ہم سے ملی اخلاص کا مطالبہ کر رہا ہے کیونکہ قومی اور ملی تعمیر اسی پیغام میں مضمر ہے۔

قائداعظم کی عوام سے توقعات

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا شمار بیسویں صدی عیسوی کی اُن عظیم شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنی حیات وخدمات کی روشنی میں تاریخ کا ایک ایسا باب بن گئی ہیں کہ نہ صرف آنے والی صدیاں اُن کے تذکرے سے گونجتی رہیں گی بلکہ آئندہ نسلیں بھی اُن کے خیالات وافکار سے رہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے برصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کو جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سے منتشر اور پسماندہ تھی نہ صرف متحد کیا بلکہ اُن کے اندر ایک علیٰحدہ قومیت کا احساس پیدا کر کے اُن کو ایک جغرافیائی وجود حاصل کرنے کے جذبہ سے سرشار کیا۔ مطالبہٗ پاکستان کو مسلمانانِ برصغیر کا ایک اعلیٰ اور ارفع مقصدِ حیات بنا کر اُن کے لئے ایک علیٰحدہ وطن پاکستان حاصل کیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان نہایت نامساعد حالات میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ایسے حالات میں قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے کردار اور افکار سے پاکستانی قوم کو زندہ رہنے کے لئے حوصلہ دیا۔ اُن کو ایک لائحہ عمل دیا تا کہ وہ اپنی مملکت کی حفاظت کر سکیں اور پاکستان کو ترقی وخوشحالی کی راہ پر ڈال سکیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد سے ہی پاکستان کے حوالے سے غور وفکر شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ آپ نے دسمبر ۱۹۴۳ء میں ایک انگریز صحافی بیورلے نکلس (Beverley Nichols) کو انٹرویو دیتے

ہوئے فرمایا۔'' کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اقتصادی لحاظ سے پاکستان ایک مفلوج ملک ثابت ہوگا لیکن وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں کہ مسلمان ایک سخت جان قوم ہیں۔ سخت کوش اور جفاکش۔ اگر پاکستان میں ایسا ہوا تو مسلمانوں کو کچھ اور جفاکش ہونا پڑے گا اور وہ کوئی شکوہ نہیں کریں گے۔''

پاکستان ایک انتھک جدوجہد کے بعد انتشار اور افراتفری کے عالم میں قائم ہوا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ شاید ہی دنیا کی کسی اور قوم نے اپنی قومی زندگی کے سفر کا آغاز اس قدر محدود وسائل کے ساتھ کیا ہو۔ نہ اس کے پاس کوئی دارالحکومت تھا اور نہ کوئی انتظامی ڈھانچہ، نہ کوئی منظم فوج تھی نہ دفاعی طاقت، خزانہ خالی تھا۔ ایسے حالات میں پاکستان کا مستحکم بنیادوں پر استوار ہو جانا یقیناً ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ تاریخ کے اس انتہائی نازک مرحلہ پر پاکستان کو اگر کچھ میسّر تھا تو وہ قائداعظم کی تدبّر وفراست سے لبریز قیادت تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۲۷ر نومبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے قوم کے نام ایک بیان میں فرمایا۔

> ہم کو جو کچھ حاصل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک عوام مجتمع کریں۔ اور اپنی آئندہ نسلوں کے کردار کی تعمیر کریں۔ فوری اور اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو سائنسی اور فنی تعلیم دیں تاکہ ہم اپنی اقتصادی زندگی کی تشکیل کرسکیں۔ ہمیں اس بات کا اہتمام کرنا ہوگا کہ ہمارے لوگ سائنس، تجارت، کاروبار اور بالخصوص صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی طرف توجہ دیں۔ ہمیں دنیا کا مقابلہ کر کے خود کو ایک خود کفیل قوم بنانا ہے۔

قائداعظم نے اپنی تقاریر اور بیانات میں ہمیشہ پاکستانی قوم سے یہی فرمایا کہ'' وہ پاکستان کے استحکام اور قومی یکجہتی کے لئے خود کو وقف کر دیں کیونکہ پاکستان ہی سب کچھ ہے۔'' تحریکِ پاکستان کے دوران آپ نے متعدد بار یہ فرمایا کہ

''پاکستان کا حصول ہماری منزلِ مراد ہے۔ ہم پاکستان سے ہیں اور پاکستان ہم سے ہے۔'' ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کو آپ نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ہم نے ایک بے مثال طوفانی انقلاب سے گزر کر پاکستان حاصل کیا ہے۔ اگر اب ہم اپنی مملکت پاکستان کو خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تمام تر توجہ عوام کی فلاح و بہبود اور غریبوں کی جانب مرکوز کر دینا چاہیے تا کہ وہ قومی امور میں ہاتھ بٹا سکیں۔ اگر ہم باہمی تعاون کے ساتھ کام کریں گے تو کامیابی اور ترقی یقیناً ہمارے قدم چومے گی۔''

پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔ ''آپ کو صوبہ کی محبت اور اپنی مملکت کی محبت کے درمیان فرق کو سمجھنا ہوگا۔ مملکت کی محبت ہم کو ایک ایسی سطح پر لے جاتی ہے جو صوبائی محبت سے بالاتر ہے۔ ہم کو بلند تر حب الوطنی کی ضرورت ہے۔ مملکت سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے ذاتی، مقامی یا صوبائی مفادات کو سارے ملک کے مفاد کے طابع کر دیں۔''

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کو کن خطوط پر مستقبل میں استوار دیکھنا چاہتے تھے یہ بات آپ کے افکار و خیالات سے بہت واضح ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ۱۷ ردسمبر ۱۹۴۴ء کو آپ نے تاجروں کے ایک استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''کسی بھی قوم کی پائیداری کا انحصار اقتصادیات پر ہوتا ہے۔ قوموں کے درمیان بڑی جنگیں بھی اقتصادی حکمتِ عملی سے لڑی جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد اس خطہ میں مسلمان اقتصادی طور پر زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔''

قائداعظم نے پاکستان کے قیام سے قبل ہی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف تجارتی اور اقتصادی اداروں کی تشکیل شروع کر دی تھی۔ آپ نے مسلم

ایوانہائے تجارت قائم کیے۔ بنکوں کی بنیاد رکھی۔ فضائی کمپنی قائم کی۔ جہاز رانی کا ایک ادارہ قائم کیا۔ یہ تمام اقدامات اس بات کی دلیل ہیں کہ قائداعظم پاکستان کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے قیامِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر قوم کے نام ایک پیغام میں فرمایا۔

قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے۔ آپ کے پاس غیر محدود وسائل موجود ہیں۔ آپ کی مملکت کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ اب اس کی تعمیر آپ کا کام ہے۔ لہٰذا اس کی تعمیر کیجئے۔ جس قدر جلد اور عمدگی سے آپ یہ کام کر سکتے ہیں کریں۔ آگے بڑھیئے۔ میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

فروری ۱۹۴۸ء میں آپ نے فوجی افسروں اور نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''بحیثیت پاکستانی ہماری اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں کہ ہم خود بھی امن وسکون سے زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی امن وامان کی فضا میں زندہ رہنے کا حق دیں۔ اپنے ملک کو اپنی صوابدید کے مطابق بغیر کسی بیرونی مداخلت کے ترقی دیں اور اپنے عوام کے حالات سدھاریں۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا اگر ہم صدق دل اور خلوص کے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کرلیں اور اپنی قوم کے اجتماعی مفاد کی خاطر قربانیوں کے لئے آمادہ ہوجائیں تو ہم بہت جلد اپنے مقاصد کو حاصل کرلیں گے۔''

آج پاکستان کے قیام کو ۷۲ (بہتر) سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ارشادات کی روشنی میں پاکستان کو پاکستان بنانے کی ذمہ داری پوری کی ہے یا نہیں۔ یقیناً یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر بحیثیت ایک سچے پاکستانی کے ہم کو ہر لمحہ غور کرنا چاہیے۔

رتی جناح — قائداعظم کی شریکِ حیات

انڈین نیشنل کانگریس کی رہنما اور ممتاز شاعرہ بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے جب ۱۹۱۶ء کے اواخر میں ایک اجلاس کے دوران محمد علی جناح کو 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کہا تو اس وقت ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کا یہ سفیر اپنے مذہب کی حقانیت پر اس قدر یقین رکھتا ہے کہ ایک پارسی نژاد لڑکی کو مسلمان کر کے اپنی شریکِ حیات بنالے گا۔ اس دور میں جبکہ پورا ہندوستان ہندو مسلم اتحاد کے نعرے سے گونج رہا تھا اور یہ باور کیا جاتا تھا کہ مذاہب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندوستان کے عوام کا اتحاد بنیادی اہمیت کا حامل ہے محمد علی جناح کے اس اقدام سے صرف مسز سروجنی نائیڈو ہی حیرت وتشویش میں مبتلا نہیں ہوئی تھیں بلکہ پورا ہندوستان استعجاب کی تصویر بن گیا تھا۔

محمد علی جناح کی پہلی شادی بچپن میں ہوئی اور جب وہ لندن میں زیر تعلیم تھے تو ان کی اہلیہ کا کراچی میں انتقال ہوگیا جس کے بعد سے محمد علی جناح تجرد کی زندگی گزار رہے تھے۔ یعنی ۱۹۱۸ء میں جب انہوں نے بمبئی کے مشہور پارسی بیرونیٹ سر ڈنشا پٹیٹ کی اکلوتی بیٹی رتی پٹیٹ سے نکاح کیا تو ان کی عمر بیالیس سال تھی اور ان کی پہلی اہلیہ کے انتقال کو تقریباً چوبیس سال بیت چکے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی دوسری اہلیہ ان سے عمر میں چوبیس سال ہی چھوٹی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ محمد علی جناح اور ان کی دوسری اہلیہ رتی پٹیٹ کے والد میں دوستانہ مراسم تھے اور ۱۹۱۶ء میں وہ سر ڈنشا

پٹیٹ کے خاندان کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے دارجلنگ گئے تھے، انہی چھٹیوں کے دوران رتی پٹیٹ نے جو اس وقت سولہ سال کی شوخ وشنگ، ذہین وطباع اور نہایت حسین وجمیل لڑکی تھیں، محمد علی جناح میں دلچسپی لینا شروع کی اور بہت جلد ہی وہ ان کے دل کی دھڑکنوں کا حصہ بن گئیں۔ رتی پٹیٹ کی ذہانت، علم دوستی، شاعرانہ افتادِ طبع اور خوش پوشاکی کا پورے بمبئی میں چرچا عام تھا۔ ان کو عام طور پر 'بمبئی کا گلاب' کہا جاتا تھا۔ اس کم عمری میں رتی پٹیٹ نے اپنی غیر معمولی اور مخصوص صلاحیتوں کی بنا پر خود کو بمبئی کی باوقار خواتین کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان کی پرورش چونکہ شاعرانہ ماحول میں ہوئی تھی اس لیے ٹینی سن، بائرن، شیلے، کیٹس، آسکر وائلڈ اور براؤننگ جیسے شعراء کی اکثر نظمیں ان کو ازبر تھیں۔ مطالعہ سے ان کی رومانی جبلت بہت شدید ہوگئی تھی اور وہ اپنی سوچ کی اس منزل پر تھیں جہاں ایک لڑکی کو اپنے خوابوں کے شہزادے کی تلاش ہوتی ہے۔ محمد علی جناح کی پروقار شخصیت، مخصوص طرز استدلال، انداز واداامیں نفاست، خوش سلیقگی اور منفرد ذہانت نے رتی پٹیٹ کو شدید متاثر کیا تھا۔ پھر دارجلنگ میں محمد علی جناح کی قربت نے ایسے مواقع فراہم کیے کہ رتی پٹیٹ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ خود کو محمد علی جناح کے دامنِ الفت سے وابستہ کر چکی ہیں۔ کیوپڈ کا کوئی مدون ضابطہ قانون نہیں ہوتا وہ کسی نہ کسی گوشے سے انسان کے دل کو نشانہ بنا ہی لیتا ہے سو محمد علی جناح نے بھی رتی پٹیٹ کے لیے اپنا درِ دل وا کر دیا۔

رتی پٹیٹ اور محمد علی جناح کی یہ دلچسپی جو عشق سے تعبیر تھی مشک کی طرح عام ہونے لگی۔ سر ڈنشا پٹیٹ کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ چراغ پا ہوگئے۔ انہوں نے اولاً بحیثیت باپ رتی پر پابندی عائد کی لیکن جب وہ اپنی سی کوششوں میں ناکام ہوگئے تو انہوں نے رتی کی عمر کا سہارا لے کر رتی اور محمد علی جناح کی ملاقات کے خلاف عدالت سے حکم امتناعی حاصل کرلیا۔ محمد علی جناح ایک قانون دوست انسان

تھے اس لیے انہوں نے عدالت کے حکم امتناعی کی مکمل پاسداری کی اور وہ تقریباً ڈیڑھ سال رتی پٹیٹ سے نہیں ملے مگر عرصہ ہجر کی طوالت نے ان کی چاہتوں کو شدید کر دیا۔ انتظار کی کیفیت نے ایک دوسرے کی محبتوں پر ایقان کو مستحکم کیا۔ وہ جانتے تھے کہ سماج اور قانون تادیر ان کے درمیان حائل نہیں رہ سکتے چنانچہ یہی ہوا۔ جب وقت نے اپنے پَر سمیٹے تو رتی پٹیٹ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھیں۔ اس مرحلہ پر رتی پٹیٹ نہایت جرأت مندی اور سرشاری کے عالم میں اپنے والدین کی ڈیوڑھی پار کر کے جہاں وہ ڈیڑھ سال سے محصور تھیں مالا بار ہل پر واقع محمد علی جناح کی کوٹھی پر جو اس وقت 'ساؤتھ کورٹ' کہلاتی تھی، پہنچ گئیں۔ انہوں نے اپنی محبت کی خاطر اپنے والدین کی دولت اور ثروت کو خیر باد کہہ دیا۔ محمد علی جناح کے لیے رتی پٹیٹ کا یہ اقدام اگرچہ پریشان کن تھا لیکن اس لمحہ محبتوں کی تند و تیز آندھی مصلحتوں اور اندیشوں کی گرد کو اڑا لے گئی اور محمد علی جناح اپنے چند دوستوں کے مشورہ سے رتی پٹیٹ کو بمبئی کی جامع مسجد لے گئے جہاں رتی نے ۱۸/اپریل ۱۹۱۸ء کو مولانا نذیر احمد خجندی کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا اور اگلے دن وہ شریعت مطاہرہ کے مطابق محمد علی جناح کے عقد میں آ گئیں۔ ان کا اسلامی نام 'مریم بائی' رکھا گیا جیسا کہ محمد علی جناح کے ایک رفیقِ قدیم سید شمس الحسن نے لکھا ہے لیکن وہ تمام عمر 'رتی' کے نام سے معروف رہیں۔ شادی کی اطلاع پر مسز سروجنی نائیڈو نے ڈاکٹر سید محمود کے نام ایک خط میں لکھا کہ "آخر کار جناح نے اپنی خواہش کا ارغوانی پھول توڑ لیا۔" رتی کو ارغوانی پھول سے تشبیہ دینا دراصل رتی کے حسن و جمال اور دلکشی کا اعتراف بھی تھا۔

محمد علی جناح اور رتی پٹیٹ کی شادی کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ خصوصاً بمبئی پریزیڈنسی میں جہاں پارسیوں کی اکثریت تھی اس اطلاع پر غم و غصہ کا اظہار بھی ہوا۔ محمد علی جناح اور رتی نے جن کے دل ایک دوسرے کی محبتوں سے لبریز تھے تمام چہ مگوئیوں اور حرف آرائیوں سے بے نیاز

رہتے ہوئے اپنی نئی زندگی کا قابلِ رشک انداز میں آغاز کر دیا۔ وہ شادی کے فوراً بعد ہی راجہ صاحب محمود آباد کے نینی تال میں واقع ریسٹ ہاؤس میں ہنی مون منانے چلے گئے۔ محمد علی جناح کے ایک پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سید کا بیان ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے ہنی مون منانے کے لیے نینی تال جاتے ہوئے لکھنؤ میں مہاراجہ محمد علی محمد خان آف محمود آباد کے گھر مختصر قیام کیا تھا اس وقت مہاراجہ کے صاحبزادے راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد کی عمر تقریباً ساڑھے چار سال تھی وہ رتی کی خوبصورتی اور دلنوازی کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت خوبصورت تھیں اتنی خوبصورت کہ ان پر کوہ قاف کی پریوں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ سنہرے کام کے سیاہ حاشیے کی سفید رنگ کی ساڑھی زیب تن کیے ہوئے تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنی جانب استعجابیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پایا تو بڑھ کر مجھے گود میں اٹھالیا اور قریب ہی ایک صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ ان کے وجود سے ایک دلفریب اور مسحور کن خوشبو آرہی تھی۔ ایسی خوشبو جو آج بھی میرے تنفس کا حصہ ہے۔ میں دیر تک ان کو پری تصور کیے ان کی گود میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد جب بھی میں ان سے ملا وہ مجھے پری ہی نظر آئیں۔ میں نے ان سے زیادہ خوبصورت، حسین اور ملیح خاتون آج تک نہیں دیکھیں۔ بیگم جہاں آراء شاہنواز کا کہنا ہے کہ رتی نہایت دلربا خاتون تھیں۔ ان کے ہاتھ اور سراپا نہایت حسین تھا اور وہ ہمیشہ نہایت قیمتی، دیدہ زیب اور نئے فیشن کی ساڑھی میں ملبوس رہتی تھیں۔ *Freedom At Midnight* کے مصنفین نے لکھا ہے کہ وہ نظارہ خیز حد تک خوبصورت خاتون تھیں۔ ایک ایسی خاتون جو اپنی افسانوی دلکشی اور خوبصورتی کی بنا پر مشہور تھیں۔ اسٹینلے والپرٹ لکھتا ہے کہ ''رتی کے لمبے سیاہ بالوں میں ہمہ وقت پھول گندھے رہتے تھے۔ ان کا متناسب اور گلاب سراپا کمخواب و اطلس میں چشم نظارہ باز کے لیے حیرتوں کا باعث تھا۔ آتشی سرخ، سنہرے، ارغوانی، نارنجی اور گلابی لباس ان کے حسن کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ وہ ماتھے پر ایک مخصوص

بینڈ باندھتی تھیں جس میں الماس، یاقوت اور زمرد جڑے ہوتے تھے۔ یہ تمام باتیں ان کی شخصیت کو نہ صرف مزید جاذب نظر بنا دیتی تھیں بلکہ بات بات پر ان کے نقرئی قہقہے دنیا کو ان کی دلکش موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

نینی تال سے واپسی کے بعد رتی نے جناح کے مکان کی از سر نو آرائش پر مکمل توجہ دی۔ رتی کی آمد سے قبل یہ مکان جناح کے تجرد کی تصویر تھا۔ انگلش وضع کے نہایت عمدہ فرنیچر، دبیز پردوں اور قیمتی آرائشی اشیاء کی موجودگی کے باوجود اس مکان کے در و دیوار سے ویرانی عیاں تھی۔ رتی کی آمد نے اس مکان کو جنت ارضی میں تبدیل کر دیا۔ جناح کے ایک برطانوی سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو نے لکھا ہے کہ جناح کے بے رونق اور اداس مکان میں گویا ایک چراغ روشن ہو گیا۔ رتی نے اپنی ذمہ داریوں کو صرف جناح کے مکان تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے عدالت کے احاطے میں جا کر جناح کے دفتر کو بھی نیا رنگ روپ دے دیا۔ رتی کی اس دلنواز شراکت نے محمد علی جناح کو رتی کا اس حد تک اسیر کر دیا تھا کہ اب وہ عدالت سے سیدھے گھر آتے اور لان میں بیٹھ کر گھنٹوں اپنی نوخیز شریکِ حیات سے گفتگو کرتے رہتے۔ جناح کے ایک دوست کانجی دوارکا داس نے لکھا ہے کہ شادی کے بعد جناح کی اپنی بیوی سے علیحدہ کوئی زندگی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ جناح نے اورینٹ کلب کی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا تھا جہاں وہ اکثر شطرنج اور بلیرڈ کھیلنے جایا کرتے تھے۔ رتی نے اپنے شوہر کی طرح ہندوستان کی عملی سیاست میں اگرچہ کبھی کوئی حصہ نہیں لیا لیکن ان کی زندگی میں ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی آزادی کی شدید خواہاں تھیں بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کی سیاسی بصیرت کی بھی حامل تھیں۔ جناح سے شادی کے بعد ان کے لبرل اندازِ فکر کو مزید جلا ملی کیونکہ اب وہ بہت قریب سے اپنے شوہر کے سیاسی تدبر، معاملہ فہمی، دوراندیشی اور حتمی فیصلوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ انگریزوں کو حاکم نہیں غاصب تصور کرتی تھیں اور جب کوئی

موقع آتا وہ انگریزوں کے خلاف اپنی نفرت کا بھرپور اظہار کرتی تھیں۔ رتی اور جناح کی شادی نے صرف رتی کے ہی اندازِ فکر میں تبدیلی پیدا نہیں کی تھی بلکہ محمد علی جناح بھی اب سیاسی معاملات میں اپنی مخصوص احتیاط پسندی کے ساتھ ساتھ جذباتی ردعمل کا اظہار کرنے لگے تھے۔

اپریل ۱۹۱۹ء کے آخری عشرے میں محمد علی جناح اپنی اہلیہ کے ہمراہ لندن گئے۔ اگرچہ ان کے دورہ کا مقصد سیاسی تھا لیکن رتی کی موجودگی کی بنا پر وہ اپنی سیاسی مصروفیت کے ختم ہونے کے بعد لندن میں ہی مقیم رہے۔ ان دنوں رتی امید سے تھیں اور جناح اپنا زیادہ تر وقت ان کے ہی ساتھ گزارا کرتے تھے۔ ۱۴راگست ۱۹۱۹ء کی شام کو جناح اپنی اہلیہ کے ساتھ تھیٹر گئے ہوئے تھے کہ ان کو بہت عجلت میں تھیٹر چھوڑنا پڑا کیونکہ رتی دردِ زہ میں مبتلا تھیں۔ اسی شب ان کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام دینا بائی رکھا گیا اور پیار سے اسے 'دینا' پکارا جانے لگا۔ اس بچی کے خدوخال اپنے والد سے اور آنکھیں و ہونٹ اپنی والدہ سے مشابہ تھے۔ دینا کی پیدائش رتی اور جناح کی محبت اور رفاقت میں ایک نئے باب کا اضافہ ثابت ہوئی۔ لندن کی خنک اور کہر آلود فضا میں وہ دونوں اپنی بچی کے ساتھ نومبر ۱۹۱۹ء کے وسط تک مقیم رہے اور پھر ہندوستان لوٹ آئے جہاں سیاسی گہما گہمی ان کی منتظر تھی۔

رتی جناح اپنے دور کی خواتین میں جہاں اپنی دیگر صفات کی بنا پر نمایاں تھیں۔ وہاں ان کی شخصیت کا ایک پہلو ان کی حاضر جوابی، خوش خلقی اور خوش گفتاری بھی تھا۔ دورانِ گفتگو وہ لطافت اور بذلہ سنجی کے دریا بہا دیتی تھیں۔ ان کے سامنے گفتگو کرنا آسان کام نہ تھا۔ رتی جناح کی اس خصوصیت کا قائداعظم محمد علی جناح کے تقریباً سب سوانح نگاروں نے نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ متعدد واقعات بھی درج کیے ہیں۔ اجلاس ناگپور دسمبر ۱۹۲۰ء میں محمد علی جناح نے انڈین نیشنل کانگریس سے ہی نہیں بلکہ کسی حد تک سیاست سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ وہ کانگریسی رہنماؤں

اور خصوصاً موہن داس کرم چند گاندھی کی سیاسی روش سے بہت دلبر داشتہ تھے کیونکہ وہ غیر آئینی اور تخریبی کارروائیوں کے شدید مخالف تھے۔ سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی کے بعد محمد علی جناح دو مرتبہ اپنی اہلیہ کے ساتھ انگلستان گئے تاکہ وہ اپنی نوعمر صاحبزادی کی بہتر طور پر پرورش کرسکیں۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں محمد علی جناح ایک مرتبہ پھر قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے اور ان کی سیاسی سرگرمیاں بحال ہونے لگیں۔ رتی نے اس نئی سیاسی صورتِ حال میں اپنے شوہر کا ہر قدم پر ساتھ دیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اسمبلی کا سیشن دیکھنے جاتی تھیں لیکن جناح کی نئی سیاسی سرگرمیاں ہی اس خوشحال جوڑے کی فکری ہم آہنگی میں مخل ہوئیں۔ جناح اب رتی کو اس قدر وقت نہیں دے پاتے تھے جتنا کہ وہ ابتداً دیا کرتے تھے۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگے اور یہ اختلافات اس قدر طول پکڑ گئے کہ جناح کی ماؤنٹ پلیزنٹ کی کوٹھی سے رہائش ترک کرکے رتی بمبئی کے ہوٹل تاج محل میں منتقل ہوگئیں۔ ان دنوں رتی کی صحت بھی کافی گرگئی تھی۔ وہ مسلسل بے خوابی اور اضطراب کا شکار رہنے لگیں۔ اعصابی تھکن نے ان کے مزاج میں غصہ اور چڑچڑاہٹ پیدا کردی تھی۔ تاج محل ہوٹل میں رہائش کے دوران رتی کی صحت مزید گرنے لگی حتیٰ کہ ان پر غشی کے دورے پڑنے لگے مگر وہ ہوٹل میں ہی مقیم رہیں۔ اس دوران کئی مرتبہ خود محمد علی جناح اور ان کے مشترکہ دوستوں نے اس علیحدگی کو ختم کرانے کی کوشش کی مگر کوئی کوشش سودمند ثابت نہیں ہوئی۔ یہ اپریل ۱۹۲۸ء کی بات ہے جب رتی بغرضِ علاج پیرس روانہ ہوگئیں۔ محمد علی جناح بھی مئی ۱۹۲۸ء میں لندن چلے گئے۔ اس سفر میں جناح کے ہمراہ ان کے دوست دیوان چمن لال بھی تھے جو ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جنیوا جارہے تھے۔ دیوان چمن لال جنیوا سے واپسی پر جب پیرس پہنچے تو ان کو اطلاع ملی کہ رتی چیمس ایلسی کلینک میں داخل ہیں اور تقریباً بسترِ مرگ پر ہیں۔ دیوان چمن لال نے اس صورت حال کی لندن میں محمد علی جناح کو ٹیلی فون پر اطلاع

دی چنانچہ جناح فوری طور پر پیرس پہنچ گئے۔ رتی تقریباً ایک ماہ پیرس میں زیر علاج رہیں۔ اس دوران جناح نہ صرف رتی کے پاس نرسنگ ہوم میں رہے بلکہ انہوں نے رتی کی مکمل دیکھ بھال اور تیارداری بھی کی۔ کانجی دوار کا داس نے لکھا ہے کہ ''جناح نرسنگ ہوم میں وہی کچھ کھاتے تھے جو رتی کھاتی تھیں۔''

پیرس میں ایک ماہ زیر علاج رہنے کے بعد رتی بمبئی لوٹ گئیں اور جناح پیرس میں ہی مقیم رہے۔ دیوان چمن لال نے لکھا ہے کہ میرا خیال تھا کہ اب رتی اور جناح کے درمیان اختلافات ختم ہو گئے ہوں گے لیکن جناح کو پیرس میں تنہا پا کر میں نے جب رتی کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے نہایت قطعیت کے ساتھ جواب دیا ''ہماری لڑائی ہو گئی اور وہ بمبئی چلی گئی۔'' لیکن ان اختلافات کے باوجود ان کی ایک دوسرے سے محبت میں فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے دل ایک دوسرے کے لیے دھڑکتے تھے جیسا کہ اکتوبر ۱۹۲۸ء کے ایک خط سے ظاہر ہے جو رتی نے پیرس سے بمبئی واپس جاتے ہوئے ایس ایس راجپوتانہ نامی بحری جہاز سے جناح کے نام لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ڈارلنگ۔۔۔ تم نے جو کچھ بھی کیا اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اگر میرے رویہ میں تمہارے احساس بے پایاں نے کوئی بے التفاتی یا کم مائیگی پائی ہو تو بھی میرے محبوب یقین جانو کہ میرا دل صرف گداز اور درد بے کراں کا ہی مسکن تھا۔ میرے محبوب یہ وہ درد تھا جو آزار سے پاک تھا۔ جان عزیز! ویسے بھی جب بھی کوئی شخص زندگی کی حقیقت (جو بہر حال موت ہے) سے اتنا مانوس ہو جائے جیسا کہ میں ہو چکی ہوں تو پھر اس کے لیے زندگی کے خوشگوار اور دل آویز لمحات کی یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں اور سب کچھ عدم حقیقت کی دھند میں لپٹ کر نیم پوشیدہ

ہو جاتا ہے۔ اس لیے میرے محبوب تم مجھے اس پھول کی طرح یاد کرنے کی کوشش کرو جسے تم نے شاخ گل سے چنا ہو۔ اس پھول کی طرح نہیں جسے تم نے روند ڈالا ہو۔ جان من! میں نے زیادہ دکھ شاید اس لیے اٹھائے ہیں کہ میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور میں نے اتنی ہی شدید اذیت برداشت کی ہے جتنی شدید میری محبت ہے۔ میرے محبوب مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔ ایسی محبت جو محبت کے مستحق چند ہی لوگوں کو میسر آتی ہے۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ہمارا المیہ جو محبت سے شروع ہوا تھا وہ محبت کے ساتھ ہی انجام کو بھی پہنچے۔

محمد علی جناح ۲۶ راکتوبر ۱۹۲۸ء کو رزمک نامی جہاز سے بمبئی واپس پہنچے اور تاج محل ہوٹل میں مقیم رتی کو دیکھنے گئے۔ پھر انہوں نے اپنا معمول بنالیا وہ روزانہ شام کو رتی سے ملنے جاتے اور گھنٹوں پرانے دنوں کی باتیں کرتے رہتے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کے درمیان موجود اختلافات کی خلیج پٹ رہی تھی لیکن رتی کی زندگی کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ ان کی صحت بالکل گر گئی تھی اور بسا اوقات غشی کے شدید دورے پڑنے لگے تھے۔ اسی دوران محمد علی جناح کو اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی جانا پڑا جو ۲۸ جنوری کو شروع ہونے والا تھا۔ نتیجہ یہ کہ رتی ایک مرتبہ پھر تنہا ہو گئیں اور یہ تنہائی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ بار بار بے ہوش ہونے لگیں۔ ۱۹ر فروری ۱۹۲۹ء کو ان پر بے ہوشی کا شدید دورہ پڑا اور اِس بے ہوشی نے اس قدر طول پکڑا کہ وہ اپنی انتیسویں سالگرہ والے دن یعنی ۲۰ فروری کی شام کو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اس حادثہ کی اطلاع ٹیلی فون پر محمد علی جناح کو دی گئی وہ فوری طور پر بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۲۲ فروری کی صبح محمد علی جناح غمزدہ اور دلگرفتہ بمبئی پہنچے تو رتی کی میت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ قبرستان میں دیر تک رتی کی

میت کے پاس خاموش بیٹھے رہے لیکن جس وقت رتی کی میت قبر میں اتاری جانے لگی صبر وتحمل کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ سب سے قریب ترین رشتہ دار ہونے کی بنا پر انہوں نے سب سے پہلے قبر پر مٹی ڈالی اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگے۔ کانجی دوار کا داس نے تدفین کے اگلے دن محمد علی جناح سے اپنی ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''میں نے ایسا غمزدہ اور ایسا اداس شخص پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ محمد علی جناح نے دو گھنٹے کی ملاقات کے دوران مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ میں صبر وتحمل اور ہمدردی کے ساتھ ان کی گفتگو سنتا رہا۔ البتہ کبھی کبھی ایک آدھ لفظ کہہ دیا کرتا تھا لیکن دوران گفتگو میں نے محسوس کر لیا کہ جناح نے رتی کے انتقال کے دکھ کو اپنے قلب میں تصویر کر لیا ہے۔۔۔اور پھر وہ اپنی زندگی کے اختتام تک اس صدمے سے بحال نہیں ہو سکے۔

قائداعظم کی صاحبزادی دیناواڈیا

قائداعظم محمد علی جناح کی اہلیہ رتی جناح کے انتقال کے وقت اُن کی اکلوتی صاحبزادی دینا کی عمر ۹ سال چار ماہ اور چھ دن تھی۔ وہ بمبئی کے ایک کانوینٹ اسکول میں زیرِ تعلیم تھیں لہٰذا رتی کے انتقال کے بعد دینا کی پرورش کی تمام تر ذمہ داریاں محمد علی جناح کے ذمہ آ گئیں اور انہوں نے اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود ان ذمہ داریوں کو بخوبی پورا کیا۔ دینا کی پیدائش (۱۴/اگست ۱۹۱۹ء) کے بعد رتی اور جناح نومبر ۱۹۱۹ء کے وسط تک لندن میں مقیم رہے، یعنی تقریباً ڈھائی ماہ۔ پھر وہ ہندوستان واپس آ گئے اور آئندہ دو سال تک دینا کی دیکھ بھال، نگرانی اور اُس کی دلجوئی میں بسر کیے۔ دو سال کی عمر میں ہی دینا کی دیکھ بھال کے لیے جناح نے ایک مسٹریس کا انتظام کر دیا تھا جو دینا کو تعلیم بھی دیا کرتی تھی۔ دینا نے چھ سال کی عمر تک گھر پر ہی تعلیم حاصل کی لیکن جب وہ چھ سال کی ہو گئیں تو دینا کے اسکول میں داخلے کے حوالے سے 'رتی جناح' نے اپنے احباب سے مشورے شروع کر دیے۔

ابتدائی طور پر جن تعلیمی اداروں کے بارے میں انہوں نے غور کیا ان میں لڑکیوں کے لیے 'اڈیار' مدراس میں قائم تھیوسوفیکل اسکول بھی تھا۔ رتی نے اس سلسلے میں سماجی کارکن مسز ڈورتھی جینا راجاداس سے بذریعہ خط درخواست کی کہ اس اسکول کے بارے میں معلومات ارسال کریں تا کہ وہ اپنی بیٹی دینا کو مدراس بھیج سکیں۔ مسز ڈورتھی نے اس ضمن میں ۲۹/اگست ۱۹۲۵ء کو رتی اور جناح کے مشترکہ دوست کانجی

دوارکاداس کوایک خط میں لکھا 'میں اُمید کرتی ہوں کہ مسز جناح اپنی بیٹی کواسکول ضرور بھیجیں گی۔ میں جس کے بارے میں پریقین ہوں کہ وہ نہایت ذہین ہوگی اور یہ فیصلہ اس کی بہتر تعلیم کے حصول میں بہت اہمیت کا حامل ہوگا۔' ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۵ءکوایک مرتبہ پھر مسز ڈورتھی نے کانجی دوارکاداس کولکھا کہ 'مجھے اُمید ہے کہ اسکول کے بارے میں آپ کواطمینان بخش جواب مل گیا ہوگا اور یہ مسز جناح کی بیٹی کے لیے بہت بہتر ہوگا کہ وہ اس اسکول میں تعلیم حاصل کرے۔'

دینانے ابتدائی تعلیم بمبئی کے ایک کانوینٹ اسکول میں حاصل کی۔ دینا اپنی والدہ کے انتقال کے بعداگرچہ بیشتر وقت اپنی نانی کے پاس رہتی تھیں اس کے باوجود محمد علی جناح نے دینا کی پرورش اور دیکھ بھال کے لیے ایک گورنیس کوملازم رکھا تھا جس کا نام اسٹیلا تھا۔ وہ بمبئی کی رہنے والی کیتھولک تھی۔ محمد علی جناح کی پیشہ ورانہ اور سیاسی مصروفیات کی بنا پران کودینا کے ساتھ رہنے کے بہت کم مواقع ملتے تھے۔ لیکن اس کے باوجوددینااپنے والدین سے شدید محبت کرتی تھیں اوران کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے والدین کے پاس ہی رہیں۔ وہ ہرسال گرمیوں میں اپنے والدین کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کشمیر جاتی تھیں، جبکہ دومرتبہ وہ اپنے والدین کے ہمراہ لندن بھی گئیں۔

کم عمری میں ماں کی شفقت سے محرومی دینا کے لیے بڑی جانگسل تھی لیکن جناح کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ دینا کی ہرطرح دلجوئی کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے جہاں انہوں نے اس کی تفریح طبع کے لیے گھر میں بہت سے انتظامات کرر کھے تھے وہاں اس کواپنے ساتھ لے کرشاپنگ کرانے بھی جاتے تھے۔ یہی نہیں ۱۹۳۰ء کے اواخر میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جاتے ہوئے وہ اپنی بہن فاطمہ جناح اور دینا کو بھی ساتھ لے گئے اورلندن پہنچ کر دینا کوایک اسکول میں داخل کرادیا۔ لندن میں مستقل رہائش کے لیے جناح نے ہیمسٹیڈ میں ویسٹ ہیتھ روڈ پر

ایک مکان خرید لیا تھا۔ اس مکان کی خریداری کا احوال ہیکٹر بولیتھو نے اپنی کتاب Jinnah: Creator of Pakistan میں بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ 'جون ۱۹۳۱ء میں ایک دن جناح ہیمسٹیڈ کے علاقے میں بغرض تفریح چہل قدمی کر رہے تھے کہ ویسٹ ہیتھ روڈ پر ایک مکان کے سامنے ٹھہر گئے اور وہ انہیں پسند آ گیا۔ اس سہ منزلہ کوٹھی میں بہت سے کمرے اور چھتر تھے اور ایک اونچا مینار تھا۔ جس سے گردونواح کے علاقے کا منظر خوب دکھائی دیتا تھا۔ مکان کے ساتھ ایک دربان خانہ، گاڑیوں کے لیے ایک سڑک اور آٹھ ایکڑ کا باغ اور چراگاہ بھی تھی۔ مکان کی وضع میں وہی بے ترتیبی تھی جو عام طور پر انیسویں صدی کے آخری حصے کے مکانوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کوٹھی اور اس کے احاطے کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ ان کی جگہ اب بارہ نئے طرز کے چھوٹے مکانوں نے لے لی ہے اور ان کے قریب ہی لیڈی گراہم وڈ رہتی ہیں، جن سے ۱۹۳۱ء میں جناح نے ان کی کوٹھی خریدی تھی۔ جناح اب تک ان کو اچھی طرح یاد ہیں۔ لیڈی گراہم کا کہنا ہے کہ جب پہلی مرتبہ جناح ان سے ملنے آئے تو وہ نہایت خوش خلق، وضعدار اور انتہائی دلکش شخصیت کے مالک تھے، لیڈی گراہم سے مکان کی خریداری کے بعد جناح نے ان سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ وہ اچھا سا اسکول تجویز کریں جہاں وہ اپنی بیٹی کو داخل کرا سکیں۔

محمد علی جناح لندن میں اپنی بہن فاطمہ جناح اور بیٹی دینا کے ساتھ نہایت سکون کی زندگی گزار رہے تھے، اگرچہ وہ پورا ہفتہ اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے لیکن سنیچر اور اتوار کو مکمل سیر و تفریح کرتے۔ ان دنوں جناح کی زندگی کسی رئیس سے کم نہ تھی۔ میرٹھ کے ایک رہنما نواب محمد یامین خاں نے ۶ راگست ۱۹۳۳ء کو لندن میں جناح سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب 'نامہ اعمال' میں لکھا ہے کہ 'میں مسٹر محمد علی جناح سے ملنے ویسٹ ہیتھ ہاؤس ہمیسٹیڈ گیا۔ جہاں محمد علی جناح گزشتہ دو سال سے مقیم ہیں۔ یہ ایک نہایت عمدہ بنگلہ ایک ٹیلے پر بنا ہوا ہے جس

کا احاطہ بڑا اور باغ خوبصورت ہے۔ اس ٹیلے پر یہ تنہا ایک بنگلہ ہے۔ میں نے دروازے پر لگی بجلی کی گھنٹی بجائی تو ایک ویٹرس آئی اور چاندی کی کشتی میں میرا کارڈ لے گئی اور پھر بلانے آئی۔ مسٹر جناح اور مس فاطمہ جناح باغ میں گھاس پر بید کے مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت دیر حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہوئیں۔'

ہیکٹر بولیتھو نے لکھا ہے کہ 'اسی زمانے میں محمد علی جناح نے مصطفی کمال پاشا کی مشہور سوانح عمری ''گرے وولف'' نہایت دلچسپی کے ساتھ نہ صرف خود پڑھی بلکہ اپنی بیٹی دینا کو بھی پڑھنے کے لیے دی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد وہ کئی دن تک برابر مصطفی کمال اتاترک کا تذکرہ کرتے رہے۔ اس بات پر انہیں دینا کے طنزیہ فقرے بھی سننے پڑے بلکہ دینا اکثر ان کو ''گرے وولف'' کے لقب سے پکارا کرتی تھیں۔'

ہیکٹر بولیتھو نے مزید لکھا ہے کہ 'دینا ان دنوں چھٹیاں گزارنے اسکول سے گھر آئی ہوئی تھیں اور باپ بیٹی ایک دوسرے کی صحبت میں بہت خوش تھے۔ صرف دینا ہی محمد علی جناح سے چھیڑ خانی کر سکتی تھیں ورنہ وہ ساری عمر اس قسم کی چھیڑ خانیوں سے محروم رہے۔ باپ کے ہاتھوں کی طرح دینا کے ہاتھ بھی سبک اور حسین تھے اور دورانِ گفتگو وہ بڑے پرمعنی انداز میں حرکت کرتے تھے۔ کبھی کبھی دینا یہی نازک ہاتھ جناح کی طرف بڑھاتی اور مقدمے کی فائل ان کے ہاتھوں سے چھین کر کہتی ''گرے وولف''، چلیں مجھے پینٹو مائم (تفریح کا ایک مرکز) دکھلائیں۔ آخر میں بھی تو چھٹیاں منانے یہاں آئی ہوئی ہوں۔' محمد علی جناح اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اس کی خوشنودی کی خاطر ہمہ وقت ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ وہ اکثر دینا کے اسکول جاتے اور اس کے اخراجات کے بل اپنی کفایت شعار طبیعت کے برخلاف بغیر کسی تردد اور چھان بین کے فوری طور پر ادا کرتے تھے۔

جنوری ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی درخواست پر محمد علی جناح خود عائد کردہ جلا وطنی ترک کر کے لندن سے ہندوستان واپس آئے تو دینا اور فاطمہ جناح دونوں لندن ہی میں مقیم تھیں۔ ہندوستان پہنچ کر انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت سنبھال لی اور اس کی تنظیمِ نو کی جانب متوجہ ہوئے، مگر اس ضمن میں وہ کوئی خاص کامیابی ابھی حاصل نہیں کر پائے تھے کہ ۲۴ مئی ۱۹۳۴ء کو ایک مرتبہ پھر ان کو لندن جانا پڑا۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنا مکان جو ہیمسٹیڈ میں تھا، فروخت کر دیا اور محترمہ فاطمہ جناح کو ساتھ لے کر جنوری ۱۹۳۵ء میں ہندوستان واپس آ گئے۔ انہوں نے دینا کو ہاسٹل میں داخل کرا دیا تا کہ وہ ولنگڈن سسکس میں واقع اپنے اسکول میں تعلیم کو جاری رکھ سکے۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں جناح دوبارہ لندن گئے اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اس عرصے میں دینا اُن سے ملاقات کے لیے آتی رہیں، خصوصاً چھٹی والے دن وہ اپنے والد کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب جناح ہندوستان واپس آئے تو دینا جناح لندن میں ہی مقیم رہیں کیونکہ اُن کی تعلیم جاری تھی۔ ہندوستان واپسی کے بعد محمد علی جناح کی مصروفیات میں بے حد اضافہ ہو گیا اور وہ دینا سے ملاقات کے لیے لندن نہیں جا سکے، البتہ دینا کے اخراجات کی تفصیلات اُن کے اسکول کی پرنسپل فرانسس براؤن پابندی کے ساتھ اُن کو ارسال کرتی رہیں۔

قائداعظم پیپرز میں موجود ایک دستاویز کے مطابق ۳۰ جنوری ۱۹۳۶ء کو دینا کے اخراجات کی جو تفصیلات فرانسس براؤن نے جناح کو ارسال کیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ دینا نے دسمبر ۱۹۳۵ء میں ایک ہفتے کی تعطیلات لندن میں گزاریں اور اس دوران انہوں نے لندن کے نہ صرف مہنگے ترین ہوٹلوں میں قیام کیا بلکہ روزانہ لنچ اور ڈنر بہترین ریسٹورنٹ میں کیا کرتی تھیں اور بلا ناغہ کسی تھیٹر یا سینما ہاؤس کی اعلیٰ ترین کلاس کا ٹکٹ خرید کر شو دیکھا کرتی تھیں۔ قائداعظم یہ تمام اخراجات بلا کسی تردد کے ادا کر دیا کرتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق دینا جناح اگست ۱۹۳۶ء میں لندن

سے بمبئی واپس آ گئیں اور اپنے والد کے مکان ساؤتھ کورٹ مالا بار ہلز میں رہائش اختیار کی۔ اس مکان میں محترمہ فاطمہ جناح پہلے سے ہی اپنے بھائی کے ساتھ مقیم تھیں۔

۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو سسکس کاؤنٹی میں واقع دینا کے اسکول کی پرنسپل فرانسس براؤن نے محمد علی جناح کو ایک خط میں مطلع کیا کہ 'میری خرابیٔ صحت، ممکنہ آپریشن اور مالی وجوہات کی بنا پر مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ میں شاید آئندہ ٹرم میں اسکول کو جاری نہ رکھوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی اور کی نگرانی میں اسکول کو جاری رکھوں لیکن مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اس لیے گزشتہ روز میں نے شدید افسوس کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسکول کو بند کر دیا جائے۔ میں نے ہیون کرافٹ، ایسٹ بورنی کی مس ویسٹ کے ساتھ یہ انتظام کیا ہے کہ وہ میرے اُن طالب علموں کو جو اس انتظام کی منظوری دیں اپنے یہاں داخل کر لیں، لیکن مجھے اچھی طرح علم ہے کہ آپ اس منصوبے کو دینا کے لیے مناسب تصور نہیں کریں گے۔ کیا آپ یہ خبر دینا کو دیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ خبر اُسے میری طرح پریشان کر دے گی کیونکہ وہ اپنے اسکول سے بہت محبت کرتی ہے۔ میں دینا کے لیے بھی ایک خط منسلک کر رہی ہوں، اگر آپ مناسب تصور کریں تو وہ اسے دے دیں۔ میرے پاس اسکول کے امتحانات کے نتائج موجود ہیں اور میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کر رہی ہوں کہ دینا امتحانات میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اُس نے تاریخ اور مضمون نویسی میں بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے لیکن فرانسیسی زبان، حساب اور بوٹنی (نباتیات) میں وہ کمزور ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ دینا اپنے نتائج سے زیادہ دلبرداشتہ نہیں ہو گی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ دینا جس مدت میں میرے ساتھ رہی اُس کے اندر خود اعتمادی اور اعتدال و توازن میں اضافہ ہوا جو شاید زیادہ کارآمد ہے۔'

لندن سے واپس آنے کے بعد دینا کا زیادہ تر وقت اپنے والد اور پھوپھی

فاطمہ جناح کے ساتھ یا پھر اپنے ننھیال میں گزرتا تھا۔ دینا کی لندن سے واپسی کے بعد ایک مرتبہ پھر جناح کے مکان میں رونق لوٹ آئی۔ جہاں ایک طرف سیاسی رہنماؤں کی آمدورفت میں اضافہ ہوا وہاں محمد علی جناح کی نجی زندگی میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی واقع ہوئی اور اس تبدیلی کا تمام تر انحصار دینا کے وجود سے مشروط تھا جو نہ صرف محمد علی جناح سے اپنی تمام ضدیں پوری کراتی تھیں بلکہ اپنی سیر وتفریح میں بھی ان کو شریک رکھتی تھیں۔ ایک لحاظ سے جناح کی زندگی میں یہ بڑے خوشگوار دن تھے۔ محمد علی جناح کے ایک سابقہ ڈرائیور سید عبدالحیٔ نے مجھے ذاتی طور پر ایک ملاقات میں بتایا کہ ’دینا جناح ایک شوخ اور چنچل لڑکی تھیں۔ میں جب ملازم ہوا تو ان کی عمر تقریباً چودہ یا پندرہ سال تھی۔ لیکن وہ اپنے والد سے اس وقت بھی بچوں کی طرح ضد کرتی تھیں اور محمد علی جناح ان کی ہر ضد پوری کر دیا کرتے تھے۔ مزاجاً دینا جناح نہایت نفاست پسند، ظریف الطبع اور انسان دوست تھیں۔ اس زمانے میں جناح کے بنگلے پر تقریباً بائیس ملازم تھے، دینا جناح کے سامنے جو ملازم پڑتا تھا وہ اس سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتی تھیں۔ مجھ سے وہ زیادہ مانوس تھیں کیونکہ میں اکثر شام کو ان کو سیر وتفریح اور شاپنگ کرانے لے جاتا تھا۔ دینا جن کو تمام ملازمین ”دینا بابا“ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اپنی پھوپھی محترمہ فاطمہ جناح سے چھپ کر ملازمین کو نہ صرف پیسے دیتی رہتی تھیں بلکہ فاضل اوقات میں ملازمین کے ساتھ خوش گپیاں بھی کرتی تھیں۔ محمد علی جناح کے پاس اس وقت پانچ گاڑیاں تھیں۔ ان تمام گاڑیوں کی نگرانی میرے ذمے تھی۔ دینا جناح کو کار چلانے کا بہت شوق تھا۔ جناح صاحب مجھے منع کرتے تھے کہ دینا کو کار چلانے کے لیے مت دیا کرو، مگر دینا اکثر مجھ سے ضد کر کے کار لے لیتی تھیں اور بمبئی کے مضافات میں کشادہ سڑکوں پر بہت تیز ڈرائیونگ کیا کرتی تھیں۔ وہ میرے ساتھ اکثر منگل داس مارکیٹ اور کرافورڈ مارکیٹ خریداری کے لیے جاتیں اور گھنٹوں دکانوں دکانوں گھومتی رہتی تھیں۔ ان کو موسیقی اور

عمدہ کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ جب ہم خریداری کر کے لوٹتے تو محترمہ فاطمہ جناح مجھ سے تنہائی میں دینا کے بارے میں دریافت کرتی تھیں کہ وہ کہاں گئی تھیں اور انہوں نے کیا خریدا۔ قائداعظم بھی مجھ سے اکثر پوچھتے تھے کہ کیا دینا نے کار چلائی تھی مگر میں ہمیشہ جھوٹ بول دیا کرتا تھا۔ دینا اپنی نانی لیڈی پٹیٹ کے گھر بھی جاتی تھیں اور کبھی کبھی وہاں پر ہی رہ جایا کرتی تھیں۔'

ساؤتھ کورٹ میں دینا کے لیے محمد علی جناح کے علاوہ کوئی اضافی دلچسپی نہ تھی۔ پھر جب آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کا آغاز ہوا تو جناح کی مصروفیات میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ وہ کئی کئی ماہ بمبئی سے باہر رہنے لگے۔ ایسی صورت میں وہ دینا جناح کو زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے۔ چنانچہ دینا جناح کا بیشتر وقت اپنی نانی کے گھر پر گزرنے لگا۔ محمد علی جناح کی رتی سے شادی کا زخم کسی نہ کسی صورت میں ابھی تک پارسی فرقے کے سینے میں ہرا تھا۔ رتی کی زندگی میں بھی اور ان کے انتقال کے بعد بھی پارسی محمد علی جناح کی جانب سے متنفر رہتے تھے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ جناح کی ازدواجی زندگی کو تباہ و برباد کر دیں۔ لیکن ان کے ہاتھ کبھی کوئی ایسا موقع نہ آیا کہ وہ اپنی اس مذموم خواہش کو عملی جامہ پہنا سکتے۔ محمد علی جناح کی بڑھتی ہوئی سیاسی سرگرمیوں اور دینا سے ان کی دوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس فرقے کے چند افراد نے جن میں رتی کی والدہ لیڈی پٹیٹ بھی شامل تھیں، دینا جناح کی شادی کا فیصلہ پارسی نژاد ایک امیر و کبیر نوجوان نیولی واڈیا سے کر دیا جو پارسی مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول کر چکا تھا۔ واضح رہے کہ نیولی واڈیا کے والد نیس واڈیا پارسی اور والدہ عیسائی تھیں۔ نیولی لیورپول، انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ اُس نے مالورن کالج اور ٹرینیٹی کالج کیمبرج میں تعلیم پائی۔ اُس کے والد ہندوستانی ٹیکسٹائل انڈسٹری کے اہم اور معروف صنعت کار تھے۔ محمد علی جناح کے لیے یہ صورتِ حال نہایت تشویشناک اور پریشان کن تھی، کیونکہ جب یہ رشتہ طے ہوا تو وہ مسلم ہند کے 'قائداعظم' کے منصب پر

فائز تھے۔ مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والے قائداعظم محمد علی جناح نے اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے مزاحمت کی لیکن دینا نے ایک سرکش اور خودسر لڑکی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے والد کے ہر مشورے کو نظر انداز کر دیا۔

دینا واڈیا کی شادی کا تذکرہ کرتے ہوئے رئیس احمد جعفری نے جو مولانا شوکت علی کے رفیقِ خاص تھے، اپنی کتاب 'قائداعظم اور اُن کا عہد' میں لکھا ہے کہ جب دینا جناح نے نیولی واڈیا سے شادی کا فیصلہ کر لیا تو قائداعظم نے مولانا شوکت علی کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ دینا سے ملاقات کر کے اسے اسلامی تعلیمات سے آگاہ کریں لیکن نہ مولانا شوکت علی اسے راہِ راست پر لا سکے اور نہ باپ کی افہام و تفہیم کا کچھ نتیجہ نکلا۔ نیولی واڈیا کے مذہب کے بارے میں عموماً ایک غلط فہمی عام تھی اور وہ اُس کے پارسی نژاد ہونے کی وجہ سے تھی اگرچہ وہ پارسی مذہب ترک کر کے عیسائی مذہب قبول کر چکا تھا لہٰذا دینا نے ایک عیسائی سے شادی کی تھی پارسی سے نہیں۔ میسور سے تعلق رکھنے والے ایک مصنف امتیازہ نے بھی اپنی کتاب The Mind of Muslim India میں دینا کی شادی ایک پارسی سے ظاہر کی تھی لہٰذا قائداعظم نے ۵ دسمبر ۱۹۴۵ء کو مصنف کے نام اپنے ایک خط میں اس بات کی تردید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 'دینا نے کسی پارسی سے نہیں بلکہ ایک عیسائی سے شادی کی ہے۔' قائداعظم کے ایک اور ڈرائیور محمد حنیف آزاد نے بھی دینا کی شادی کے بارے میں قائداعظم کے جذبات بیان کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو سے کہا تھا کہ صاحب کو اس کا بہت صدمہ تھا، ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرے خواہ وہ کسی بھی رنگ و نسل کا ہو لیکن ان کی لڑکی جواز پیش کرتی تھی کہ جب صاحب کو اپنی شریک زندگی منتخب کرنے میں آزادی حاصل تھی تو وہ یہ آزادی اسے کیوں نہیں دیتے۔ سعادت حسن منٹو نے محمد حنیف آزاد سے سوال کیا تھا کہ کیا قائداعظم کی لڑکی کا 'پارسی' لڑکے سے شادی کرنا ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ تو آزاد

نے کہا کہ اللہ بہتر جانتا ہے لیکن مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ صاحب کی زندگی میں اپنی بیوی کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ منٹو نے اپنی کتاب 'گنجے فرشتے' میں لکھا ہے کہ دینا کی شادی پر وہ بہت مضطرب رہے۔ پندرہ دن تک وہ کسی سے نہ ملے۔

ڈپارٹمنٹ آف نیشنل آرکائیوز کے سابق ڈائریکٹر جنرل عتیق ظفر شیخ نے اپنے ایک مضمون میں معروف صحافی 'م ش' کی ڈائری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ دینا نے ایک انٹرویو میں کہا کہ 'میرے والد نے مجھ سے کہا اگر تم نے ایک غیر مسلم سے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے تو میرے اور تمہارے درمیان تعلقات برقرار نہیں رہیں گے۔ اسلام خونی رشتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر تم نے ایک غیر مسلم سے شادی کرلی تو پھر شریعت کی رُو سے تم مسلمان نہیں رہو گی۔ انہوں نے اپنی بیٹی سے نہایت جذباتی انداز میں کہا کاش میں تم کو اس فیصلے سے روک سکتا۔ کاش تم میرے محسوسات کو جان سکتیں۔ ایک باپ کے محسوسات کو جس کی صرف ایک ہی بیٹی ہے لیکن میں خود کو اسلامی قوانین کے سامنے مجبور پاتا ہوں۔ قائداعظم یہ کہتے ہوئے آہستگی سے اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ جبکہ ان کی بیٹی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔'

فضلِ حق قریشی نے اپنی کتاب Every *Day with the Quaid-i-Azam* میں لکھا ہے کہ دینا واڈیا نے ۲۳/اپریل ۱۹۷۰ء کو *Pakistan Times* لاہور کے ایک نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ 'بانی پاکستان نے اسلامی اصولوں کی پاسداری میں اپنے قریب ترین اور عزیز ترین تعلقات کو ترک کردیا۔ انہوں نے اپنے مذہب کے تقدس کی خاطر اپنے خونی رشتوں سے بھی لاتعلقی اختیار کرلی۔ میرے والد عظمت کی علامت تھے۔ ایسی عظمت جس کا الفاظ میں احاطہ کرنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ دینا نے نمناک آنکھوں، گلوگیر آواز اور نہایت جذباتی انداز میں نامہ نگار سے کہا کہ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے

تھے لیکن جب میں نے ایک غیر مسلم سے شادی کا فیصلہ کیا تو ان کو مجھ سے تعلق ختم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔'

قائداعظم نے شادی کے فیصلے کے بعد دینا جناح سے بڑی حد تک اپنے مراسم ترک کر دیئے تھے، کیونکہ وہ دینا کی نیولی واڈیا سے شادی کے فیصلے کے خلاف تھے، ویسے بھی یہ شادی ان کے لیے ایک تازیانے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے انہوں نے دینا سے ملاقات کے لیے لیڈی پٹیٹ کے گھر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ صرف کبھی کبھی پدرانہ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اپنے ڈرائیور عبدالحیٔ کے ذریعے دینا کی خیریت منگوالیا کرتے تھے۔ ۱۵؍نومبر ۱۹۳۸ء کو دینا کی نیولی واڈیا سے مسیحی رسم ورواج کے مطابق شادی ہوئی۔ قائداعظم اس وقت شدید بیمار تھے، اگرچہ وہ دینا سے کسی حد تک لاتعلق تھے لیکن اس موقع پر ان سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے اپنے ڈرائیور عبدالحیٔ کو پھولوں کا ایک گلدستہ دے کر شادی کی تقریب میں بھیجا۔ عبدالحیٔ کا بیان ہے کہ:

> یہ شادی لٹل گبز روڈ کے عقب میں واقع چرچ میں نہایت سادگی سے ہوئی تھی۔ مہمانوں میں سرڈنشا پٹیٹ اور واڈیا فیملی کے نہایت مختصر سے لوگ شامل تھے۔ دینا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد چرچ سے ایک سیاہ رنگ کی پیکارڈ کار میں کوآرڈن روڈ پر واقع واڈیا فیملی کے بنگلے پر چلی گئیں۔

دینا کی نیولی واڈیا سے شادی اگرچہ قائداعظم کے لیے شدید صدمے کا باعث تھی لیکن انہوں نے اپنے روایتی صبر وتحمل اور درگزر سے کام لیتے ہوئے اس دکھ کو بھلا دینے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔ انہوں نے دینا سے متعلق سب سامان سمیٹ دیا اور ہر وہ چیز اسٹور کی نذر کر دی جس سے دینا کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے دینا کو حقوق کے سلسلے میں نظرانداز نہیں کیا جس کا ایک ثبوت ان کی اس

آخری وصیت سے ملتا ہے جس پر انہوں نے ۳۰ مئی ۱۹۳۹ء کو دستخط کیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دینا کی شادی اور اپنی مسلسل بیماری نے ان کے اندر موت کا احساس فزوں کر دیا تھا اور انہوں نے اسی احساس کے زیر اثر ضروری تصور کیا کہ اپنی آخری وصیت تحریر کر دیں۔ اپنی اس وصیت میں قائداعظم نے اپنی وراثت کا محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خان اور بمبئی کے اپنے قانونی مشیر محمد علی چائے والا کو مشترکہ ٹرسٹی مقرر کیا تھا۔ اس وصیت میں قائداعظم نے اعلان کیا تھا کہ تمام شیئرز، اسٹاکس اور سیکیورٹیز اور کرنٹ اکاؤنٹس جو اس وقت میری بہن فاطمہ جناح کے نام پر ہیں بالکل ان کی ملکیت ہیں۔ میں نے یہ تمام چیزیں ان کو اپنی زندگی کے دوران تحفے کے طور پر دی ہیں اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور وہ ان کو اپنی بالکل ملکیت ہونے کی بنا پر جس طریقے پر بھی چاہیں فروخت یا الگ کر سکتی ہیں۔ قائداعظم نے اپنے مکانات اور ان کے مشتملات، اپنی کاریں اور زندگی بھر کے لیے دو ہزار روپے مہینے کی آمدنی جو ان کی دیگر جائیدادوں سے ہوگی وہ بھی محترمہ فاطمہ جناح کو دی تھیں۔ اپنی دیگر تین بہنوں رحمت قاسم بھائی جمال، مریم عابدین پیر بھائی اور شیریں جناح کے لیے انہوں نے سو روپے ماہوار گزارہ الاؤنس چھوڑا۔ ایسا ہی انہوں نے اپنے بھائی احمد علی کے لیے کیا۔ اپنی بیٹی کے لیے (جس کا نام وصیت میں درج نہیں ہے) انہوں نے دو لاکھ روپے علیحدہ مختص کیے جن کو انویسٹ کرنے کی صورت میں چھ فیصد کے حساب سے ایک ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہوگی۔ وصیت میں یہ بھی درج ہے کہ بیٹی کے انتقال کے بعد یہ دو لاکھ روپے اس کی نرینہ وغیر نرینہ اولادوں میں مساوی تقسیم کر دیے جائیں گے، اگر اس کے کوئی اولاد نہ ہو تو یہ رقم ان کی جائیداد میں واپس آ جائے گی اور پھر مساوی طور پر علی گڑھ یونیورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور، اور سندھ مدرسہ کراچی میں تقسیم ہو جائے گی۔ محمد علی جناح نے یونیورسٹی آف بمبئی کے لیے پچاس ہزار روپے اور ۲۵ ہزار روپے فی کس کے حساب سے بمبئی کے انجمن اسلام اسکول اور عربک کالج آف

دہلی کے لیے بھی مختص کیے تھے۔

ڈپارٹمنٹ آف نیشنل آرکائیوز میں موجود قائداعظم پیپرز کے کیوریٹر محمد ریاض ملک نے قائداعظم کی جائیدادوں کے حوالے سے اہم تحقیق کی تھی۔ محمد ریاض ملک نے ۵/اکتوبر ۲۰۰۸ء کو اپنے ایک مضمون مطبوعہ روزنامہ 'خبریں' لاہور میں لکھا ہے کہ 'قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد محترمہ فاطمہ جناح ۱۶/ستمبر ۱۹۴۸ء تک گورنر جنرل ہاؤس میں مقیم رہیں۔ اس دوران 'دینا واڈیا' بھی ان کے ساتھ تھیں جو اپنے والد کے انتقال پر کراچی آ گئی تھیں۔ ۱۶/ستمبر ۱۹۴۸ء کو دینا واڈیا کی موجودگی میں گورنر جنرل ہاؤس میں موجود قائداعظم محمد علی جناح کی ذاتی لوہے کی الماری کو جب پہلی مرتبہ کھولا گیا تو اُس الماری سے دوسرے ذاتی کاغذات کے علاوہ ایک سربند لفافہ بھی ملا جو دینا واڈیا، محترمہ فاطمہ جناح اور محمد علی چائے والا سولیسٹیر بمبئی کی موجودگی میں کھولا گیا تو اُس میں محمد علی جناح کا تیار کردہ وہ وصیت نامہ تھا جو ۳۰ مئی ۱۹۳۹ء کو اُن کا خودنوشتہ تھا اور ساتھ ہی ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۰ء کو تحریر کردہ اس وصیت نامے کا عکس بھی تھا۔ وصیت نامے کے سامنے آتے ہیں محمد علی چائے والا اور محترمہ فاطمہ جناح نے فوراً وزیراعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان سے رابطہ کیا کیونکہ یہی تینوں افراد وصیت نامے میں موصی، عامل اور ٹرسٹیز مقرر کیے گئے تھے۔

دینا کی شادی کے بعد قائداعظم سے دینا کے مراسم کے بارے میں معلومات بہت مختصر ہیں۔ البتہ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ دینا کبھی کبھی اپنے والد سے ملنے ان کے گھر آیا کرتی تھیں لیکن وہ ان سے بات نہیں کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود قائداعظم ہمیشہ دینا کی فکر رکھا کرتے تھے۔ دینا بھی قائداعظم کی صحت اور مصروفیات سے باخبر رہا کرتی تھیں، جیسا کہ دینا کے ایک ٹیلیگرام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ ۱۴/اپریل ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے جب محمد علی جناح بمبئی سے مدراس کے لیے روانہ ہوئے تو ان کی طبیعت مضمحل تھی، لیکن وہ

مسلسل سفر کرتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس پہنچنے سے قبل ہی ریل گاڑی میں بے ہوش ہو گئے۔ اس خبر نے سارے ہندوستان کو سراسیمہ اور متوحش کر دیا۔ دینا نے بھی یہ خبر سننے کے بعد اپنے والد کو فوری طور پر ایک ٹیلیگرام ارسال کیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ 'میں آپ کی صحت کے حوالے سے شدید تشویش میں مبتلا ہوں۔' دینا نے ٹیلیگرام کے آخر میں 'محبتیں' لکھ کر اپنا نام 'دین بائی' تحریر کیا تھا، اگرچہ وہ عام طور پر دینا واڈیا کے نام سے معروف ہو چکی تھیں۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں بھی قائداعظم محمد علی جناح اور دینا جناح کی ایک ملاقات اُس وقت ہوئی جب بمبئی میں ایک خاکسار رفیق مزنگوی نے قائداعظم کے مکان میں گھس کر اُن پر قاتلانہ حملہ کیا اور اُن کے چہرے اور گردن پر معمولی زخم آئے۔ قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کی خبر اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی اور پورا ہندوستان خصوصاً مسلمان نہ صرف سراسیمہ ہو گئے بلکہ اُن کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے قائداعظم نے ایک بیان میں کہا کہ 'اگرچہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا تاہم خدا کے فضل و کرم سے میرے کوئی شدید زخم نہیں آیا ہے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ پُرامن رہیں۔ میں معجزانہ طور پر بچ گیا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ حملہ ایک مسلمان نے کیا ہے۔'

قاتلانہ حملہ کی اطلاع پر جہاں ہندوستان بھر سے ہزاروں ٹیلیگرام اور خطوط موصول ہوئے وہاں دینا جناح بھی فوری طور پر ساؤتھ کورٹ پہنچ گئیں اور انہوں نے قائداعظم کی نگہداشت اور تیمارداری میں ایک بیٹی کی طرح حصہ لیا۔ یہ بات راقم الحروف کو قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری اور سوانح نگار مطلوب الحسن سید نے ۱۹۸۴ء میں ایک ملاقات کے دوران بتائی تھی اور بعد میں یعنی ۲۰۱۵ء میں قائداعظم کے ایک اور جزوی پرائیویٹ سیکریٹری، قائداعظم کے سوانح نگار اور معروف قانون داں سید شریف الدین پیرزادہ نے ایک ملاقات میں بتائی۔ سید شریف الدین پیرزادہ نے یہ بھی کہا کہ دینا جناح کئی دن تک ساؤتھ کورٹ آتی رہیں اور قائداعظم کو

مشورہ دیتی رہیں کہ وہ اپنی حفاظت کا معقول انتظام کریں۔

جناح کے امریکی سوانح نگار اسٹینلے والپرٹ نے *Jinnah of Pakistan* میں لیڈی راما راؤ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جناح نے شادی کے بعد اپنی بیٹی سے کبھی بات نہیں کی، باوجود یہ کہ انہوں نے باہم خط و کتابت کی لیکن جناح نے ہمیشہ دینا کو رسمی طور پر 'مسز واڈیا' کہہ کر مخاطب کیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے کبھی دینا کے بارے میں گفتگو نہیں کی اور طنزاً اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ ان کے کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس کے برخلاف اسٹریچی انٹرنیشنل کی مطبوعہ کتاب *Pakistan: Past and Present* میں شامل دینا جناح کا اپنا بیان ہے کہ:

> میرے والد ظاہر دار نہیں تھے بلکہ وہ ایک پرشفقت باپ تھے، میری ان سے آخری ملاقات بمبئی میں ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ وہ نہایت نازک مذاکرات کے دوران دہلی سے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے اور میرے بچوں کو چائے پر مدعو کیا۔ وہ ہم کو دیکھ کر بہت خوش تھے، ڈائنا (دینا جناح کی بیٹی کا نام) پانچ سال کی اور نسلی دو سال کا تھا۔ ہم بیشتر وقت بچوں اور سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، انہوں نے مجھے بتایا کہ پاکستان وجود میں آرہا ہے۔ دہلی میں اپنی ناگزیر مصروفیات کے باوجود انہوں نے ہمارے لیے تحائف خریدنے کا وقت نکال لیا تھا۔ جب ہم نے ان کو خدا حافظ کہا تو وہ نسلی کو پیار کرنے کے لیے جھکے اور وہ خاکستری ٹوپی جو وہ اکثر لگاتے تھے اور جواب ان کے نام سے مشہور ہے، نسلی کو پسند آ گئی۔ انہو ں نے فوراً ہی وہ ٹوپی اتار کر اپنے نواسے کے سر پر رکھ دی اور بولے اسے تم رکھ لو میرے بیٹے۔ 'نسلی' آج تک اس ٹوپی کو بہت

عزیز رکھتا ہے۔ مجھے ان کی دلجوئی کی یہ ادا یاد ہے کیونکہ یہ ان کی
اس محبت کی ایک خصوصیت تھی جو وہ میرے اور میرے بچوں
کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے۔

اس نوعیت کی ایک گفتگو دینا واڈیا نے نوّے کی دہائی میں معروف محقق اور فلمساز پروفیسر اکبر ایس احمد سے ملاقات میں کی تھی۔ اس ملاقات کا تذکرہ اکبر ایس احمد نے اپنی کتاب *Jinnah, Pakistan and Islamic Identity* میں کیا ہے۔ دینا نے اُن سے کہا تھا کہ 'میرے والد نہایت شفیق اور محبت کرنے والے انسان تھے اور وہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ ایک غیر مسلم سے میری شادی اُن کے لیے رنج کا باعث تھی اور اس رنج کا اظہار اُن کے بعض رویوں سے ہوتا تھا مگر مجموعی طور پر انہوں نے کبھی مجھ کو نظر انداز نہیں کیا۔' دینا نے اپنے والد پر غیر اصولی تنقید کرنے والوں کے حوالے سے کہا کہ 'میرے والد سرد مزاج نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ میرے لیے وقت نکالتے تھے۔' پروفیسر اکبر ایس احمد نے ایک مرحلہ پر جب دینا سے کہا کہ ماؤنٹ بیٹن (ہندوستان کا آخری وائسرائے) نے محمد علی جناح کو نفسیاتی مریض کہا ہے تو دینا نے نہایت جذباتی اور دوٹوک لہجے میں جواب دیا کہ 'ماؤنٹ بیٹن خود نفسیاتی مریض تھا۔ میرے والد نے اپنی قوم کے لیے واقعی اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔'

قائداعظم کے نام دینا جناح کے دو ایسے خطوط قائداعظم پیپرز میں موجود ہیں جن سے دینا کے اپنے والد کے ساتھ خوشگوار تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب قائداعظم ہندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مذاکرات میں مصروف تھے اور ان مذاکرات کے نتیجے میں کسی حد تک یہ بات طے ہو چکی تھی کہ اب پاکستان بہت جلد معرضِ وجود میں آ جائے گا۔ پہلا خط دینا نے ۲۸/اپریل ۱۹۴۷ء کو قائداعظم کے نام پیڈر ہاؤس، کمبالا ہل، بمبئی سے لکھا ہے، اس خط میں انہوں نے قائداعظم کو 'پاپا ڈارلنگ' لکھ کر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

سب سے پہلے تو میں آپ کو مبارکباد پیش کروں گی۔ ہم نے پاکستان حاصل کرلیا۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصول تسلیم کرلیا گیا۔ میں آپ پر بہت فخر مند اور شاداں ہوں کہ آپ نے اس مقصد کے حصول کے لیے کس قدر سخت جدوجہد کی۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے ساؤتھ کورٹ بیس لاکھ روپے میں ڈالمیا کو فروخت کردیا ہے۔ یہ بہت اچھی قیمت ہے اور آپ یقیناً خوش ہوں گے۔ یہ صحیح ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گی کہ اگر آپ اپنی کتابیں منتقل نہیں کررہے ہیں تو کیا میں ان میں سے رتی کی شاعری کی چند پرانی کتابیں لے سکتی ہوں۔ بائرن، شیلے اور چند دیگر آسکر وائلڈ کی کتابوں میں سے۔ یہ درخواست میں اس صورت میں کررہی ہوں اگر آپ کتابیں یا فرنیچر فروخت کررہے ہوں یا آپ ان کو رکھنا نہ چاہتے ہوں شاید آپ جذباتی وجوہات کی بنا پر ان میں سے کچھ مجھے دے سکیں۔ میں ان کو ہمیشہ پڑھتی رہی ہوں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں مطالعہ کی بہت شوقین ہوں۔ بمبئی میں ان کتابوں کے معیاری ایڈیشن ملنا بہت محال ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ میں اخبارات میں آپ کے بارے میں بے شمار خبریں دیکھتی رہتی ہوں۔ بچے کالی کھانسی سے بحال ہورہے ہیں اور ابھی صحت یابی میں ایک ماہ لگ جائے گا۔ ان کو لے کر جمعرات کو ایک ماہ کے لیے 'جوہو' جارہی ہوں۔ کیا آپ یہاں واپس آرہے ہیں، اگر ایسا ہے تو کیا

میں اُمید کروں کہ آپ بذریعہ کار ُجوہو' آنا اور ایک دن ہمارے ساتھ گزارنا پسند کریں گے۔ بہرحال میرے پاس فون ہے، میں آپ سے رابطہ کرلوں گی اور اگر آپ یہاں آنے کے قابل نہیں ہیں تو میں خود آپ کو دیکھنے کے لیے آجاؤں گی۔ میں ایک چھوٹی سی خبر بھی آپ کو دینا چاہتی ہوں۔ بمبئی کسی حد تک خالی ہوگیا ہے کیونکہ سب لوگ پہاروں پر چلے گئے ہیں، یہاں بالکل ٹھنڈک ہے، میرا خیال ہے کہ اس وقت جو ہوائیں چل رہی ہیں انہوں نے ماحول کو خوشگوار بنادیا ہے۔ شوکی اور لیلیٰ گزشتہ شب کھانے پر آئے تھے اور آپ کے بارے میں دریافت کررہے تھے۔ آپ یقینا مصروف ہوں گے اس کے باوجود اگر آپ کے پاس ایک لمحہ ہو تو ضرور ایک سطر لکھیے۔ میں پھر آپ کو لکھوں گی۔ پاپا ڈارلنگ اپنا خیال رکھیں، بے شمار محبتوں اور بوسوں کے ساتھ۔

دینا نے دوسرا خط ۲ جون ۱۹۴۷ء کو ُجوہو' بمبئی سے لکھا، لیکن یہ خط انہوں نے چند سطروں کے بعد ختم کردیا اور پھر ۵ جون کو اسی خط کے نیچے سے نیا خط شروع کیا۔ انہوں نے ۲ جون ۱۹۴۷ء کو اپنے والد کے خط کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ:

یقینا یہ آپ کی شفقت ہے کہ آپ نے اس قدر مصروف رہتے ہوئے بھی مجھے خط لکھا۔ اس وقت آپ یقینا وائسرائے کے ساتھ ہوں گے۔ میں یہ ضرور کہوں گی کہ گزشتہ چند برسوں کے دوران آپ نے جو شاندار کامیابی حاصل کی ہے اس کی بنا پر میں آپ پر فخر مند اور شاداں ہوں۔ آپ ہندوستان میں واحد

آدمی ہیں جو بیک وقت ایماندار، طباع اور ماہر ہیں۔ یہ خط ایک
مداح کے جذبات کا آئینہ دار سا نظر آتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟

دینا نے یہاں سے دوبارہ ۵ جون کو خط از سرِ نو شروع کیا۔ اس وقت قائداعظم نہایت فیصلہ کن مرحلے میں تحریکِ پاکستان کی قیادت کر رہے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کے وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان آنے کے بعد ہندوستان کی قسمت کے فیصلے کا مرحلہ نہایت قریب آ گیا تھا۔ سید حسن ریاض نے اپنی کتاب 'پاکستان ناگزیر تھا' میں لکھا ہے کہ 'ماؤنٹ بیٹن ہر طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے تھے۔ انہوں نے اہتمام و تکلف کے ساتھ اپنے اوپر گھبراہٹ اور جلدی کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔'

۲۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے رسمِ حلف برداری کے فوراً بعد ہی مذاکرات شروع کر دیئے اور تقریباً دو ماہ آٹھ دن کے اندر ہی تقسیمِ ہند کے ایک منصوبے کی منظوری حاصل کر لی۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو سے اس منصوبے کی منظوری کا اعلان کیا اور اپنی تقریر کے آخر میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کیا۔ دینا جناح نے قائداعظم کی یہ تقریر سننے کے بعد ۵ جون کو اپنے خط میں لکھا کہ:

میں اسی خط کے تسلسل میں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں نے آپ کی ۳ جون والی تقریر سنی۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ سب سے اچھا اور بامقصد بولے۔ اگرچہ آپ کو وہ سب کچھ نہیں مل سکا جو آپ چاہتے تھے، لیکن آپ نے ایک طویل راستہ طے کر لیا ہے۔ کانگریس کو کس طرح اپنے وقار کو داؤ پر لگانا پڑا۔ یہاں کے ہندو قیامِ پاکستان اور دو مملکتوں کے مطالبے کی منظوری سے خوش نہیں ہیں۔ اب آپ کو پاکستان کو قابلِ عمل بنانے کا عظیم ترین کام

درپیش ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ آپ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ بمبئی بہت زیادہ گرم ہو گیا ہے اور ہم سب اُمید کرتے ہیں کہ یہ سب بارشوں کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ میں ۹ جون کو جوہو' چھوڑ دوں گی۔ کیونکہ ۱۱/ جون سے بچوں کے اسکول شروع ہو رہے ہیں۔ آپ بمبئی کب آ رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ جلد۔ آپ دہلی کی حدت برداشت کر رہے ہیں۔ آپ کو برداشت کرنا چاہیے۔ کیونکہ آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ میں بڑی حد تک خاکستری ہو گئی ہوں کیونکہ میں تیراکی کے لیے بہت جاتی ہوں۔ کیا آپ کو لیلیٰ اور شوکی کی موت کے بارے میں علم ہوا۔ یہاں بہت معمولی خبر معلوم ہوئی ہے کیونکہ لوگ ابھی تک دور ہیں، کوئی کسی سے نہیں ملا ہے۔ میں آپ کو دوبارہ جلد لکھوں گی۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ نے ساؤتھ کورٹ فروخت نہیں کیا، جیسا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں 'فورم میگزین' میں پڑھا تھا اور میں نہیں سمجھتی کہ وہ ایک بالکل بے بنیاد اطلاع شائع کریں گے۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ لوگ بے بنیاد افواہوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ آپ اپنا خیال رکھیں۔ بے شمار محبتیں اور بوسے اور پر جوش مبارکباد۔

دینا نے قیامِ پاکستان کے بعد ترکِ وطن نہیں کیا اور بھارت میں ہی اپنی سکونت برقرار رکھی۔ وہ قائداعظم کے ۱۱/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انتقال پر ایک خصوصی طیارے سے کراچی آئیں اور کچھ دن قیام کے بعد واپس بمبئی چلی گئیں۔

دینا کو اپنے والد کی عزت و ناموس کا کس قدر پاس وہ لحاظ تھا اس کا اندازہ اُن کے لباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی اور پھر نیولی واڈیا سے شادی کے بعد بھی کبھی کوئی ایسا لباس زیب تن نہیں کیا جو عریانی کا باعث ہو۔ ہمیشہ انہوں نے وہی لباس پہنا جو ہندی مسلمانوں کی روایتی تہذیب و ثقافت کا حصہ تھا۔ خصوصاً جب وہ اپنے والد کی تدفین میں شرکت کے لیے کراچی آئیں تو وہ شلوار قمیض زیب تن کیے ہوئے تھیں اور سر پر باقاعدہ دوپٹہ لے رکھا تھا۔ قائداعظم کے رفیقِ کار اور قیامِ پاکستان کے بعد نومولود مملکت کے دارالخلافہ کراچی کے پہلے ایڈمنسٹریٹر سید ہاشم رضا نے اپنی سوانح عمری 'ہماری منزل' میں دینا واڈیا کے بارے میں لکھا ہے کہ دینا نے شادی کے بعد قائداعظم سے نہ تعلقات ترک لیے اور نہ ہی اُن کی عزت و تکریم میں کوئی کمی آنے دی۔ وہ اپنے والد سے بے حد محبت کرتی تھیں اور میں نے خود دیکھا کہ قائداعظم محمد علی جناح کی میت کو جس وقت قبر میں اتارا جارہا تھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ دینا کو اپنے والد سے جو والہانہ محبت تھی اور جس کا وہ اکثر اظہار بھی کرتی رہتی تھیں۔ اس کا اندازہ اُن کے خطوط اور بیانات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد بھی انہوں نے ایک انٹرویو میں اپنے والد کے ناقدین کی گرفت کی اور کہا کہ 'ان کے والد ظاہر دار نہیں تھے بلکہ ایک پرشفقت باپ تھے۔ ان کے بارے میں یہ تصور کہ وہ مغرور تھے غلط ہے۔ وہ بے جا انکسار نہیں جانتے تھے بلکہ ایک منظم شخص تھے، میری طرح نہایت مخفی شخص۔ اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ وہ نجی یا عوامی زندگی میں نہ اپنے لیے جھوٹ پسند کرتے تھے اور نہ دوسروں کے لیے۔ جب لوگ ان کے بارے میں جھوٹی باتیں کرتے ہیں تو مجھے غصہ آجاتا ہے اور اس وقت بھی میں غصے میں آجاتی ہوں جب کچھ مصنفین جن کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا، خود کو ان کے مقربین میں ظاہر کرتے ہوئے

نجی معلومات کا دعویٰ کرتے ہیں یا مجھے بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل میرے والد کے شخصی پہلوؤں کے بارے میں افسانہ طرازی کا سہارا لے کر اپنی معلومات کے درمیان موجود خلا کو پُر کرتے ہیں۔'

دینا جناح جو شادی کے بعد مسز نیولی واڈیا کہلائی جانے لگی تھیں، بمبئی میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں اور ان کے دو بچے تھے، ایک لڑکا نسلی اور ایک لڑکی ڈائنا۔ لیکن مزاجوں کی عدم ہم آہنگی کی بنا پر میاں بیوی کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۳ء میں ۵ سال تک ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ مگر واڈیا نے دینا کو طلاق نہیں دی۔ اس علیحدگی کے باوجود قائداعظم جناح نے دینا کو کبھی اپنے گھر منتقل ہونے کی دعوت نہیں دی۔ ایک اطلاع کے مطابق ۳۱ جولائی ۱۹۹۶ء کو نیولی واڈیا کا سوئٹزرلینڈ میں انتقال ہوا۔

نیولی واڈیا نے بمبئی کی رہائش ترک کر کے سوئٹزرلینڈ میں رہائش اختیار کرلی تھی اور دینا نیویارک چلی گئی تھیں جہاں وہ مڈی سن ایونیو پر واقع ایک شاندار فلیٹ میں رہتی رہیں۔ ان کا بیٹا نسلی واڈیا اپنے والد کی تمام جائیداد اور کاروبار کا وارث ہے اور بمبئی میں مقیم ہے۔ لڑکی ڈائنا اپنی والدہ سے الگ 'مین ہٹن' نیویارک میں تنہائی اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہی ہے۔

رتی جناح اور قائداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان رنجشوں کی اکثر مورخین نے نشاندہی کی ہے مگر کسی نے واضح طور پر اس اختلاف کی وجوہات درج نہیں کی ہیں جس کی بنا پر اس ضمن میں خیال آرائیوں کو راہ ملی۔ رتی سے شادی سے قبل فاطمہ جناح اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں لیکن بعد میں وہ اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگیں اور اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے ہفتہ میں ایک دن یعنی اتوار کو جناح کے گھر آتی تھیں جو بلاشبہ اب رتی کا گھر تھا۔ فاطمہ جناح جو عمر میں رتی سے تقریباً ۷ سال

بڑی تھیں۔ایک مختلف مزاج کی خاتون تھیں۔نہ اُن میں چنچل پن تھااور نہ ہی وہ فیشن کی دلدادہ تھیں۔اُن کی کوئی سہیلیاں بھی نہیں تھیں۔بس اُن کو کسی سے تعلق تھا تو وہ صرف اپنے بھائی جناح سے تھا۔ بردباری اور تحمل بھی اُن کو بھائی سے ملا تھا۔وہ ہر وقت بس ایک غیر معمولی سنجیدگی کے حصار میں رہتی تھیں اس لیے جناح کے گھر آمدورفت کے باوجود اُن کے رتی سے فراخدالانہ مراسم استوار نہ ہوسکے۔اگر چہ رتی نے ابتداً فاطمہ جناح سے چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کی کوشش کی لیکن فاطمہ جناح کی روایتی سنجیدگی ہمیشہ اس راہ میں حائل رہی۔ حائل کیا رہی دونوں میں رویوں کا اختلاف بڑھتا رہااور یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ جناح نے فاطمہ کوکلکتہ کے احمد ڈینٹل کالج میں داخل کروا دیا لیکن اس دوری کے باوجود وہ فاطمہ کے بارے میں سوچتے تھے۔اُن کے تمام اخراجات اٹھاتے تھے جس کی بنا پر اکثر رتی رنج کا شکار ہوجاتی تھیں۔یہی وہ اسباب تھے کہ فاطمہ اور رتی کے درمیان کوئی ایسا خوشگوار تعلق پیدا نہیں ہوسکا جو قربتوں میں اضافہ کرتا۔اس کے برخلاف جناح کی صاحبزادی دینا اپنی پھوپھی سے کسی حدتک مانوس ہوتی چلی گئیں۔خصوصاً فروری ۱۹۲۹ءمیں رتی کے انتقال کے بعدتواس مانوسیت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ جب اکتوبر ۱۹۳۰ءمیں جناح گول میز کانفرنسوں کے اجلاس میں شرکت کے لیے لندن جارہے تھےتو چند ماہ بعد انہوں نے فاطمہ اور دینا دونوں کو لندن بلالیا تھا جہاں وہ ہمسٹیڈ میں تقریباً ۱۹۳۶ء تک مقیم رہیں۔اگر چہ اس دوران دینا جناح کو اسکول میں داخلہ مل گیا تھااور وہ اسکول کے ہاسٹل میں رہتی تھیں لیکن وہ چھٹی والے دن ہمسٹیڈ آیا کرتی تھیں اور اپنے والد اور پھوپھی فاطمہ جناح کے ساتھ سیر وتفریح پر جاتی تھیں۔ایک اندازہ کے مطابق یہی وہ عرصہ تھا جس میں فاطمہ جناح سے دینا کی قربت اور ذہنی ہم آہنگی میں اضافہ ہوا لیکن یہ ذہنی ہم آہنگی اُس مرحلہ پر تعطل کا شکار ہوگئی جب دینا نے نیولی واڈیا سے شادی

کے لیے اصرار کیا اور محمد علی جناح نے اس کی شدید مخالفت کی چنانچہ محترمہ فاطمہ جناح جو اپنے بھائی کے ساتھ ہی رہتی تھیں وہ بھی دینا سے دور ہو گئیں۔ قائداعظم کے ڈرائیور عبدالحیٰ نے ۱۹۸۶ میں راقم الحروف کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ نیولی واڈیا سے دینا کی شادی کا معاملہ سامنے آنے سے قبل محترمہ فاطمہ جناح دینا کی آمدورفت پر کڑی نگاہ رکھنے کے باوجود اُن سے ہمیشہ پُرشفقت رہا کرتی تھیں۔ سید شریف الدین پیرزادہ نے بھی اس حوالے سے اپنی یادداشتیں راقم الحروف سے بیان کی تھیں۔ اُن کا بھی کہنا تھا کہ دینا کی شادی کے کچھ عرصہ بعد محترمہ فاطمہ جناح ٹیلی فون پر دینا سے رابطہ میں آ گئی تھیں اور وہ نہ صرف دینا کی خیریت سے قائداعظم کو باخبر رکھتی تھیں بلکہ اُن کو تحائف بھی بھیجا کرتی تھیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد بھی دینا کا محترمہ فاطمہ سے رابطہ برقرار رہا۔ وہ قائداعظم کی رحلت کے بعد پابندی کے ساتھ محترمہ فاطمہ جناح سے ٹیلی فون اور خط و کتابت کے ذریعہ رابطے میں رہا کرتی تھیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کے پیپرز میں جو ڈپارٹمنٹ آف نیشنل آرکائیوز میں موجود ہیں۔ چند خطوط ایسے محفوظ ہیں جن کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینا واڈیا نہایت احترام و محبت کے ساتھ محترمہ فاطمہ جناح کو خط لکھا کرتی تھیں۔ ان خطوط میں جہاں وہ محترمہ فاطمہ جناح سے اُن کی صحت کے بارے میں دریافت کرتی تھیں وہاں وہ اپنی اور اپنے بچوں کی خیریت سے بھی محترمہ فاطمہ جناح کو مطلع کرتی رہتی تھیں۔ دینا نے اپنے بیشتر خطوط میں محترمہ فاطمہ جناح کو Aunty Darling لکھ کر مخاطب کیا ہے اور خط کے اختتام پر Fondest Love لکھ کر 'دینا' لکھا ہے۔ جولائی ۱۹۵۱ء کو دینا واڈیا نے پیرس، فرانس میں واقع ایک ہوٹل Hotel San Regis سے ایک خط میں محترمہ فاطمہ جناح کو لکھا کہ 'بمبئی سے میرے ٹیلی فونک رابطہ کے بعد سے آپ کی جانب سے کوئی اطلاع موصول نہیں

ہوئی۔ میں یہاں سے اگلے دن روانہ ہوجاؤں گی۔ میری رقم کا کیابنا۔ کیا آپ نے دو لاکھ روپے کی رقم ویسٹرن اسٹار بینک کے پتہ پر بھیج دی ہے جس کا پتہ میں نے آپ کو ارسال کیا تھا یا پھر لندن میں نیشنل بینک آف انڈیا میں جمع کرادی گئی ہے۔ برائے مہربانی مجھے مطلع کریں کہ کیا صورتِ حال ہے۔ اگر آپ یہ ضروری سمجھتی ہیں تو میں لیاقت (نوابزادہ لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان) کو لکھوں گی کہ وہ اس سلسلہ میں کیا کرسکتے ہیں۔ اب تین سال گزر چکے ہیں اور معاملات اب تک طے پاجانا چاہیے تھے۔ میں بڑی ممنون ہوں گی اگر آپ یہ کام میرے لیے کردیں۔ پیرس ہمیشہ کی طرح دلربا اور خوبصورت مناظر سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس ماہ کے آخر میں لندن جارہی ہوں تاکہ ڈائنا (بیٹی) کی تعطیلات کو پرکشش بناسکوں۔ اس کے بعد میں فرانس کے جنوب اور اٹلی جاؤں گی۔ میرا درج بالا پتہ مستقل ہے میں جواب کی منتظر رہوں گی۔ بے پناہ محبتوں کے ساتھ۔ دینا'

۹ راگست ۱۹۵۱ء کو دینا واڈیا نے Cap-Martin Hotel مونٹی کارلو سے ایک خط میں محترمہ فاطمہ جناح کو لکھا کہ 'میرے تحریر کردہ خط کے بعد ۱۴ رجولائی کو موصول ہونے والے خط کا شکریہ۔ اس وقت میں لندن میں تھی اور اب میں ڈائنا کے ساتھ جنوبی فرانس میں ہوں۔ میں یہاں ۲۰ راگست تک قیام کروں گی۔ اس کے بعد میں آسٹریا، بویریا اور ویانا وغیرہ دوستوں کے ساتھ جارہی ہوں۔ اگر آپ مجھے خط لکھیں تو ہمیشہ Hotel San Regis پیرس کے پتہ پر لکھیں اُن کو علم ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ کیا آپ مناسب تصور کرتی ہیں کہ آپ بینک سے معلوم کریں کہ تین سال میں میری رقم کا کیا منافع بنا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ جلد یہ رقم منتقل کرادیں گی۔ میں اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ مجھے اس کی ضرورت ہے بلکہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان سیاسی صورتِ حال بہتر نہیں ہے۔ ۲۰ ستمبر کو میں یورپ سے روانہ

ہوجاؤں گی۔اُس سے قبل یہ مسئلہ طے ہوجائے۔ پاکستان کیسا ہے۔اُمید ہے کہ آپ صحت مند ہوں گی۔'

محترمہ فاطمہ جناح کے پیپرز میں دیناواڈیا کے جوخطوط موجود ہیں اُن کی تعداد تقریباً دس ہے مگر بیشتر خطوط میں انہوں نے قائداعظم کی جانب سے وصیت کے مطابق اُن کو ملنے والے دولاکھ روپے کے انوسٹمنٹ اوراُن سے حاصل شدہ منافع کے حصول کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ نیو یارک سٹی سے ایک خط میں جس پر تاریخ درج نہیں ہے انہوں نے پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی شہادت پر صدمہ کا اظہار کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

> ڈارلنگ آنٹی! میں آپ کے بارے میں فکر مند رہتی ہوں۔میں لیاقت کی موت کے بارے میں پڑھ کر صدمہ میں آ گئی۔میں پریشان ہوں کہ تشدد مسائل کو کم حل کرتا ہے۔میں اپنے پاکستان کے بارے میں خوفزدہ ہوں جس کے لیے پاپا نے اتنا کچھ کیا۔ خدایالوگ اُن کی بے غرضی کو یاد کریں تا کہ اُن میں یہ ہمت پیدا ہو کہ وہ اُن کے خوابوں کی تعبیر کوممکن بناسکیں اور تنگ نظری اور تشدد سے خود کو دُور رکھیں۔ میں نے آپ کو فرانس سے بھی خط لکھا تھا لیکن آپ کا جواب نہیں آیا۔ مجھے خط لکھیے۔ مجھے آپ کی خیریت معلوم ہوکر بہت خوشی ہوگی۔اوپر دیئے ہوئے پتہ پر میں آئندہ دوماہ تک موجود رہوں گی۔
>
> میں نے یورپ میں بہت خوشگوار چھٹیاں گزاریں۔اٹلی، آسٹریا اور جرمنی گئی۔ ویانا بڑا اُداس سا تھا میں نے سفر کار کے ذریعہ کیا جو بہت دلچسپ تھا۔ نیویارک ہمیشہ کی طرح بہت

پُرلطف ہے۔ میں بہت سارے شوز دیکھنے جارہی ہوں اور بہت سارے پرانے دوستوں سے مل رہی ہوں۔ کیا آپ کو میری رقم کے بارے میں کچھ خبر ہے۔ کیا آپ مجھے اس بارے میں بتا سکتی ہیں۔ اگر آپ اس رقم کو برطانیہ نہ بھیج سکیں تو میں آپ کو بہت اچھے ٹرسٹی سیکوریٹی بانڈز دے سکتی ہوں جن کا بندوبست میں یہاں رہتے ہوئے کرسکتی ہوں مگر میرا خیال ہے کہ برطانیہ بہتر رہے گا۔ میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں گی اگر اس معاملہ کو جلد نمٹادیں تا کہ میں اس رقم کو استعمال کرسکوں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ بیگم خان اور بیگم ہدایت اللہ کو میری نیک خواہشات پہنچا دیجیے گا۔ ضرور بالضرور مجھ کو خط لکھیں اور اپنے بارے میں مطلع کریں۔ میں اکثر آپ کے بارے میں سوچتی ہوں اور یہ مشکل ایاّم مجھے آپ کے بارے میں فکرمند کردیتے ہیں۔ بے پناہ محبتوں کے ساتھ۔ دینا۔

دینا واڈیا کے محترمہ فاطمہ جناح کے نام خطوط سے دینا کی ذاتی زندگی اور سرگرمیوں پر جہاں روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف محترمہ فاطمہ جناح کی صحت کے بارے میں فکرمند رہتی تھیں بلکہ یہ چاہتی تھیں کہ فاطمہ جناح ان کے ساتھ کچھ دن امریکہ یا فرانس میں گزاریں۔

قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد دینا جناح دومرتبہ پاکستان آئیں۔ پہلی مرتبہ اپنے والد کے انتقال پر اور دوسری مرتبہ ۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء میں لاہور میں ہونے والے پاک بھارت کرکٹ میچ سیریز کا آخری میچ دیکھنے کے لیے۔ جب وہ

پاکستان آئیں تو اُن کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اُن کو پاکستان آنے کی دعوت پاکستان کرکٹ بورڈ کے چیئرمین شہریار خان نے دی تھی۔ جبکہ دیگر انتظامات حکومتِ پاکستان نے کیے تھے۔ اُن کو اس دورے میں 'اسٹیٹ گیسٹ' کا اعزاز دیا گیا تھا جبکہ اُن کے ساتھ اُن کے صاحبزادے نسلی واڈیا، بہو مورین واڈیا، پوتے نیس واڈیا اور جہانگیر واڈیا بھی تھے۔ انہوں نے قذافی اسٹیڈیم میں میچ دیکھنے کے بعد شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے نواسے میاں یوسف صلاح الدین کے ساتھ علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دی۔ وہ لاہور کی بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ بھی دیکھنے گئیں۔ ان مواقع پر اُن کی متعدد قومی اور عوامی رہنماؤں سے ملاقات بھی ہوئی۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق وہ قذافی اسٹیڈیم سے اُس وقت اُٹھ کر چلی گئیں جب بھارت کی فتح کے امکانات واضح ہو گئے تھے۔ ۸۳ سال کی عمر میں بھی دینا واڈیا کی آواز میں اپنے والد کی آواز کی طرح گھن گرج اور شخصیت میں رعب و دبدبہ موجود تھا۔ وہ اپنے والد کی چلتی پھرتی شبیہہ نظر آتی تھیں۔

لاہور کے بعد دینا واڈیا ۲۴ مارچ کو کراچی آئیں اور اپنے والد بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے مزار پر حاضری دی۔ اس موقع پر بھی اُن کے صاحبزادے نسلی واڈیا، بہو اور دو پوتے ہمراہ تھے۔ بحیثیت سرکاری مہمان کے اُن کو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ دینا واڈیا کے کراچی کے دورہ کی خبریں اخبارات نے واضح سرخیوں کے ساتھ شائع کی تھیں لہٰذا اُن کا دیدار کرنے کے لیے ہزاروں افراد مزارِ قائد کے احاطہ کے اطراف جمع ہو گئے تھے۔ قائداعظم مزار مینجمنٹ بورڈ کے سیکریٹری اور ریذیڈنٹ انجینئر محمد عارف نے دینا واڈیا اور اُن کے خاندان کے افراد کو مزارِ قائد پر خوش آمدید کہا تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ وہ اُن کے ساتھ رہے تھے۔ انجینئر محمد عارف نے ایک ملاقات میں دینا واڈیا کی مزار قائد پر آمد کی تفصیلات بیان

کرتے ہوئے کہا کہ 'مزارِ قائد کے پوڈیم کے نیچے میں اُن کے استقبال کے لیے کھڑا ہوا تھا تو میری کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس عظیم قائد کے مزار کی نگہداشت ایک عرصہ سے میرے ذمہ ہے اُن کی صاحبزادی آج پہلی مرتبہ اپنے والد کے مزار پر آ رہی ہیں۔ یقیناً یہ میری زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ تھا۔ دینا واڈیا جب اپنے اہل خاندان کے ساتھ مزار پر آئیں تو اُن کو دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔ وہ ہو بہو قائداعظم کی تصویر تھیں۔ ۸۳ سال کی عمر میں بھی وہ بہت چاق و چوبند تھیں۔ گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے ایک بھرپور نگاہ مزارِ قائد پر ڈالی۔ صبر و ضبط کے باوجود اُن کی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پر اپنے والد کے لیے ایک گہری عقیدت نمایاں تھی۔ وہ بہت وقار کے ساتھ مزار کے پوڈیم کی سیڑھیاں چڑھیں اور جیسے ہی پوڈیم پر آئیں اُن کو نیوی کے گارڈز نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس کے بعد وہ مقبرے کے اندر گئیں اور قبر کے سامنے مودب کھڑی ہو گئیں۔ میں نے دیکھا اُن کے ہونٹ شدتِ جذبات سے لرز رہے تھے۔ پھر انہوں نے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ تلاوت قرآن حکیم کے بعد جب دعا کی گئی تو انہو ں نے بھی ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ بہت یادگار اور جذباتی منظر تھا۔ وہ دیر تک مزار پر آویزاں دیدہ زیب فانوس دیکھتی رہیں۔ اس موقع پر میں نے اُنہیں بتایا کہ یہ فانوس عوامی جمہوریہ چین نے خیر سگالی اور خراجِ عقیدت کے طور پر تحفہ میں دیا تھا۔ جس وقت اُن سے وزیٹرز بک پر تاثرات رقم کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ جذباتی ہو گئیں۔ اُن کے لیے تاثرات لکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک کپکپاتے ہاتھوں میں قلم پکڑے کھڑی رہیں پھر جب اُن کے صاحبزادے نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا تو انہوں نے بہت مختصر سے تاثرات قلم بند کیے۔ انہوں نے لکھا "یہ بہت زبردست اور ادا کر دینے والا لمحہ ہے۔ خدا پاکستان کے بارے میں اُن کے (قائداعظم)

خواب کو پورا کرے۔"'

انجینئر محمد عارف نے بتایا کہ مزار کے بعد وہ مزار قائد کے احاطہ میں موجود 'جناح میوزیم' دیکھنے گئیں اور اپنے والد کی یادگار اشیاء کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں۔ انہوں نے بہت سی اشیاء کو شناخت کیا اور کہا کہ ان میں سے بیشتر اشیاء سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ قائداعظم کی 'پیکارڈ کار' جو ۱۹۳۸ء کا ماڈل ہے اُسے دیکھ کر خوش ہوئیں اور اپنے صاحبزادے سے کہا کہ میں اس کار میں سفر کیا کرتی تھی۔ اسی طرح سے انہوں نے قائد کے صوفہ سیٹ کو دیکھ کر کہا کہ ہمارے ڈرائنگ روم میں بیشتر فرنیچر چمڑے کا ہوتا تھا۔ میرے والد کو اعلیٰ گاڑیوں، فرنیچر، کراکری اور قالینوں کا بہت شوق تھا۔ دینا واڈیا نے قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ اپنی نوعمری کی تصویر کو دیکھ کر اپنے صاحبزادے کو قریب بلایا اور کہا کہ 'دیکھو یہ میں ہوں' وہ دیر تک اس تصویر کو دیکھتی رہیں اور پھر مجھ سے کہا کہ اس تصویر کی کاپی مجھے ضرور بھیج دیں۔ میوزیم سے نکل کر انہوں نے وہاں موجود مزار کے عملہ سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ 'جس طرح آپ لوگ مزار کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور جیسا اس کو دیدہ زیب اور پروقار رکھا ہوا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ میں دوبارہ یہاں حاضری دینے آؤں گی۔' انجینئر محمد عارف کا کہنا ہے کہ دینا واڈیا کی آواز قائداعظم سے ملتی ہوئی تھی۔ اس موقع پر چونکہ میڈیا کو مزار کے احاطے میں آنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے میں نے شروع ہی میں اُن سے اجازت لے لی تھی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہمارا فوٹوگرافر اس یادگار موقع کی تصاویر کھینچ لے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اجازت مرحمت فرمائی۔ محترمہ دینا واڈیا جو اپنے ذاتی جہاز سے پاکستان آئی تھیں۔ ۲۴ مارچ کی شب کو اسی جہاز سے واپس چلی گئیں۔

دینا واڈیا اپنی زندگی کے آخری ایام قائداعظم کے بمبئی میں واقع مکان

'ساؤتھ کورٹ' میں بسر کرنا چاہتی تھیں لہٰذا انہوں نے بھارتی حکومت سے اپنے والد کا مکان حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیا۔ بھارتی حکومت نے قائداعظم کے پاکستان جانے کے بعد اس مکان کو متروکہ املاک قرار دے دیا تھا۔ دینا واڈیا نے یہ بھی کہا کہ قائداعظم نے اپنی وصیت میں مکان چونکہ فاطمہ جناح کو دیا تھا اور اب اُن کے انتقال کے بعد میں بحیثیت بیٹی کے اس کی جائز وارث ہوں۔ روزنامہ 'ڈان' کراچی کی ایک اطلاع کے مطابق دینا نے کہا کہ ویسے بھی محمد علی جناح کی وصیت کی عدالت سے توثیق نہیں ہوئی تھی اس لیے مجھے اس مکان کی حوالگی میں کوئی قانونی قباحت نہیں ہے۔ بھارتی حکومت نے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ صرف فاطمہ جناح کے قانونی ورثا اس سلسلہ میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ دینا واڈیا کے وکیل شری کانت ڈوریجوڈی نے اس نقطہ نظر کو چیلنج کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ جناح کی واحد اولاد ہونے کی حیثیت سے دینا اس جائیداد کی مکمل وارث ہیں۔ دینا واڈیا کے وکیل نے یہ بھی کہا کہ 'بھارت میں یہ واحد جائیداد ہے جس کا دینا واڈیا مطالبہ کر رہی ہیں کیونکہ یہ فی الوقت بھارتی حکومت کے قبضہ، تصرف میں ہے۔' جب اس تمام کارروائی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو دینا واڈیا نے بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ سے ایک خط کے ذریعے رابطہ کر کے کہا تھا کہ 'اب تقریباً میرے والد کے انتقال کو ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔ مجھے میرے اُس مکان سے محروم رکھا جا رہا ہے جہاں میں پروان چڑھی اور جہاں میں اپنی شادی تک مقیم رہی۔ میں درخواست کرتی ہوں کہ میرا مکان مجھے واپس دیا جائے۔' دینا واڈیا کی اس درخواست کو بھی نظرانداز کر دیا گیا البتہ ہندو انتہا پسند لیڈر بال ٹھاکرے نے ایک بیان میں کہا کہ 'آج جناح ہاؤس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور کل تاج محل اور اُس کے بعد قطب مینار کا بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔'

اس تمام صورتِ حال سے دینا واڈیا اس قدر دلبرداشتہ ہوئیں کہ انہوں نے ۲۰۰۸ء کے بعد بھارت کا دورہ نہیں کیا جبکہ اُن کا بیٹا اور دو پوتے بھارت کے متمول ترین افراد میں شامل ہوتے ہیں۔ دینا جناح کا ۲ نومبر ۲۰۱۷ء کو ۹۸ سال کی عمر میں نیویارک میں انتقال ہوا، اُن کی وصیت کے مطابق اُن کی میت کو بھارت نہیں لے جایا گیا بلکہ اُن کی آخری رسومات نیویارک میں ادا کی گئیں۔

قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ 'محترمہ فاطمہ جناح' جو بعد میں 'مادرِ ملت' کے خطاب سے معروف ہوئیں، تحریکِ پاکستان اور پاکستان کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہیں جن کے تذکرے کے بغیر شاید یہ دونوں موضوعات ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہیں گے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اگرچہ بیگم مولانا محمد علی جوہر، بیگم مولانا حسرت موہانی، بیگم شائستہ اکرام اللہ، معروف صحافی اور 'پیسہ' اخبار لاہور کے بانی منشی محبوب عالم کی صاحبزادی فاطمہ بیگم، بیگم جہاں آراء شاہنواز، بیگم سلمیٰ تصدق اور دیگر خواتین نے اہم خدمات انجام دیں لیکن محترمہ فاطمہ جناح کو اس لحاظ سے اوّلیت اور فوقیت حاصل رہی کہ وہ نہ صرف قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ تھیں بلکہ شاید وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسوں میں قائداعظم کے شانہ بشانہ شرکت کر کے ہندوستان کی مسلمان خواتین میں یہ احساس بیدار کیا کہ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ قومی مقاصد کے حصول میں اپنا جائز کردار ادا کر سکتی ہیں۔

محترمہ فاطمہ جناح کی ابتدائی تعلیم و تربیت قائداعظم کی سرپرستی میں ہوئی، لہٰذا اُن کی شخصیت پر اُن کے عظیم بھائی کے طرزِ فکر اور کردار کے گہرے نقوش مرتسم ہوئے۔ لہٰذا اُن کا رہن سہن، وضع قطع، عادات و اطوار، گفتگو کا طریقہ اور اندازِ فکر قائداعظم سے اس قدر مشابہہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے عظیم بھائی کا عکسِ جمیل نظر آنے لگی تھیں۔ اُن کو قائداعظم محمد علی جناح کی معیت میں ہندوستان کی عدالت اور سیاست

سے وابستہ تمام اہم اور بڑے لوگوں سے ملاقات کے مواقع میسر آئے، انہوں نے بہت قریب سے اپنے بھائی کے سیاسی تدبر، دور اندیشی، راست گوئی اور استقامتِ رائے کا جائزہ لیا تھا، اس لیے وہ خود بھی عوامی زندگی میں قائداعظم محمد علی جناح کے سے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنے لگی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اور قائداعظم کے انتقال کے بعد بھی محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں ہر شخص کی یہی رائے تھی کہ وہ اپنے عظیم بھائی کی ہو بہو تصویر ہیں۔ بقول پروفیسر شریف المجاہد 'تحریکِ پاکستان کے دوران قوم نے محترمہ فاطمہ جناح کو قائداعظم کے سائے میں دریافت کیا تھا۔'

محترمہ فاطمہ جناح اگرچہ ابتدا سے ہی قائداعظم کے ساتھ رہیں، لیکن انہوں نے عملی سیاست میں ۱۹۳۷ء کے بعد حصہ لینا شروع کیا۔ وہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں پہلی بار قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں شریک ہوئیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس جدید مسلم ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم اور تاریخ ساز اجلاس تھا، کیونکہ اسی اجلاس سے قائداعظم محمد علی جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ دونوں نہ صرف بیک وقت عوامی سیاست میں داخل ہوئے بلکہ ہندوستان کے مسلم عوام کو براہِ راست جمہوری عمل میں شرکت کا موقع میسر آیا۔ اسی اجلاس کے بعد مسلم لیگ روز بروز ایک عوامی جماعت کا رُوپ دھارتی چلی گئی۔

جولائی ۱۹۳۸ء میں محترمہ فاطمہ جناح نہ صرف بمبئی صوبائی مسلم لیگ کی رکن منتخب ہوئیں بلکہ اُن کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا بھی بمبئی سے رکن منتخب کیا گیا، اُن کی یہ رکنیت قیامِ پاکستان تک مسلسل برقرار رہی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی رکن کی حیثیت سے محترمہ فاطمہ جناح کو تنظیمی طور پر یہ استحقاق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ تنظیمی اور سیاسی عمل میں باضابطہ شریک رہ سکیں۔ قائداعظم خواتین کو معاشرے کا اہم طبقہ تصور کرتے تھے، لہٰذا اُن کی خواہش تھی کہ

مسلم خواتین مردوں کے دوش بدوش تحریکِ پاکستان میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ قائداعظم نے دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمقام پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ خواتین سب کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا تاکہ ضلعی اور صوبائی سطح پر خواتین کو منظم کر کے اُن کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا جا سکے۔ قائداعظم کا خیال تھا کہ مسلمان خواتین معاشرے کی سیاسی، ثقافتی اور معاشی ترقی میں برابر کی حصہ دار ہیں اور اُن کی اگر صحیح خطوط پر تربیت کی جائے تو وہ اس حوالے سے بہت مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اس مرحلے پر محترمہ فاطمہ جناح خواتین کی رہنمائی کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئیں۔ انہوں نے ہندوستان گیر دورے کر کے لاتعداد خواتین سب کمیٹیاں تشکیل دیں اور خواتین کے جلسوں سے خطاب کر کے اُن کو آل انڈیا مسلم لیگ کی حکمتِ عملی اور مقاصد سے آگاہ کیا۔ مزید برآں آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد اور پروگرام کے خلاف انڈین نیشنل کانگریس کے پروپیگنڈے سے مسلم خواتین کے اذہان میں جو سوالات پیدا ہوتے تھے، محترمہ فاطمہ جناح اپنی تقاریر میں اُن کا بھی موثر جواب دیتی تھیں تاکہ خواتین میں خود اعتمادی اور ہمت پیدا کر کے انہیں ہر قسم کی مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے آمادہ و تیار کیا جائے۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح کے جلسوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد نہ صرف شریک ہوتی تھی بلکہ مطالبۂ پاکستان کی منظوری کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے آل انڈیا مسلم لیگ سے تعاون بھی کرتی تھی۔

۱۹۴۲ء میں کوئٹہ میں خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے محترمہ فاطمہ جناح نے فرمایا 'مسلم خواتین نے ابھی تک وہ کردار ادا نہیں کیا ہے جس کی اُن سے توقع کی جاتی ہے۔ اُن کو یقیناً راست انداز میں آگے بڑھنا ہوگا تاکہ وہ اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی ترقی کے لیے کام کر سکیں۔ جب تک خواتین اپنی قوت اور اپنی حیثیت کے مطابق اپنے خاندان، اپنے ہمسائے اور اپنے عزیزوں میں

مسلم قومیت کے تصور کو اُجاگر نہیں کریں گی اُس وقت تک مطالبۂ پاکستان کی اہمیت واضح نہیں ہوگی۔' محترمہ فاطمہ جناح نے ۱۹۴۳ء میں دہلی میں خواتین کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 'اس عظیم جدوجہد میں جس کا اس وقت ہم کو سامنا ہے اور جس سے ہم کو آئندہ بھی گزرنا ہے، خواتین اہم ترین کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ہم کو ورثے میں ایک شاندار تاریخ ملی ہے۔ اگرچہ گردشِ زمانہ نے گزشتہ دوسو سال میں ہم کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے، لیکن اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے حوالے سے مسلم ہندوستان ازسرِ نو بیدار ہو رہا ہے۔ اس مرحلے پر خواتین اپنے اثر و رسوخ کو استعمال میں لاکر مسلم ہندوستان کو اُس کی شاندار اسلامی تاریخ اور قیمتی روایات سے جوڑ سکتی ہیں۔' محترمہ فاطمہ جناح کا خیال تھا کہ اگر مسلم خواتین مردوں کے شانہ بشانہ اقتصادی ترقی کی جدوجہد میں بھی شریک ہوجائیں تو معاشرے سے نہ صرف افلاس اور غربت کا خاتمہ ہوجائے گا بلکہ مسلمان بحیثیت قوم اس بات کے اہل ہوجائیں گے کہ وہ قومی مقاصد کے حصول کی خاطر گراں قدر مالی تعاون بھی فراہم کرسکیں۔

۴۶-۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی اس کامیابی کے نتیجے میں یہ بات کسی حد تک طے ہوگئی کہ اب پاکستان کے قیام کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ان انتخابات کے موقع پر بھی محترمہ فاطمہ جناح نے خواتین کے بے شمار جلسوں سے خطاب کیا اور اُن کو باور کرایا کہ ان انتخابات کے نتائج مطالبۂ پاکستان کی منظوری میں شہہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا خواتین انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ہر ممکن کامیابی کے لیے خود کو وقف کردیں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے شہر شہر اور قریہ قریہ گھوم کر خواتین سے رابطہ کیا اور اُن کے اندر وہ جذبہ عمل پیدا کیا جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام ممکن ہوسکا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے خواتین میں مطالبۂ پاکستان پر ایک غیر متزلزل ایقان پیدا کیا اور ہمیشہ خواتین کی جدوجہد کو سراہا۔
۱۹۴۷ء میں ۳ جون پلان کے اعلان کے بعد محترمہ فاطمہ جناح نے مسلم خواتین کو اُن

کی طویل جدوجہد کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ 'ہماری قومی جدوجہد ایک شاندار کامیابی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ عنقریب ہمارا قومی وطن پاکستان قائم ہو جائے گا اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مسلم خواتین نے اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ انتھک جدوجہد کی اور اپنے موقف پر استقامت کا ثبوت دیا۔ مسلم خواتین اس موقع پر مسلم ہند کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہیں۔'

محترمہ فاطمہ جناح تحریکِ پاکستان کے دوران مختلف تنظیمی کمیٹیوں کی رکن تو رہیں لیکن انہوں نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ انہوں نے بہت بعد میں یعنی ۱۹۶۴ء میں صدر ایوب کے خلاف اپنی انتخابی مہم کے دوران ایک تقریر میں کہا 'میں نے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان کے حصول کے لیے ایک سپاہی کی طرح دوسرے مسلمانوں کے دوش بدوش کام کیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اور بعد میں بھی قائداعظم کے ساتھ میں ہر جگہ جاتی تھی۔ لیکن قائداعظم نے مجھے کوئی سیاسی عہدہ نہیں دیا۔ انہوں نے اپنی بہن کے لیے پاکستان نہیں بنایا تھا بلکہ پوری قوم کے لیے بنایا تھا۔' یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح کی رفاقت پر قائداعظم ناز کرتے تھے۔ آپ نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے محترمہ فاطمہ جناح کو یہ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا 'فاطمہ جناح نے ہمیشہ میری مدد اور ہمت افزائی کی۔ اُن دنوں جب میں یہ توقع کر رہا تھا کہ برطانوی حکومت کسی بھی لمحہ مجھے گرفتار کر لے گی، میری بہن نے اُس وقت میرا حوصلہ بڑھایا اور اُس وقت بھی اُمید افزا گفتگو کی جب بدلتے ہوئے حالات مجھے دلبرداشتہ کر دیتے تھے۔'

قائداعظم نے اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح کی ان خدمات کے باوجود کبھی اُن کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ وہ اقربا پروری کے شدید خلاف تھے اور انہوں نے اپنے اس موقف کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آل انڈیا مسلم

لیگ میں تنظیمی اعتبار سے ورکنگ کمیٹی اوّلیت رکھتی تھی اور کونسل ثانوی درجے پر آتی تھی۔ قائداعظم نے محترمہ فاطمہ جناح کو ورکنگ کمیٹی کا رکن نہیں بنایا۔ ورکنگ کمیٹی میں خواتین کی نمائندگی انہوں نے بیگم مولانا محمد علی جوہر کے سپرد کی اور فاطمہ جناح کو لیگ کونسل کا رکن رکھا۔ جبکہ دوسری طرف قائداعظم کے سیاسی حریف جواہر لال نہرو نے تقسیمِ ہند سے قبل کانگریسی حکومتوں میں اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت کو صحت کی وزارت دی اور تقسیم کے بعد جب وہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے تو وجے لکشمی پنڈت کو روس میں بھارت کا سفیر متعین کیا۔ لیکن قائداعظم نے پاکستان کا گورنر جنرل بننے کے بعد بھی محترمہ فاطمہ جناح کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ یہ محترمہ فاطمہ جناح کی تحریکِ پاکستان کے دوران انتھک جدوجہد اور قومی اخلاص تھا جس نے محترمہ فاطمہ جناح کو احترام اور محبوبیت کی اُس منزل پر فائز کر دیا تھا کہ پوری قوم نے اُن کو بیک آواز 'خاتونِ پاکستان' اور بعد میں 'مادرِ ملت' کا خطاب دیا۔

محترمہ فاطمہ جناح ۳۱ جولائی ۱۸۹۳ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں اور پھر اسی شہر میں آپ نے ۹ جولائی ۱۹۶۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ بمبئی اور کلکتہ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۳ء میں بحیثیت دندان ساز پریکٹس شروع کی لیکن ۱۹۲۹ء میں اپنے عظیم بھائی قائداعظم محمد علی جناح کی اہلیہ رتی جناح کے انتقال کے بعد پریکٹس ختم کر دی اور خود کو اپنے بھائی کی رفاقت اور نگہداشت کے لیے وقف کر دیا۔ اس وقت تک محترمہ فاطمہ جناح کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ۱۹۳۰ء میں جب گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے لیے قائداعظم انگلستان گئے تو محترمہ فاطمہ جناح بھی اُن کے ہمراہ گئیں اور انہوں نے انگلستان میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران اُس سیاست اور قومی جدوجہد سے مکمل آگاہی حاصل کی جس سے اُن کے بھائی نے خود کو وابستہ کر رکھا تھا۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی ۷۴ سالہ زندگی کے مجموعی طور پر ۲۷، ۲۸ سال اپنے عظیم بھائی قائداعظم کی رفاقت میں گزارے۔ ابتدائی چند سال کو چھوڑ کر جو

محترمہ فاطمہ جناح کے زمانۂ تعلیم اور پیشہ ورانہ زندگی سے منسوب ہیں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۸ء تک وہ قائداعظم کے ساتھ ہمہ وقت رہیں۔ یہ عرصہ تقریباً انیس سال پر مشتمل ہے۔ اگر ہم قائداعظم محمد علی جناح کی سیاست و خدمات کا جائزہ لیں تو یہ انیس سال کا عرصہ قائداعظم کی زندگی کا سب سے زیادہ پیچیدہ، سب سے زیادہ مصروف، سب سے زیادہ سنگین اور سب سے زیادہ کامیاب عرصہ ہے۔

۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی منظوری کی بنا پر یہ بات بڑی حد تک طے پا گئی کہ کانگریس کسی صورت بھی مسلمانوں کو ایسے کوئی حقوق دینے پر آمادہ نہیں ہے جو مسلمانوں کو اقتدار میں شراکت کا حق دلائیں۔ لہٰذا ۱۹۲۹ء میں محمد علی جناح جن کو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیت میں شناخت کیا جاتا تھا، نہرو رپورٹ کی منظوری اور چودہ نکات کے مسترد کیے جانے کی صورت میں جہاں ایک مبہم سیاسی مایوسی سے دوچار ہوئے، وہاں اُن کی ازدواجی زندگی کا خواب بھی چکنا چور ہوگیا۔ ۱۹۲۹ء میں رتی جناح کے انتقال کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کی اپنے بھائی کے ساتھ اُس طویل ترین رفاقت کا آغاز ہوا جو ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کے انتقال پر ختم ہوئی۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک محمد علی جناح ایک آزردہ خاطر انسان کے طور پر سماجی اور سیاسی منظر پر موجود تو رہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُن کی نہ صرف نجی زندگی کے تار و پود بکھر گئے تھے بلکہ سیاسی زندگی بھی ایک موہوم افراتفری کا شکار ہوگئی تھی۔ اس صورتحال میں اُن کو صرف اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح اور اپنی صاحبزادی دینا جناح کی رفاقت میسر تھی۔ دینا جناح چونکہ تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور چھوٹی بھی تھیں اس لیے محترمہ فاطمہ جناح سے قائداعظم نہ صرف اپنی سیاسی اور نجی الجھنوں کا تذکرہ کر سکتے تھے بلکہ اس بات کی توقع بھی رکھتے تھے کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنے مشوروں اور اپنی موجودگی سے اُن کے اندر حوصلے کی نئی توانائی پیدا کریں گی۔

محترمہ فاطمہ جناح کو بھی جو اپنے عظیم بھائی کے مزاج و عادات سے واقف

تھیں، اس نئی صورتحال میں اپنی ذمہ داریوں کا مکمل احساس تھا جیسا کہ قائداعظم نے قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کے ایک استقبالیہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی رفاقت کے حوالے سے اُن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اعتراف بھی کیا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح اگرچہ عمر میں قائداعظم محمد علی جناح سے تقریباً سترہ سال چھوٹی تھیں، لیکن انہوں نے مذکورہ انیس سال کے دوران ایک ایسی پُرشفقت بہن کا رُوپ اختیار کرلیا تھا جو عموماً بڑی بہنوں یا ماں سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہاں ضمناً عرض ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح کی شخصیت کے اسی رُخ کے حوالے سے ۴ مارچ ۱۹۴۹ء کو بیگم رفیعہ شریف کا ایک مضمون روزنامہ 'ڈان'، کراچی، میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا: She Mothered the Father of the Nation

جو لوگ قائداعظم محمد علی جناح کی خانگی و نجی زندگی سے واقفیت رکھتے تھے اُن کا بیان بھی یہی ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح اس رفاقت کے دوران اپنے روّیے میں واقعی اتنا بالادست ہوگئی تھیں کہ وہ بعض اُمور میں قائداعظم کے ساتھ تحکمانہ لہجہ اختیار کرلیتی تھیں۔ مطلوب الحسن سید کا بیان ہے کہ قائداعظم اس تحکم کی گہرائی میں موجود اُس تعلق سے بخوبی واقف تھے جو خالصتاً اخلاص اور بے پناہ محبت کی آغوش سے جنم لیتا ہے۔ اس لیے وہ بھی محترمہ فاطمہ جناح کی مرضی و منشا کو اوّلیت و اہمیت دینے لگے تھے۔ جیسا کہ قائداعظم کی علالت کے آخری ایام میں اُن کے ایک معالج کرنل الٰہی بخش نے مشاہدہ کیا اور اپنی کتاب *With the Quaid-I-Azam During his Last Days* (۱۹۴۹ء) میں اس صورتحال کو بین السطور بیان بھی کیا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح اور قائداعظم کے درمیان اس تعلق سے اُس سماجی و تہذیبی پاس ولحاظ اور دلجوئی کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو مشرقی معاشروں میں عموماً بہنوں کے حوالے سے بھائیوں کے دل میں ہوتا ہے۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے عظیم بھائی کی خانگی زندگی میں اپنی مستقل موجودگی

سے جو سہولتیں فراہم کیں وہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں لیکن ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۸ء تک قائداعظم کی رفاقت میں محترمہ فاطمہ جناح کی سماجی اور سیاسی حوالے سے جو فکری تربیت ہوئی وہ بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ دراصل قائداعظم کی زندگی کا یہ دورانیہ ہر اعتبار سے مصروف ترین اور تھکا دینے والا دورانیہ ہے۔ اس دورانیے میں جہاں انہوں نے گول میز کانفرنسوں کے موقع پر خود عائد کردہ جلاوطنی اختیار کی وہاں انہوں نے اپریل ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ازسرِ نو صدارت قبول کر کے مسلمانوں کو آمادہ و تیار کیا کہ وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہو کر قومی جدوجہد میں حصہ لیں۔ اس دورانیے میں قائداعظم کے اندازِ سیاست اور اندازِ فکر میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وہ بلا شرکت غیرے اسلامیانِ ہند کے قائداعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس دورانیے میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور مسلمانوں کے بارے میں ایک علیحدہ قوم ہونے کے تصور کو تقویت ملی۔ اس دورانیے میں کانگریسی رہنماؤں اور برطانوی حکام سے قائداعظم کے طویل اور نتیجہ خیز مذاکرات ہوئے۔ اسی دورانیے میں قائداعظم نے مطالبۂ پاکستان کو ناگزیر ثابت کیا اور حصولِ پاکستان کے بعد استحکامِ پاکستان کے حوالے سے حکمتِ عملی وضع کی۔ گویا یہ دورانیہ قائداعظم کی زندگی کا اہم ترین دورانیہ تھا اور محترمہ فاطمہ جناح نے اس دورانیے میں اپنے عظیم بھائی کے افکار و تصورات، سیاسی تدبر، راست گوئی، فیصلہ کرنے کی صلاحیت، مسحور کن اندازِ خطابت، آہنی عزم، مقصد سے گہری وابستگی، آزادیٔ فکر، حق سے دستبردار نہ ہونے کی قوت، عوامی اُمنگوں اور خواہشات کی پاسداری جیسی صفات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے تقریباً انیس سال تک قائداعظم کی رفاقت میں جو فکری تربیت حاصل کی تھی اُس کا انہوں نے قائداعظم کے انتقال کے بعد تقریباً انیس سال تک ہی ہر مرحلے پر شاندار مظاہرہ کیا۔

وہ چہرے مہرے سے ہی اپنے بھائی کے مشابہ نہیں تھیں بلکہ قائداعظم کے

نداز فکر سے بھی اُن کا اندازِ فکر مماثلت رکھتا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح جس طرح تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمانانِ برصغیر کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا محور و مرکز ہوگئے تھے، اسی طرح محترمہ فاطمہ جناح بھی قائداعظم کے انتقال کے بعد پاکستان کے عوام کے جذبات واحساسات کی ایک مؤثر ترجمان اور قائداعظم کے اصولوں کی نقیب ہوگئی تھیں۔

محترمہ فاطمہ جناح کی حیات وخدمات پر ابھی تک یقیناً تحقیقی انداز کا کوئی قابلِ ذکر تصنیفی کام سامنے نہیں آیا ہے۔ لیکن حاصل مواد کی بنیاد پر یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح نے تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد جس نداز میں قوم کی اور خصوصاً خواتین کی فکری رہنمائی کی وہ خود اپنی جگہ تاریخ میں محترمہ فاطمہ جناح کی فضلیت درج کرنے اور مرکزیت متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران انہوں نے اپنے بھائی کے شانہ بشانہ عوامی اجتماعات میں شرکت کرکے اُن خواتین کو متحرک کیا جو اُمورِ خانہ داری کے علاوہ قومی تناظر میں اپنی سیاسی، سماجی اور اقتصادی ضرورت واہمیت سے واقف ہی نہیں تھیں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اِن خواتین کو اپنی ذات سے ایک مثالیہ فراہم کیا اور اُن کو باور کرایا کہ جب تک خواتین قومی جدوجہد میں مردوں کے شانہ بشانہ حصہ نہیں لیں گی، اُس وقت تک برصغیر کے مسلمان اپنے سیاسی مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں کرسکیں گے۔ مرزا بوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب *Quaid-E-Azam Jinnah: As I Knew Him* میں لکھا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران محترمہ فاطمہ جناح بیشتر سیاسی تقریبات میں قائداعظم کے ساتھ شریک ہوتی تھیں اور دورانِ تقریب ایسی جگہ بیٹھتی تھیں کہ نہ صرف وہ تقریب میں نمایاں رہیں بلکہ تقریب میں خواتین کی نمائندگی واضح ہوسکے۔ تحریکِ پاکستان کی ایک کارکن نورالصباح بیگم نے جن کو دہلی اور کراچی میں محترمہ فاطمہ جناح سے قرب حاصل رہا، لکھا ہے کہ ’محترمہ فاطمہ جناح خواتین کے

لیے رہنما کا درجہ رکھتی تھیں۔ قائداعظم تو بے پناہ مصروف رہتے تھے اور خواتین کو اُن سے ملاقات کا موقع کم ہی ملتا تھا، لہٰذا خواتین عموماً تحریکی معاملات میں محترمہ فاطمہ جناح ہی سے مشورہ کرتی تھیں۔ یہ مشورہ اس قدر صائب ہوتا تھا کہ ایک مرحلے پر قائداعظم نے خواتین سے کہا کہ اگر میں آپ کو مشورہ دیتا تو وہی دیتا جو فاطمہ نے آپ کو دیا ہے۔

محترمہ فاطمہ جناح نے خواتین کے اجتماعات میں جو تقاریر کی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح خواتین کے بارے میں جو کچھ سوچتی تھیں وہ دراصل اُسی فکری تربیت کا نتیجہ تھا جو قائداعظم کی رفاقت میں اُن کو میسر آئی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد محترمہ فاطمہ جناح نے عوامی اجتماعات سے بھی خطاب کیا اور قومی اہمیت کے حامل ایام کے موقع پر قوم کے نام پیغامات بھی جاری کیے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے یہ پیغامات اور خطبات جہاں قوم کے لیے عزم و حوصلے کا باعث ہوتے تھے، وہاں صاحبانِ اقتدار کے لیے تنبیہ کا درجہ بھی رکھتے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح قوم کی مزاج داں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ عوام کیا چاہتے ہیں۔ قوم نے اُن کو چونکہ قائداعظم کے عظیم سائے میں دریافت کیا تھا اس لیے انہوں نے اپنے قول و عمل سے قائداعظم کے ہی کردار کی استقامت اور قول کی صداقت کا اظہار کیا۔ محترمہ فاطمہ جناح اس بات کا مکمل فہم رکھتی تھیں کہ پاکستان کس لیے قائم ہوا ہے اور اس کو کن خطوط پر استحکام بخشا جاسکتا ہے۔ اُن کے پیغامات اور تقاریر میں پاکستان کی سیاسی تبدیلیوں اور عوامی اُمنگوں کی بھی ایک تاریخ پوشیدہ ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم تقریباً ایک سال مزید زندہ رہے اور اُن کے انتقال کے بعد بعض سیاسی وجوہات کی بنا پر عوام کو مایوسی اور دل شکستگی نے گھیر لیا۔ نااُمیدی اور نامرادی کے سائے اُن کی سوچوں میں سر اُٹھانے لگے۔ ایسے میں یہ محترمہ فاطمہ جناح کی ہی ذات تھی جس نے پاکستانی قوم کے خفتہ جذبوں کو بیدار کیا۔

اُن کی روحِ خوابیدہ کو آواز دی اور کہا کہ 'مایوسی کفر ہے۔ ایک آزاد ملک میں آپ کو اپنی ذمہ داریاں یاد رکھنی چاہئیں۔ آپ کے قلب و نظر میں یکسر انقلاب پیدا ہونا چاہیے۔ اب آپ محض تماشائی نہیں بنے رہ سکتے۔ بلکہ آپ کو اب اپنی مملکت کی تعمیرِ نو میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار کو فروغ دینا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کا شاندار ماضی آپ کے حال کا حصہ بن سکتا ہے۔ بے غرضی اور عزمِ مصمّم کے ساتھ قوم و ملک کی خدمت کریں اور ہمیشہ صداقت اور انصاف کو اپنا مشعلِ راہ بنائیں۔ آپ پھر کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔'

محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد بھی اپنی قومی ذمہ داریوں کا مکمل احساس اپنے اندر متحرک رکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ پاکستانی قوم قائداعظم کے بعد اُن کی ذات پر نہ صرف مکمل یقین و بھروسہ رکھتی ہے بلکہ اُن سے توقع کرتی ہے کہ وہ ہر آڑے وقت میں قوم کی موثر رہنمائی کریں گی۔ پاکستانی قوم کی جانب سے اسی اعتماد و ایقان نے سیاسی طور پر مقتدر افراد کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کو قومی سطح پر ایک ایسی مرکزیت عطا کر دی تھی جو اُن سے قبل صرف قائداعظم کو حاصل تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح اپنی ہر تقریر اور ہر پیغام میں قوم کو قائداعظم کے اصول یاد دلاتی تھیں۔ وہ جدوجہد یاد دلاتی تھیں جس کے سخت ترین مراحل سے گزر کر قوم پاکستان کی منزل تک پہنچی تھی۔ ان تقاریر اور پیغامات میں جہاں تنبیہہ ہوتی تھی، وہاں ایک دردمندی بھی ہوتی تھی۔ ایسی دردمندی جو ذاتی ایثار کی پیداوار ہوتی ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے حکومت یا سیاسی جماعت میں کبھی کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ وہ اگر چاہتیں تو پاکستان کی قومی سیاست اور حکومت اُن کے زیرِ نگیں رہتی۔ لیکن ایسی کوئی خواہش اور آرزو محترمہ فاطمہ جناح کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھی۔ اُن کو تو بس ایک ہی لگن تھی اور وہ یہ کہ قائداعظم محمد علی جناح کا پیغام قوم کے دلوں میں زندہ رہے اور پاکستان وہ ترقی اور خوشحالی حاصل کر لے جس کا خواب قائداعظم نے دیکھا تھا۔

محترمہ فاطمہ جناح تمام عمر قائداعظم محمد علی جناح کے ایک موثر نقیب کا کردار ادا کرتی رہیں۔ وہ جن تقریبات میں شرکت کرتی تھیں یا وہ جن شہروں کا دورہ کرتی تھیں، یہ تقریبات اور دورے اگرچہ سرکاری طور پر زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے لیکن عوام کے درمیان اُن کی پذیرائی اور محبوبیت اس امر پر گواہ تھی کہ وہ قائداعظم کے بعد ملک کی سب سے معزز، سب سے معتبر اور سب سے زیادہ ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔ پوری قوم اُن کو توقیر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور عوام کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قائداعظم اُن کے سامنے موجود ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کی آواز میں بھی قائداعظم کی آواز کا سا ہی شکوہ تھا۔ آنکھوں میں وہی فراست تھی جو مستقبل کی گہرائیوں میں جھانکنے کی توانائی رکھتی تھی۔ اُن کی نگاہ میں پاکستان کے تمام افراد بلاامتیاز رنگ و نسل یکساں تھے۔ وہ اپنے سینے میں سب کا درد رکھتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قوم نے فراخدلانہ طور پر اُن کو مادرِ ملت کے خطاب سے نوازا۔ ایک ایسے خطاب سے نوازا جو اپنی معنویت میں خاتونِ پاکستان سے کہیں زیادہ موثر اور اُن کی شخصیت کے تمام گوشوں اور اوصاف پر محیط تھا۔

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں بحیثیت امیدوار اُن کا منظر پر آنا دراصل ملک میں شخصی اقتدار کے خلاف ایک مضبوط حزبِ اختلاف کی بنیادیں رکھنے کی جانب ایک عملی اقدام تھا۔ وہ جمہوری اصولوں کی پاسدار تھیں، لہٰذا نومبر ۱۹۶۴ء میں انہوں نے مملکت اور حکومت کے درمیان موجود فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا 'ہم ملک میں صحیح جمہوری نظام قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایسی جمہوریت جس میں عوام کی رائے کو پورا پورا عمل دخل حاصل ہو۔ پاکستان کسی کی میراث نہیں اور نہ یہ میری میراث ہے۔ یہ عوام کا ملک ہے اور عوام کو ہی اس پر براہ راست حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم پاکستان کے وفادار ہیں کسی شخصی حکومت کے نہیں۔ ہم عوام کے تعاون سے ضرور جمہوریت قائم کرلیں گے۔'

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ایک اور مرحلے پر کہا' میں عملی سیاست سے کنارہ کش تھی اور توقع رکھتی تھی کہ حکمران عوام کی خیر خواہی اور ملک کے استحکام کو مقدم رکھیں گے، مگر جب میں نے دیکھا کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے تو میں نے گوشہ نشینی ترک کر دی۔ میں سیاسی میدان میں ایک نظریہ لے کر آئی ہوں اور جمہوریت کی بحالی میرا نعرہ ہے۔ ایسی جمہوریت کی بحالی جس میں فیصلے کا حق صرف عوام کو حاصل ہو اور وہ حکومت کے ہر کام میں شامل ہوں۔ قائداعظم بھی ملک میں جمہوریت کا فروغ چاہتے تھے اور اُن کی بہن کی حیثیت سے میری بھی یہی خواہش ہے کہ یہ ملک جمہوری خطوط پر آگے بڑھے اور بین الاقوامی طور پر ایک مثالی فلاحی مملکت کی حیثیت سے شناخت کیا جائے۔'

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے بھائی کی سیاسی زندگی میں کئی مرحلے ایسے دیکھے تھے جو بظاہر ناکامی اور مایوسی پر اختتام پذیر ہوئے لیکن اسی ناکامی اور مایوسی سے کامیابیوں کا سورج طلوع ہوا۔ محترمہ فاطمہ جناح صدارتی انتخابات میں ناکام ضرور ہوگئیں لیکن اس بظاہر ناکامی نے جہاں ملک میں بحالیٔ جمہوریت کی ایک موثر جدوجہد کی بنیاد ڈال دی، وہاں عوام کے اندر اس احساس کو بھی فروغ دیا کہ کامیابی ہی کسی مقصد تک پہنچنے کا راستہ نہیں ہوتی ہے بلکہ اگر مقصد واضح ہو تو وقتی ناکامی بھی کسی دیرپا کامیابی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح کی شخصیت اور خدمات کو ہر سطح پر خراجِ عقیدت پیش کیا گیا لیکن معروف صحافی آغا شورش کاشمیری کی ایک تحریر کا اقتباس بڑا معنی آفریں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> بھائی کی ہو بہو تصویر، بالا بلند، اکہرا بدن، ستر برس کی عمر میں بھی کشیدہ قامت، گلابی چہرہ، ستواں ناک، آنکھوں میں بلا کی چمک، جائزہ لیتی ہوئی نگاہیں، آواز میں اقبال، چال میں کمال، طبیعت میں جلال، سرتاپا استقلال، گفتار میں سطوت، کردار میں

عظمت، قائداعظم کی معنوی صفات کا عکس، صبا کی طرح نرم،
رعد کی طرح گرم، ایک جیتی جاگتی کہانی، بانی پاکستان کی نشانی،
ایک حصار جس کی قربت سے حشمت کا احساس ہوتا ہے اور جس
کی دوری سے عقیدت نشوونما پاتی ہے۔ بھائی شہنشاہ۔ بہن بے
پناہ۔

یہ تھیں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح جنہوں نے مطلق العنانی کی تاریکیوں میں جمہوریت کی اوّلین شمع روشن کی تھی جس کی روشنی آج بھی عوام کی رہنمائی کر رہی ہے۔

مصنّف کی دیگر کتابیں



PEACE PUBLICATIONS
42-URDU BAZAR LAHORE.
Peace_publications@yahoo.com

ISBN 978-969-7280-15-5
Rs. 1195/-